Title Page

MAKTUBAT-E-SHIBLI KA TAHQIQI-WA-TANQIDI MUTALA

Thesis submitted for the award ph.D in Urdu

By

Abu Rafe

Enrolment No. Pu07/160575

Under the Supervision

Dr. Shababuddin

Ex Head Deptt of Urdu

Shibli National College Azamgarh

VEER BAHADUR SINGH PURVANCHAL UNIVERSITY

JAUNPUR (U.P)

2021

Title Page

مکتوبات شبلی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

برائے پی ایچ،ڈی (اردو)

مقالہ نگار

ابورافع

Enrolment No. Pu07/ 160575

نگراں

ڈاکٹر شباب الدین

سابق صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ (یوپی)

ویر بہادر سنگھ پوروانچل یونیورسٹی، جونپور

۲۰۲۱ء

Certificate

شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ (یوپی) انڈیا
SHIBLI NATIONAL COLLEGE
AZAMGARH (U.P.) INDIA - 276001

Dr. Shababuddin
Associate Professor & Head
Department of Urdu

ڈاکٹر شباب الدین
ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر
شعبہ اردو

Date 16-7-2021

This is to certify that the Ph.D. thesis entitled, **MAKTUBAT-e-SHIBLI KA TAHQIQI-WA-TANQIDI MUTALA** submitted by **Abu Rafe** is an original work and has been done under my supervision. I am fully satisfied with the work and recommend that is may be submitted for the award of the degree of Ph.D. in Urdu.

PRINCIPAL
Shibli National College
Azamgarh

(Dr. Shababuddin)
Supervisior

Mob. : 09839146508 ■ E-mail : dr.shababuddin@gmail.com

Abstraction

(تلخیص)

مکتوبات شبلی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

زیر نظر مقالہ میں علامہ شبلی پہلودار شخصیت کو ان کے مکاتیب کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے خطوط کی مدد سے ان کی سیرت اور اخلاق و کردار کا مطالعہ کیا گیا اور ان کے خیالات اور نظریات، خدمات اور مصروفیات کا جائزہ لیا گیا ہے تا کہ شبلی کی شخصیت خطوں کے آئینہ میں صاف طور پر نظر آسکے۔ یہ ایک مکمل سوانح حیات تو نہیں ہے تاہم اس میں ان کے خطوط کے اقتباسات کو اس طرح باہم مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مولانا شبلی کی خودنوشت سوانح بن جائے۔ اس بات کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جو مواد پیش کیا جائے وہ مستند ہو۔ اور جو کچھ لکھاجائے اس کی توثیق وشہادت میں خود مولانا کی تحریروں میں مل جائے۔

کسی شخصیت کے حالات اور سوانح عمری کا خطوں کی روشنی میں اس طرح پیش ہونا اردو ادب میں ایک ابتدائی کوشش سمجھی جاسکتی ہے اور پھر ایسے شخص کے حالات کا پیش کرنا حقیقت میں مشکل ہے۔ جو ایک طرف ادب اور مذہب میں ایک خاص مقام رکھتا ہو اور جس کے تقدس اور علمیت کے لوگ معترف ہوں اور جو دوسری طرف مخالفتوں میں گھرا ہوا ہو اور جس پر "مختلف جرائم کے سرزد ہونے کا الزام لگایا جائے۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کے ضبط تحریر میں آنے سے قبل ہمارا قلم نہ تو شبلی کا مخالف تھا اور نہ ان کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ مکاتیب کے مطالعہ نے ذہن میں جو تاثرات پیدا کئے، قلم نے صرف ان کی ترجمانی کی، اگر اس کے باوجود ان کی عظمت کا اعتراف ہوتا ہے تو یہ

سمجھنا چاہیے کہ شبلی حقیقت میں اس کے مستحق ہیں۔

مولانا شبلی نے اردو میں خط لکھنا ۲۸۸۱ء میں شروع کیا اور وفات (۴۱۹۱ء) تک یہ سلسلہ جاری رہا،ان کے ابتدائی خط کو پیش نظر رکھا جائے تو شبلی عین جوانی کے عالم میں ہمارے سامنے آتے ہیں جبکہ ان کی عمر پچیس سال تھی۔ علی گڑھ کے اس نوجوان پروفیسر کی علمی سرگرمیوں اور اس نوعمر عالم کی مذہبی اور قومی خدمات اور اس جوان اورپرجوش ہمت مصنف کی تصنیفی مصروفیات کو دیکھ کر واقعی اس کو ایک عظیم اور وقار شخصیت تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔

۲۸۸۱ء سے ۴۱۹۱ء تک ۲۳ سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی، شبلی کا یہ سارا زمانہ مختلف خدمات اور مسلسل مصروفیات میں بسر ہوا۔ خطوط کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں قومی ہمدردی، جذبۂ ایثار و قربانی اور دیانت داری کے اوصاف تھے۔

اصلاح پسندی، روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کی خصوصیات ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں، قدامت پسند علماء کی طرح انھوں نے اپنی زندگی خلوتوں میں نہیں گذار دی بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا کا مقابلہ کیا۔ طبیعت چونکہ جدت پسند تھی، جدید رجحانات کو اپنایا اس لیے رجعت پسند مولویوں کی نظر میں کھٹکنے لگے۔ نئے دور کے نمائندوں اور مغربی تعلیم یافتہ اشخاص کی صحبت میں رہنے کے باوجود مذہبی اصولوں اور مشرقی طریقوں سے منحرف نہیں ہوگئے اس لیے اس طبقے میں بھی مقبول نہ ہوسکے اور ہر دو طرف سے مخالفت کی جانے لگی۔

مولانا شبلی نے خوداپنے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ اس پر قائم رہے اور دوسروں کی پیروی نہ کی۔ یہ مجتہد تھے مقلد نہ تھے۔ انھوں نے چاہا کہ قوم کے سامنے ایک ایسا راستہ پیش کریں جو نئی اور پرانی راہوں کو ملا دے لیکن ان کے خیالات اور نظریات کو کون سمجھتا، اس کو سمجھنے کے لئے تو ایک مخصوص پیمانہ درکار اورایک ایسی نظر کی ضرورت تھی جو ان گہرائیوں تک پہنچ سکے، اس لیے چند ایک کے سوا کوئی ان کا ہم خیال نہ بن سکا۔ ہم خیالی تو بڑی بات

ہے انھوں نے جس کام کا آغاز کیا زیادہ تر لوگوں نے مخالفت کی اور ان کی راہ میں دشواریاں پیدا کیں، ایسے حالات میں شبلی کا زمانہ کی حق ناشناسی کی شکایت کرنا بے جا نہ تھا۔ ان کی طبیعت میں مایوسی اور زود رنجی کا پیدا ہوجانا بھی اسی سبب سے تھا۔ البتہ ان کی طبیعت میں جو زود حسی اور جذباتیت تھی اسے ان کی فطرت کی کمزوری کہیں تو غلط نہ ہوگا، ان سے اگر کوئی بات قابل اعتراض سرزد بھی ہوتی، تو وہ محض اسی جذباتیت اور زود حسی کا نتیجہ تھا، مخالفوں کو انھوں نے برا بھلا بھی کہا اور سخت الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ بے شک یہ شبلی کی فطرت کے کمزور پہلو ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ اورنگ زیب عالمگیرؒ سے متعلق لکھا تھا وہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔ "یہ کہنا بھی بالکل مبالغہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھا" لیکن مولانا شبلی کی ان کمزوریوں پر ان کی فطرت کی خوبیاں ہمیشہ غالب رہیں۔ شبلی بیحد خود دار واقع ہوئے تھے اور ساتھ ہی ان میں خود شناسی کا جذبہ بھی تھا، اپنی اور اپنے کاموں کی برتری اور اہمیت کا اندازہ بھی۔ مخالفتوں کے باوجود وہ اپنی راہ سے ہٹ نہیں گئے۔ ان کے خیالات اور عزم و ارادے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی بلکہ مزید استحکام پیدا ہوگیا۔ وہ جو کام بھی کرتے عمدہ اور اعلیٰ پیمانہ پر کرتے۔ غرض یہ کہ ان ساری باتوں کی یکجائی نے شبلی میں ایک انفرادیت پیدا کردی تھی۔ اگر مولانا شبلی کو مکتوب کے آئینے میں دیکھاجائے تو وہ تقریباً ہر فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ بزرگوں کا احترام لازم ہے اور مولانا شبلی ہمارے بزرگ ہیں، جن کا احترام فرض ہے اوروہ ہمارے لئے قابل فخر بھی ہیں، زندگی کی دشواریوں اور رنگینوں کے باوجود علم کی پناہ میں جیتے رہے، جس چیز کو دیکھا گہری اور بھرپور نظر سے دیکھا۔ اپنے خیالات اور جذبات پر قائم رہتے ہوئے عملی زندگی میں قدم بڑھاتے رہے۔ سماج کی دہکتی ہوئی آنکھوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائے، نہ شکنجے میں رہنے کے قائل تھے۔ خط کے اندر اظہار خیال بے تکلف اور بے دھڑک ہوتا ہے۔ اپنے ماموں محمد سلیم کے نام ایک خط میں اپنے خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں: "میرا اصول ہے کہ انسان ہرکام

کے نقص و ہنر کا خود فیصلہ کرسکتا ہے اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً عوام کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔" شبلی پرستی اور شبلی شناسی میں بڑا فرق ہے۔ شبلی شناسی میں ممکن ہے کہ کڑوا پن محسوس ہو لیکن انصاف ہوتا ہے اور شبلی فہمی آسان ہوجاتی ہے۔ خط لکھتے وقت انسان کو مطلق خیال نہیں ہوتا ہے کہ آنے والے کل میں یہ کیا شکل اختیار کر جائے گا۔ اس لیے وہ سیدھے سیدھے سچی اور دل کی لگی ہوئی باتیں لکھ جاتا ہے۔ مکتوب نگارادبی نوک پلک کی جانب بہت توجہ بھی نہیں کرپاتا۔ کبھی کبھی ذاتی معاملات خط کے اندر لطف پیدا کرنے کے بجائے کساؤ پیدا کردیتے ہیں جس طرح اصلی شہد کے اندر ملا ہوا موم مزے میں فرق پیدا کردیتا ہے، کچھ خطوط محض ادبی خطوط ہوتے ہیں جن کے اندر ادبی چاشنی پائی جاتی ہے، اس کی مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبار خاطر" ہے۔ مولانا شبلی کے خطوط کے اندر ذاتی گھریلو زندگی کا عکس، چہل پہل، کتابوں کی لکھائی چھپائی، درستی اور تکمیل ہونے کی بے کلی، عرب اور عجم کی داستان، سیاسی مسائل کی دھمک، دارالمصنّفین قائم کرنے کی بے چینی، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی سے ادبی اور مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال، ندوۃ العلماء کی اتھل پتھل اور عطیہ کے نام خطوط کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، غالباً اسی لئے خور شید الاسلام نے اس کو "قومی اعمال نامہ" سے تعبیر کیا ہے۔

مولانا شبلی کے خطوط سے برادری کی خوشبو بھی آتی ہے، یہ برادری عام برادری کی طرح نہیں بلکہ خاص برادری ہے جو اعظم گڑھ کے ایک خاص علاقے اور خطے میں پائی جاتی ہے جس کو روتارہ کہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جب مولانا شبلی علی گڑھ، حیدرآباد اور ندوہ سے واپس ہوئے تو ناموری کے ساتھ ساتھ نامرادی بھی ساتھ لائے، پھر برادری اور وطن کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یہ اثرات ان کے خطوط میں نمایاں ہیں۔

۷/ دسمبر ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد سے اپنے بھائی محمد اسحاق کے نام خط میں لکھتے ہیں: "تم نے

کانفرنس تسلیم کرلی، لیکن اس کے لیے ایک عمدہ پراسپکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور رؤسا دیہات کے پاس بھیجنا ضروری ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلاء، منصب، عُہدہ دار جو اچھی حالت رکھتے ہیں، وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پروا ہے۔ نیشنل اسکول، سرائمیر کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں۔ تم پرائیویٹ خطوط لکھ کر بہ اصرار اور تقاضا ان لوگوں کو جمع کرو۔ ۳۱/ جولائی ۱۹۰۳ء کے خط میں اپنے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں: "میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے وجود کو اپنی تمام برادری کے لیے تاج سمجھتا ہوں۔" اور بہت سے خطوط سے علمی، مذہبی، برادری، تعلیمی ادارے وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کے مکاتیب پر تحقیقی وتنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

(۱) مولانا شبلی کے خطوط میں غالب کے خطوط جیسی شگفتگی ہے۔

(۲) مولانا شبلی کے بعض خطوں میں مکالموں کا بھی وہی انداز ہے جو غالب کے خطوط میں پایا جاتا ہے۔

(۳) شبلی کے خطوط میں سرسید کی طرح قوم اور مذہب سے محبت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

(۴) شبلی کے خطوط میں اقبال کے خطوط کی طرح علمی مسائل پر گفتگو اور مختلف مشاغل کا حال ملتا ہے۔

(۵) شبلی کے خطوط میں ابوالکلام آزاد سے تعلق کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

(۶) شبلی کے خطوط زیادہ طویل نہیں ہوتے۔

(۷) شبلی کے خطوط میں سادہ اور موزوں عبارتیں خوب ملتی ہیں۔

(۸) شبلی بھی غالب کی طرح القاب کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

(۹) شبلی ہر خط کا جواب بہت جلد دیتے تھے لیکن لکھنے میں پہل نہیں کرتے تھے۔

(۰۱) شبلی کے خطوط میں چوٹیں اور طنزیاتی فقرے خوب ملتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ کو درج ذیل ابواب یا جلی عنوانات کے تحت تقسیم کرکے معلومات کو مرتب کیا گیا ہے۔مثلاً

پہلا باب "اردو میں مکتوب نگاری کی روایت"

دوسرا باب "مکتوبات شبلی کے موضوعات کا جائزہ"

تیسرا باب "مکتوبات شبلی کے مکتوب الیہ کا مختصر تعارف"

چوتھا باب "مکتوبات شبلی کا تنقیدی جائزہ"

پانچواں باب "اردو کے مکتوباتی ادب میں شبلی کا مرتبہ" کے عنوان سے معنون ہے۔

پہلے باب میں مکتوب کی لغوی واصطلاحی تعریف، دوسرے میں خطوط شبلی کے موضوعات، تیسرے میں مکتوب الیہ کے خطوط کی تعداد اور ان کا تعارف، چوتھے میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ مکتوبات ومراسلات اور ساتھ ہی مکاتیب شبلی کے مجموعوں اور پانچویں میں مکتوباتی ادب میں شبلی کے مقام و مرتبہ کے تعین کے متعلق تفصیلات ہیں۔

اس کے علاوہ بعض مکتوبات شبلی کا موازنہ دیگر خطوط نگاروں کے ساتھ کیا گیا ہے، اور شبلی کے مکتوب کی معنویت اور ادبی اہمیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بات بھی پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے خطوط کی عہد حاضر میں کیا افادیت اور انفرادیت ہے اس کی طرف نشاندہی کردی جائے۔ مقالے کے سب سے آخر میں کتابیات کی فہرست کو پیش کیا گیا ہے۔

☆☆☆

Declaration

I hereby solemnly declare that the present theises entitled: **“MAKTUBAT-E-SHIBLI KA TAHQIQI-WA-TANQIDI MUTALA”** is original and an out come of independent research work and that to the best of my knowledge, no one has so for been awarded a Ph.D. Degree and any other research degree on the same topic

ABU RAFE
Research Scholar
Dept. of Urdu
Shibli National College,
Azamgarh-276001 (U.P.)

Declaration

I hereby solemnly declare that the present theises entitled: **"MAKTUBAT-E-SHIBLI KA TAHQIQI-WA-TANQIDI MUTALA"** is original and an out come of independent research work and that to the best of my knowledge, no one has so for been awarded a Ph.D. Degree and any other research degree on the same topic

ABU RAFE
Research Scholar
Dept. of Urdu
Shibli National College,
Azamgarh-276001 (U.P.)

اظہارِ تشکر (Aknowlegement)

مکتوبات شبلی کے مطالعہ کی طرف راغب کرنے اوراس مقالہ کی ترتیب دینے میں استاذ گرامی ڈاکٹر شباب الدین صاحب نے جس طرح کی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی اس کے لیے صمیم قلب سے ان کا شکر گذار ہوں۔ میرے ساتھ ان کا حسن سلوک ایک استاذ سے بڑھ کر ہے۔ جب کبھی کسی مسئلے نے مجھے شکستہ حال کیا تو انھوں نے میری ہمت افزائی کی اور عدیم الفرصتی کے باوجود اس مقالے پر نگاہ ڈالی، قیمتی مشوروں سے نوازا اور دعائیں دیں۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں اس خدمت کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

مقالے کی تیاری میں جو تعاون مجھے شبلی کالج کے اساتذہ سے ملا اسے بھی میں نظر انداز نہیں کر سکتا، ڈاکٹر علاء الدین خان صدر شعبۂ تاریخ نے میرے مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنا ہر قسم کا تعاون پیش کیا۔ ڈاکٹر محی الدین آزاد ''صدر شعبۂ عربی'' نے عربی خطوط کو سمجھنے میں میری مدد کی۔ ڈاکٹر محمد خالد صاحب ''صدر شعبۂ معاشیات'' ڈاکٹر کلیم احمد صاحب ''صدر شعبۂ فلسفہ'' ڈاکٹر الطاف احمد صاحب ''صدر شعبۂ ہندی'' ڈاکٹر سرفراز نواز احمد لکچرر شعبہ انگریزی، ڈاکٹر شفیع الزماں، لکچرر شعبۂ سیاسیات اور استاد محترم عقیل احمد صاحب وغیرہ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، جنھوں نے اس مقالہ کی تیاری میں میری مدد کی۔

اپنے خاص کرم فرما بزرگوں میں پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ناظم دارالمصنّفین اعظم گڑھ، مولانا عمیر الصّدیق ندوی سینئر رفیق دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ڈاکٹر فخر الاسلام، ''سابق صدر شعبۂ عربی شبلی کالج، وجوائنٹ سکریٹری دارالمصنّفین''، کلیم صفات اصلاحی رفیق دارالمصنّفین اور ناظر کتب خانہ دارالمصنّفین سلیم جاوید اور شبلی منزل کے دوسرے اسٹاف کی عنایتوں کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے کتب خانے سے استفادے کی ہر مشکل آسان کی۔

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب ‘‘مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر نسیم احمد ’’ہندو یونیورسٹی بنارس‘‘ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی وغیرہ کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ ان بزرگوں نے مقالہ کے سلسلہ میں مفید مشورے دیے اور اس کو بہتر بنانے کے سلسلہ میں اپنے گراں قدر خیالات سے نوازا۔ ان کے علاوہ وہ حضرات جو کرونا جیسی وبائی بیماری سے اللہ کو پیارے ہوگئے، مولانا قمرالزماں مبارکپوری، ڈاکٹر حکیم الدین صاحب شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، ڈاکٹر عبدالرشید ظہیری صاحب، شری گاندھی پی جی کالج مالٹاری، اعظم گڑھ وغیرہ میرے مقالے کے لیے بڑے فکر مند تھے، ان کی زندگی میں یہ کام نہ ہوسکا، اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

بڑی ناانصافی ہوگی اگر میں اپنے خانوادے کے ان افراد کا ذکر نہ کروں جن کے دم سے میرے خاندان کا نام روشن ہے۔ ان میں مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالفتاح اصلاحی، مولانا عبدالحسیب اصلاحی، محمد ہارون وغیرہ جنھوں نے مدت العمر علم کی شمع روشن کی اور اسی کو اپنا مقصد حیات بنایا، یہ سب کے سب اب جوار رحمت میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

اپنے بھائیوں جناب محمد یاسر اور محمد شافع کا شکر گذار ہوں جن کے پر خلوص تعاون کے بغیر علمی کاوش کو پایۂ تکمیل تک پہنچاپانا مشکل تھا، اپنی ہمشیرہ نائلہ بانو، ثنا سمرین، نبیلہ بانو اور فضا کا احسان مند ہوں کہ وہ بھی میری طرف سے کبھی غافل نہیں رہیں اور ہمیشہ دعائوں سے نوازاتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل خانہ کو دونوں جہاں میں کامیاب و بامراد کرے۔

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے والدین کا ذکر نہ کروں جن کی دعا میرے لئے ہر میدان میں کامیابی و کامرانی کی شاہ کلید ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں ہر خوشی سے نوازے اور ان کی نیک تمنائوں کو پورا کرے۔

میں اپنی اہلیہ ماجدہ بانو کا مشکور ہوں جنھوں نے مجھ کو گھریلو مصروفیات سے بے نیاز کرکے زیادہ سے زیادہ وقت مقالہ کی ترتیب و تیاری کے لئے مہیا کیا، میری دو بیٹوں میں حمنہ عائشہ اور ہانیہ کا ذکر لازمی ہے جن کی مسکراہٹیں میرے لیے حوصلہ کا باعث بنیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت و توانائی بخشے، اورزیور علم سے آراستہ کرے اور سدا خوش رکھے۔

اخیر میں مولانا صلاح الدین صاحب معروفی کا ممنون و مشکور ہوں کہ انھوں نے اس مقالہ کو کمپوز کیا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء

ابورافع
شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ

Content

آئینہ مضامین

مضمون	صفحہ

مضمون	صفحہ

Preface

نگاہِ اولیں

سب سے پہلے ذات باری تعالیٰ کے حضور شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے مجھے ''مکتوبات شبلی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر مقالہ لکھنے کی سعادت بخشی۔

زیر نظر مقالہ میں علامہ شبلی کی شخصیت، ان کی سیرت، اخلاق و کردار، ان کے خیالات و نظریات، خدمات اور مصروفیات کا جائزہ ان کے مکتوبات کی روشنی میں لیا گیا ہے، ان مکاتیب کے مطالعہ سے یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ حیات شبلی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی بازگشت ان ذخیرہ مکتوبات میں نہ ہو۔ اس طرح ایک مکمل سوانح حیات ان خطوط کی مدد سے ترتیب دی جاسکتی ہے، یہ بات بھی صحیح ہے کہ بعض سوانح نگاران شبلی نے شبلی کی تفہیم وافہام میں ان مکاتیب کا استعمال بھی کیا ہے، چنانچہ ان کی تمام خدمات، قوم و ملت سے ہمدردی، الندوہ کی فکر مندی، احباب سے تعلق، شاگردوں سے محبت، سیرت کے کاموں سے عشق، کتابوں کا مطالعہ اور ان کو جمع کرنے کا شوق، ساتھ ہی ہندوستان اور دیگر ممالک کے بامقصد اسفار کے متعلق مستند معلومات کا مأخذ ان کے خطوط ہی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی گھریلو اور عائلی زندگی کا پورا عکس ان مکاتیب میں موجود ہے اور سب سے بڑھ کر ان خطوط کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں اصلاح پسندی، روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کی خصوصیات بھی موجود تھیں، قدامت پسند علماء کی طرح انھوں نے اپنی زندگی خلوتوں میں نہیں گذار دی بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا کا مقابلہ کیا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت جدت پسند تھی، جس کے سبب انھوں نے جدید رجحانات کو اپنایا اور صاحبان جبہ ودستار کی نظروں میں کھٹکے، نئے دور کے

نمائندوں اور مغربی تعلیم یافتہ اشخاص کی صحبت میں رہنے کے باوجود مذہبی اصولوں اور مشرقی طریقوں سے منحرف نہیں ہوگئے بلکہ اس سے استفادہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ شبلی نے خود اپنے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ اس پر قائم رہے اور دوسروں کی پیروی نہ کی، شبلی مجتہد تھے مقلد نہ تھے، ان خطوط سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے قوم کے سامنے ایک ایسا راستہ پیش کیا جو نئ اور پرانی راہوں کو الگ الگ کرنے کے بجائے ان کو باہم ملا دے لیکن ان کے ان اچھوتے خیالات اور نظریات کو کون سمجھتا تھا، ان کو سمجھنے کے لیے ایک مخصوص پیمانہ درکار اور ایک ایسی نظر کی ضرورت تھی جو ان گہرائیوں تک پہنچ سکے ، غالباً اسی وجہ سے ان کے بہت سے اقدامات اور قومی وملی کاموں سے اختلاف کیا گیا اور ان کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں ان تمام حالات کا عکس شبلی کے خطوط میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان خطوط میں بعض ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں جن سے شبلی کا زمانہ کی حق ناشناسی کی شکایت کرنا بجا معلوم ہوتا ہے۔

علامہ شبلی کے اندر خودداری رچ بس گئی تھی، اور ساتھ ہی ان میں خود شناسی کا جذبہ بھی تھا، اپنی اور اپنے کاموں کی برتری اور اہمیت کا اندازہ بھی انھیں تھا۔ اسی لئے مخالفتوں کے باوجود وہ اپنے عزم پر ڈٹے رہے، اور ان کے خیالات اور عزم و ارادے میں کسی قسم کی تبدیلی کے بجائے مزید استحکام پیدا ہوگیا، وہ جو بھی کام کرتے عمدہ اور اعلیٰ پیمانہ پر کرتے، ان ہی تمام اوصاف اور خوبیوں نے ان کے اندر انفرادیت کی شان پیدا کر دی تھی۔

مکاتیب شبلی کے متعدد پہلوؤں میں ایک پہلو افراد کی تربیت کا بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے جس کے نتیجہ میں اچھے خاصے طلبہ کی تعداد ایسی نظر آتی ہے جن کی ذہنی وفکری تربیت شبلی نے کی تھی، ندوۃ العلماء میں رہ کر انھوں نے جو اصلاحات اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے جو سامان کیے وہ بھلائے نہیں جاسکتے۔ دارالمصنّفین کا قیام حقیقت میں ”زمرۂ مصنّفین کی دائمی خدمت ہے“۔ شبلی اسکول

جواب شبلی کالج ہے ان کی یادگار ہے۔ وقف علی الاولاد، تعطیل جمعہ اور ورینکولر اسکیم کے سلسلہ میں ان کی کوششیں کیسے فراموش کی جاسکتی ہیں۔ علامہ شبلی کے ''طبع زاد معنوی'' یعنی المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، موازنۂ انیس و دبیر، شعر العجم وغیرہ ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں اور سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم تو ان کی عمر بھر کا حاصل اور ''وسیلۂ نجات'' ہے۔ علامہ شبلی کی آواز اور ان کے لکچر علی گڑھ کے در و دیوار اور اس کی فضائوں میں محفوظ ہیں اور عہد شبلی کے حیدر آباد کی علمی و ادبی داستانیں شبلی کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایک شخصیت کے اندر اتنی ساری باتوں اور خوبیوں کا اجتماع حیرت انگیز ہے، واقعہ یہ ہے کہ شبلی کو کام کرنے کا ڈھنگ آتا تھا، ان کی زندگی مختلف النوع کاموں کی انجام دہی میں گزری، بقول حالی ''وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں'' راقم نے ''مکتوبات شبلی'' پر مطالعے کے دوران اکثر ایسا محسوس کیا کہ جیسے ان کا زمانہ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا ہو اور ان کے افعال و کردار بول رہے ہوں، اس طرح یہ بات بلا خوف لامۃ لائم کہی جاسکتی ہے کہ اگر شبلی کی زندگی کا احاطہ کرنا ہے تو ان کے مکاتیب سب سے زیادہ کار آمد ہوں گے، اور صرف خطوط کی مدد سے ایک متحرک شبلی کی داستان رقم کی جاسکتی ہے۔

باب اول 1st Chapter

اردو میں مکتوب نگاری کی روایت

فن مکتوب نگاری

اردو کی ادبی اصناف کو عموماً دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔(۱) اصناف نظم (۲) اصناف نثر اصناف نظم میں غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ اور اصناف نثر کی دو مشہور قسموں میں افسانوی اور غیر افسانوی نثر ہیں۔ داستان، ناول، افسانہ، ڈراما وغیرہ داستانوی نثر میں شامل ہیں اور غیر افسانوی نثر میں سوانح نگاری، خود نوشت سوانح حیات، انشائیے، مکتوب نگاری، سفر نامے اور رپورتاژ شامل ہیں۔ خطوط نویسی یا مکتوب نگاری کا تعلق بھی جیسا کہ کہا گیا ہے اردو نثر کے غیر افسانوی سرمایہ ادب سے ہے۔

دنیا کی تمام مخلوقات میں صرف انسان کو ہی یہ درجہ حاصل ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اسی لئے "انسان کو حیوان ناطق کہتے ہیں" اس کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ زبان ہے اور چوں کہ ہر علاقے کا ذریعہ اظہار الگ ہوتا ہے اس لئے دنیا میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ زبانی اظہار کے علاوہ انسان کچھ علامتوں کے ذریعے بھی اپنے خیالات دوسروں پر ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے انھیں دیکھ کر یہ جان لیتے ہیں کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے اور یہ زبان کی تحریری شکل ہے۔ مختلف زبانوں میں حرفوں اور لفظوں کی سیکڑوں آوازوں کی طرح دنیا میں تحریر کی بھی مختلف شکلیں پائی جاتی ہیں، تحریر کی مختلف شکلوں کے علاوہ تحریر کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

لفظ "مکتوب" کی لغوی تحقیق

دو اشخاص کے درمیان باہمی گفتگو ایک سماجی ضرورت ہے اور جب یہ عمل روبرو ممکن نہ ہو تو ہم اپنے خیالات کا اظہار تحریر کے ذریعے لکھ کر کرتے ہیں۔ اور یہی تحریر مکتوب یعنی خط کہلاتی ہے۔ مکتوب نگاری تحریری شکل میں باتیں کرنا ہے۔ اس لئے خط کو عرفِ عام میں "آدھی ملاقات" بھی کہا جاتا ہے۔

(الف) صاحب فیروز اللغات نے مکتوب کی تعریف اس طرح کی ہے:

"مکتوب عربی زبان کا لفظ ہے اور مذکر ہے، جس کے معنی لکھا گیا، لکھا ہوا، خط، نامہ، چٹھی وغیرہ"۔(۱)

(ب) نوراللغات اردو میں خط کے معنی کچھ اس طرح تحریر ہیں:

خط: (ع) عربی میں بہ تشدید دوم ہے، معانی، نوشتہ، تحریر لکھنا۔ لکیر کھینچنا، فارسیوں نے بغیر تشدید استعمال کیا، مذکر، لکیر، نشان۔ (پڑنا کے ساتھ) جانصاحب ؎

سیار سینگی جو ابھی باندھ دوں میں بکرے کے
نہ پتا دو کے برابر پڑے تلوار کا خط (۲)

(ج) مکتوب: ع۔ بالفتح وضم سوم، صفت، مذکر۔ لکھا گیا، مرقوم، خط، نامہ، (جلال) کہہ سکتے ہیں۔ لکھّے کو بھلا اب برا ہم۔ سنکر نہ کہے دوست یہ مکتوب ہے میرا (اردو) مبتدی لوگ مختلف قسم کے خطوط جمع کر کے جوڑ لیتے اور ان کو مٹھے کی طرح لپیٹ لیتے ہیں، تا کہ قلمی عبارت پڑھنے کی مشق ہو۔ مکتوب الیہ۔ مذکر وہ شخص جس کو خط لکھا جائے۔ مؤنث کے لئے مکتوب الیہا۔ مکتوب نصف الملاقات۔ مقولہ۔ خط سے کچھ کچھ ملاقات کا لطف حاصل ہو جاتا ہے (رند) تصور مجھے خط کا دن رات ہے کہ مکتوب نصف الملاقات ہے۔(۳)

---

(۱) فیروز اللغات، نیا ایڈیشن، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی)
(۲) نوراللغات۔ مولوی نورالحسن نیر۔ اشاعت العلوم پریس فرنگی محل لکھنؤمیں طبع ہوئی۔
(۳) نوراللغات۔ مولوی نورالحسن نیر۔ اشاعت العلوم پریس فرنگی محل لکھنؤمیں طبع ہوئی۔

(د) لغات کشوری میں خط کے یہ معنی ہیں:

خط کے معنی لکیر جس میں فقط طول ہو، عرض اور عمق نہ ہو۔ نام ایک موضع کا۔(۱)

(ہ) لغات کشوری میں مکتوب کے معنی اس طرح تحریر ہیں: مکتوب (ع) لکھاہوا، لکھا گیا۔(۲)

(و) مہذب اللغات میں مکتوب کے معنی یہ بیان کئے گئے ہیں:

مکتوب بہ (بفتح اول وواؤ معروف) خط، نامہ، چٹھی۔ عربی صفت مذکر، اسم مفعول، فصیح، رائج۔

تعشق

گرد تھے اہل حرم بیچ میں حق کا محبوب

شہر والا نے لفافے سے نکالا مکتوب(۳)

(ز) اردو ادبی لغات میں مکتوب کے معنٰی یہ تحریر ہیں:

مکتوب (ع، مذکر) چٹھی، خط (جمع مکاتیب و مکاتبات) (۴)

(ح) فرہنگ آصفیہ میں مکتوب کے معنی اس طرح تحریر ہیں۔

مکتوب۔ (ع، اسم مذکر) لکھاہوا، لکھا گیا، مرقوم، خط، چٹھی، مراسلہ۔ (اسم مذکر) خطوط کا طومار یا ایک لمبا کاغذ۔ بہت سے اکٹھے خط جو لڑکوں کو پڑھانے کے واسطے جوڑ دیتے ہیں، ترسُّل۔

(ط) مکتوب (مک-توب) (ع۔صف) (۱) لکھا گیا، لکھاہوا (۲) ار۔مذ) خط، نامہ، چٹھی۔ جمع مکاتیب۔ مکتوبات (۵)

(ی) اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں مکتوب کے معنی اس طرح تحریر ہیں۔ مکتوبات، (ع) مکاتیب جمع مکتوب، از مادہ کتب (لکھا، تحریر کیا) یعنی مرقوم، خط، نامہ (ابن منظور، لسان العرب فرہنگ آصفیہ، بذیل مادہ)

---

(۱) لغات کشوری، عکسی ایڈیشن، مولوی سید تصدق حسین صاحب رضوی، دارالاشاعت اردو بازار، کراچی۔

(۲) لغات کشوری، عکسی ایڈیشن، مولوی سید تصدق حسین صاحب رضوی، دارالاشاعت اردو بازار، کراچی۔

(۳) مہذب اللغات، جلد دوازدہم ۱۲: حضرت مہذب لکھنوی، مطبوعہ، نامی پریس، کنگھی والی گلی، لکھنؤ۔

(۴) اردو ادبی لغات، مطبوعہ سن رائز پریس عید گاہ روڈ دہلی۔ چیف ایجنٹ شمع بکڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی، اردو بازار۔

(۵) اردو فیروز اللغات جامع، مرتب الحاج مولوی فیروز الدین مرحوم۔ اعتقاد پبلشنگ۔ ہاؤس پرائیویٹ لمیٹڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔

انشاء کی ایک نمایاں صنف، مکتوب نگاری ہے جو ضرورت ابلاغ (Communication) کی وجہ سے وجود میں آئی، یہ صنف شخصی و نجی افکار وخیالات اور فکر و نظر کا موثر ذریعہ اظہار خیال کی جاتی ہے۔ فنی اور اصولی بحث کے لئے ملاحظہ ہو۔(۱)

(W.B.Scooney Four Centuries of Letters)

جہاں اس صنف کے ذریعے ادبا اور حکما اور عام مکتوب نگاروں نے اپنے خیالات واحوال کی اشاعت کی، وہاں صوفیائے اسلام بھی اس صنف کے ذریعے تبلیغ ودعوت، ازالہ شکوک وشبہات اور اپنے مسلک ومشرب کی وسیع تر اشاعت کرتے رہے ہیں۔ قریب قریب ہر صوفی نے مکتوبات کے ذریعے اپنے دوستوں اور مریدوں سے رابطہ رکھا ہے، مگر بدقسمتی سے اکثر صوفیائے اسلام کے مکتوبات یا تو دست برد زمانہ کی نذر ہو چکے ہیں یا تاحال زیور طباعت سے محروم ہیں ورنہ متصوفانہ ادب کا ایک بیش بہا ذخیرہ ہمارے سامنے ہوتا۔(۲)

(ک) مکاتیب: مکتوب یا خط ترسیل وابلاغ کا ایک ذریعہ ہے اس کی ابتدا ما قبل تاریخ سے بتائی جاتی ہے، اس لئے تحریر کو خط بھی کہا جاتا ہے جس نے بعد میں اپنے معنوں میں قدرے تبدیلی پیدا کی۔(۳)

(A) IF you write a letter to someone, you write (I) Letter (II) a message on paper and send it to them, usually by post. I had received a letter from a very close Friend...a letter of resignation... our long Courtship had been Conducted mostly by letter.

Letters are written symbols which represent one of the sounds in a language ... the letters of theAlphabet

---

(۱) سید عبداللہ، میر امن سے عبدالحق تک، ۳۰۵لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۲۲۴

(۲) مرزا محمد منور: مقالہ انشاء، مکتوبات در تاریخ ادبیات، ۳:۳۶۴۔

(۳) جامع اردو انسائیکلوپیڈیا (ادبیات) قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند۔ نئی دہلی۔

......The letter E. (1)

(B) a message that is Written down or Printed an-noun letter business (thank you etc letter a letter of complaint (B&E) to post a letter (Name) to mail a letter there's a letter For you from your mother you will be notified by letter Help you will find compounds ending in letter at their place in the alphabet. Writing Tutor Page Wt 42 (2)

(C) n-letter= (۱) حرف، حرف تہجی۔ (۲) (طباعت) ٹائپ، میں (بحالت جمع) حروف کے ذریعے تقسیم، (کتاب کی جلد پر) نام وغیرہ کا ٹھپا (ع) خط، مراسلہ، نامہ، چٹھی (۵) (جمع) سرکاری یا قانونی کاغذ۔ (٦) کسی بیان کے ہوبہو الفاظ، لفظی یا ظاہری معنی۔ (۷) (جمع) علم ادب، مطالعہ، معلومات (کتابی)، علمیت، علم وفضل (۸) اسکول یا کالج کا نشان (کھیل کود میں انعام کے طور پر) (3)

(D) Z is the last-Letter حرف (۱) تحریری علامت: Letter in the (Z) English Alphabet انگریزی حروف تہجی کا آخری حرف ہے۔

A,B,C کیپٹل لیٹرز یا جلی حروف ہیں جو اسم خاص یا جملے کے آغاز پر استعمال ہوتے ہیں۔ a,b,c یہ اسمال لیٹرز یعنی چھوٹے حروف ہیں۔ (۱) خط تحریر جو آپ ایک دوسرے کے نام لکھتے ہیں: Didyou past my letter? کیا تم نے میرے خط پوسٹ کر دیے تھے؟ She wrote a letter to the mother? اس نے اپنی امی کو خط لکھا۔ (4)

---

(1)Reference by Dictionary Collins COBUILD ENGLISH Dictionary. Editor in cheif-John Sinelair .

(2)Reference by oxford Advaned Learner's Dictionary. Managing Editor Joann Turnabull.

(3)English Urdu Dictionary by chief Editor prof Kalimuddin Ahmad

(4)Reference by the OXFRD Erglish URDU Dicitionary انگیریزی ایڈیشن ترتیب وتدوین: انجیلا کرالی (Angela Crawlley) اردو ترجمہ وترتیب: وسادہ نقوی، اکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

(E) Letter n.8veاسم،(الف) حروف تہجی(ب) (جمع میں بول چال، کسی سند یا ڈگری کے ابتدائی حرف، ۲ (الف) خط، مراسلہ، مکتوب(ب) (جمع میں) کوئی سرکاری دستاویز جو کسی کے نام سے روانہ کی جائے۔ ۳کسی بیان یا متن کے اصل الفاظ یا ان کی لفظی تشریح (روح یا نفس معنی کے برخلاف) (رک، SPIRITاسم معنی ۷) (according to the letter of the law قانون کے متن کے مطابق) ۴،(جمع میں) الف) ادب، نظم و نثر (ب) کتابوں سے واقفیت، مطالعہ(ج) مصنّفی (Profession of lettres) تصنیف و تالیف کا شغل(۵)، طباعت: (الف) ڈھلے ہوئے حروف بحیثیت مجموعی(ب) حروف کی کوئی خاص وضع یا صورت، فونٹ،ف م،(الف) حرف چھاپنا کسی چیز پر (ب) کتاب کی پوشش یا سرورق پر)کتاب کا نام ثبت کرنا۔ (۲) حروف تہجی کے مطابق ترتیب دینا۔(۱)

خطوط نویسی کے متعلق محققین کے آراء

خط یا مکتوب(Letter)نگاری کے آغاز اور ارتقا کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خط کے متعلق محققین کے آراء خیالات کو بیان کر دیا جائے۔ زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ لفظ "خط" کے معنی ومفہوم میں بھی تبدیلی آئی اور یہ لفظ مکتوب یا"نامہ " کے معنی میں بھی مستعمل ہونے لگا۔ خط یا مکتوب دراصل دوافراد کے مابین ترسیل خیال کا ایک وسیلہ ہے جس میں ایک شخص کسی دوسرے شخص کو اپنا پیغام پہنچاتا ہےDictionary of world Literature میں خط کی تعریف کرتے ہوئے شپلے (Shipley) نے لکھاہے:

> "خط عام طور سے مکتوب نگار(پہلا آدمی) اور مکتوب الیہ (دوسرا آدمی)
> کے بیچ تبادلہ خیال کا ذریعہ ہے۔"

خطوط عموماً صیغہ واحد متکلم میں ہوتے ہیں۔ ان میں روزمرہ کی چھوٹی باتوں کا تذکرہ کیا جاتا

(۱)مرتب ومترجم:Reference by : Oxford English Urdu Dictionaryشان الحق حقی اوکسفورڈیونیورسٹی پریس:

OXFORD UNIVERSITY PRESS, Shanul Haq Haqqee

ہے، جن کا تعلق مکتوب نگار یا مکتوب الیہ کی ذات سے ہوتا ہے۔ خطوط میں بے ربطی اور منتشر خیالی کے ساتھ کبھی ذاتی اور کبھی سیاسی ، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی اشارے بھی ملتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام:

"خط حسن اتفاق کا نام ہے، اور حسن اتفاق ہی سے یہ ادب کی ایک صنف ہے۔ اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں...... خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنے جاتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں دنیا کا لطف ہے۔" (۱)

اسی طرح خطوں کے سلسلے میں ایک دوسری جگہ پروفیسر خورشید الاسلام نے لکھا ہے:

"خطوں میں قل ہو اللہ کی تفسیر نہیں ہوتی، خط حسن اتفاق کا نام ہے...

اچھے خط ادبی کارنامے ہوتے ہیں... خط چھوٹی چھوٹی باتوں سے بنے جاتے ہیں... وہ خطوط جن میں استدلال کا زور ہو، فلسفہ پر باقاعدہ بحثیں ہوں، بالارادہ فن کاری ہو، خطوط نہیں ہوتے۔ خطوں میں مرزا بیدلؔ کے اشعار کی گنجائش ہے، لیکن ان کی ماروائیت پر مدلل بحث کی گنجائش نہیں۔ آپ خطوں میں رو سکتے ہیں، قہقہے لگا سکتے ہیں، لیکن اخلاقاً مصلحتاً اور قانوناً نہ شوپنہار کی قنوطیت پر وعظ کہنے کی اجازت آپ کو دی جا سکتی ہے اور نہ قہقہوں پر مضمون لکھنے کا موقع آپ کو حاصل ہے۔(۲)

رشیدہ خاتون خط کی تعریف بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"خط دو آدمیوں کے درمیان اظہار خیال اور ابلاغ کا ایک آلہ کار ہے، جو سر تا پا ذاتی اور نجی ہوتا ہے۔ یہاں کوئی رکھ رکھاؤ نہیں ہوتا، بلکہ انسان ایک ایسے آئینے کے سامنے ہوتا ہے کہ ظاہر سے زیادہ باطن اہم ہوتا ہے۔ یہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے۔ وہ

---

(۱) تنقیدیں ص ۹
(۲) ، تنقیدیں۔ خورشید الاسلام۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۵۸

به مسئله اور ہر شے سے متعلق جیسا اس کا خیال ہوتا ہے صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے، وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کو سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔" (۱)

رشیدہ خاتون آگے مزید فرماتی ہیں:

"اس انفرادیت کے علاوہ خطوط کچھ اور محاسن بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں، کیوں کہ ان میں رازداری ہوتی ہے اور آدمی فطرتاً راز جاننے کا اشتیاق رکھتا ہے۔ دھوکا، فریب یا جعل سازی نہیں ہوتی، بلکہ سچائی ہوتی ہے۔ انسان تو ازل سے سچ اور حقیقت کا متلاشی ہے۔ صداقت ہی معیار حیات ہے، یہ وقت اور زمانے کا سب سے بڑا حسن ہے۔(۲)

مکتوب نویسی اکثر دوادبی شخصیتوں کے درمیان ہو تو اس کی اہمیت اور افادیت دوچند ہو جاتی ہے، کیوں کہ مکتوب ایک تحریر ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے صاف شفاف آئینے کی حیثیت بھی رکھتا ہے جس میں صاحب تحریر کی شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔

شعرا اور ادیب اکثر و بیشتر اپنی شخصیت کو تخلیقات کے پردے میں پوشیدہ رکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لیے جدید تحقیق کی رو سے کسی بھی فن کار کی شخصیت اور اس کے مزاج و کردار کے تجزیاتی مطالعے کے لیے اس کی تخلیقات سے کہیں زیادہ مکاتیب معاون و مددگار ہوتے ہیں، ایک اچھا خط غزل کے فن کی طرح اختصار و جامعیت، سادگی و بیساختہ پن، جذبہ واحساس کی لطافت اور سچائی و خلوص کا آئینہ دار ہوتا ہے، خط کی انھیں خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر مولوی عبدالحق نے دیگر اصناف ادب سے تقابل کرتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت کو اس طرح اجاگر کیا ہے:

"ادب میں سیکڑوں دل کشیاں ہیں، اس کی بے شمار راہیں اور ان گنت

---

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقاء۔ رشیدہ خاتون، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد، ص ۹

(۲) اردو خطوط نگاری کا ارتقاء، رشیدہ خاتون۔ مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۱۱

گھاتیں ہیں لیکن خطوں میں جو جادو ہے وہ اس کی کسی ادا میں نہیں ہے۔ نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو، غرض ادب کی تمام اصناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے۔ اور صنعت گری کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ہو جاتی ہے، صرف سادگی ہی ایک ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور زمانے میں زوال نہیں بشرطیکہ اس میں صداقت ہو اور ہم میں سے کون ہے جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں"۔(۱)

ایک دوسری جگہ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

خط دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے، اس میں وہ صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا"(۲)

پروفیسر آل احمد سرور کے خیال میں:

"اچھا خط وہ کہا جاسکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے، جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت اور ذاتی تاثرات کی جھلک ہو۔ چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشاء پردازی کی شان، تکلف کا اظہار، خطابت کا جوش دکھایا جائے، خط نہیں مضمون ہے" (۳)

خط کے تعلق سے مہدی افادی کا خیال یہ ہے:

"خط لٹریچر کا ایک ایسا عنصر ہے جس میں لکھنے والے کے اہتمام کو چنداں دخل نہیں ہوتا۔یعنی وہ یہ نہیں جانتا کہ کبھی اس کی اشاعت کی نوبت آئے گی۔

---

(۱) مولوی عبدالحق، ادبی تبصرے، ص۶۷
(۲) مقدمہ مولوی عبدالحق، تالیف مکتوبات حالی، مرتبہ سجاد حسین، مطبوعہ ۱۹۲۵ء، ص۱۵
(۳) آل احمد سرور۔ تنقیدی اشارے۔ طبع چہارم۔ مطبوعہ ۱۹۷۵ء۔(ادارہ فروغ اردو لکھنؤ)، ص۶۳

اس لیے سر سری اظہار خیال بھی اگر اس پایہ کا ہو کہ انشاء پردازی اس بلائیں لیتی
ہو تو یہ بھی کمال کا ایک ایسا رخ ہے جس سے قطع نظر نہیں کی جاسکتی"۔(۱)

ادبی شخصیتوں کے خطوط نہ صرف ادبی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں بلکہ لکھنے والے کے نہاں خانۂ دل تک پہنچنے کے لیے ممدو معاون ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ادیبوں اور شاعروں کے مکاتیب کا بالاستیعاب مطالعہ محققین کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ بے تکلف دوستوں کے نام ادیبوں کے خطوط، نہ صرف دلکش اور پرکشش ہوتے ہیں بلکہ معلومات کا خزانہ بھی ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ایک طرف مکتوب نگار کی شخصی زندگی اور نجی حالات کا علم ہوتا ہے، اس کے دوستوں اور ہم عصروں کے بارے میں آگہی حاصل ہوتی ہے تو دوسری طرف اس دور کے سماجی حالات، اصلاحی تحریکوں اور ادبی سرگرمیوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

خطوط میں تمام جاندار اور بے جان اشیا کو موضوع بحث بنایا جاسکتا ہے۔ کبھی یہ محض استفسار کے جواب میں لکھا جاتا ہے تو کبھی دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے۔ کبھی اپنے دکھ اور شادمانی میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے اور کبھی ان آرزؤں اور خوابوں کے اظہار کے لیے لکھا جاتا ہے جو شرمندۂ تعبیر ہونے کے لیے مچلتے رہتے ہیں بقول رشیدہ خاتون:

"خلاصۂ کلام یہ ہے کہ خط جگر گدازی بھی ہے اور آئینہ سازی بھی، یہ
حد سے زیادہ شخصی بھی ہوتا ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی ہوتا ہے۔
خط قطرہ میں دجلہ دیکھنے اور جز میں کل کا نظارہ کرنے کا فن ہے۔ خط عرض حال
ہے۔ اظہار مدعا ہے، باتیں کرنے کا دوسرا نام ہے، وسیلۂ گفتگو ہے، مکالمہ ہے،
ہجر میں وصال کی صورت ہے، خط ایک کے دل کی بات دوسرے کے دل میں
اتارنے کا قابل اعتماد ذریعہ ہے، اور یہ عمل سب سے بے تعلق ہو کر کیا جاتا ہے،
جہاں رسوائی کے ڈر کے بغیر دل کا معاملہ کھلتا نظر آتا ہے، جہاں انسان

---

(۱) مکاتیب مہدی، مہدی افادی) ، ص ۱۸۵

زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات میں الجھا ہوا ہے، ان واقعات کا انسانی زندگی پر
جو عمل ہوتا ہے، وہ بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ "غرض خط ایک جہان راز ہے
جس کے راز اگر سربستہ رہیں، تو وہ سینوں کو گہرہائے معنی کے دفینے بنادیں اور
آشکارا ہو جائیں تو جذبے کی ساری دنیا زعفران زار بن جائے۔"(۱)

خطوط نویسی کے اصول

قدیم زمانے میں خطوط نہایت پر تکلف ہوتے تھے۔ مکتوب الیہ کے القاب وآداب مبالغے کے ساتھ تحریر کیے جاتے تھے، مقفیٰ مسجّع عبارت آرائی میں نفس مضمون کہیں گم ہو کر رہ جاتا تھا، مرزا غالب نے مکتوب نگاری کے روایتی طریقوں کو بدلا، انھوں نے فارسی خط وکتابت کے لیے مندرجہ ذیل اصول پیش کیے۔

(۱) خط کے شروع میں مکتوب الیہ کو اس کے مرتبے اور اس سے ذاتی تعلق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مخاطب کیا جائے۔

(۲) خط میں جو بھی باتیں بیان کرنی ہوں انھیں سلیقے سے ترتیب دیا جائے۔

(۳) الفاظ اور عبارت پیچیدہ نہ ہو جس سے مطلب سمجھنے میں مشکل ہو۔

(۴) القاب وآداب مختصر ہوں اور رسمی طور پر اپنی خیریت کی اطلاع دینے اور مکتوب الیہ کی خیریت طلبی سے گریز کیا جائے۔

(۵) اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ تحریر میں باہمی گفتگو اور مکالمے کا انداز پیدا ہو۔

(۶) مخاطب کے علاوہ عبارت میں بھی مکتوب الیہ کے مرتبے کا خیال رکھا جائے۔

(۷) زبان کی صحت اور خوبی کا خیال رکھیں، ایک ہی لفظ کو بار بار نہ دہرائیں، بے جا طوالت سے بچنا چاہیے۔

---

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقاء۔ رشیدہ خاتون، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد، سنہ اشاعت ۱۹۸۹ء)، ص ۱۱، ۱۲۔

غالب نے فارسی مکتوب نگاری کے جو اصول بیان کیے ہیں وہ اردو خطوط کے لیے بھی مناسب ہیں، غالب نے اپنے اردو خطوط میں بھی ان اصولوں کو برتا ہے، اور آج تک انھیں اصولوں پر خط لکھے جاتے ہیں، ویسے تو خطوط نگاری کے لیے اصول و ضوابط نہیں بنائے گئے، لہٰذا خط کی صنف فنی جکڑ بندیوں سے بہت حد تک آزاد ہے، اگر ہم تجزیہ نفس کی زبان میں خط کا مطالعہ کریں تو یہ غیر آہنگ تلازم کی صنف ہے اس میں ہر بات کی گنجائش ہے۔

خط کے اجزاء

خط کے مندرجہ ذیل اجزاء ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

(۱) مکتوب نویس کا نام (۲) تاریخِ تحریر (۳) نشان مجاریہ (۴) مقدمہ (Subject)

(۵) حوالہ نشان (۶) القاب (۷) آداب (۸) نفسِ مضمون (۹) خاتمہ

(۱۰) مکتوب نویس کے دستخط (۱۱) مکتوب الیہ کا نام اور پتہ۔

ان اجزاء کی تعریفیں یہ ہیں:

(۱) مکتوب نویس کا نام اور پتہ: خط کی ابتدا میں دائیں جانب مکتوب نویس اپنا نام اور پتہ درج کرے، پتے کے نیچے گھر اور دفتر کے فون نمبر، فیکس نمبر، فائل نمبر اور ای میل کا پتہ موجود ہو تو درج کیا جائے۔

(۲) تاریخ تحریر: پتہ کے نیچے تاریخ تحریر درج کی جائے۔

(۳) نشان مجاریہ: سرکاری / دفتری، مراسلہ یا کاروباری خط میں تاریخ تحریر کے محاذی بائیں طرف نشان مجاریہ دیا جائے تا کہ پتہ چلے کہ خط یا مراسلہ کس فائل سے متعلق ہے، اس کا سلسلہ نشان کیا ہے۔

مقدمہ (Subject) : سرکاری / دفتری مراسلوں اور کاروباری خط میں صراحت کی جاتی ہے کہ اس کا موضوع کیا ہے، اسے اصطلاح میں مقدمہ کہا جاتا ہے۔

(۵) حوالہ نشان: مقدمے کے بعد سرکاری / دفتری مراسلے یا کاروباری خط میں اگر اس موضوع سے

متعلق پہلے خط وکتابت ہو چکی ہو تو مکتوب نویس اور مکتوب الیہ کے خطوط / مراسلوں کے حوالے دیے جاتے ہیں، نجی خطوط میں مقدمہ یا حوالہ نہیں ہوتا۔

(۶) القاب: نشان مجاریہ (اگر ضروری ہو) اور تاریخ تحریر کرنے کے بعد مخاطب کی مناسبت سے القاب لکھے جاتے ہیں جیسے محترمی و معظمی، مکرمی، عزیزِ من، ڈیر وغیرہ۔ سرکاری اور کاروباری خطوط میں مکرمی یا جناب والا لکھنا کافی ہے۔

(۷) آداب: القاب کے بعد آداب لکھے جاتے ہیں جیسے السلام علیکم، سلام مسنون، آداب، آداب عرض ہے وغیرہ۔

(۸) نفس مضمون: ان اجزاء کے بعد نفس مضمون تحریر کیا جاتا ہے، مکتوب نویس مکتوب الیہ سے جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ حالات وواقعات ہوں، کیفیات وخیالات ہوں، احکام ہوں، فرمائش یا جواب فرمائش ہو، حسب ضرورت اختصار کے ساتھ یا کسی قدر تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا جاتا ہے۔

(۹) خاتمہ: نفس مضمون کا خاتمہ ایسی عبارت سے ہو جو یہ ظاہر کرے کہ خط مکمل ہو چکا ہے اور مکتوب نگار رخصت لے رہا ہے، اختتامی کلمات کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں: اب اجازت دیجیے، خدا حافظ، فقط وغیرہ۔

(۱۰) مکتوب نویس کے دستخط: آخری کلمات کے بعد مکتوب نگار مکتوب الیہ سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہوئے چند الفاظ لکھ کر اپنے دستخط ثبت کرتا ہے جیسے آپ کا خیر اندیش، دعا گو، مخلص وغیرہ۔

(۱۱) مکتوب الیہ کا نام اور پتہ: آج کل یہ رواج ہے کہ خط کے اختتام پر نیچے کی طرف داہنی جانب مکتوب الیہ کا نام اور مکمل پتہ تحریر کیا جائے، یہی پتہ لفافے پر درج کیا جاتا ہے، مکتوب الیہ کا نام اور پتہ لفافے کے داہنی طرف لکھا جائے اور بائیں طرف نیچے کی جانب مکتوب نویس اپنا نام اور پتہ لکھے۔

خطوط کی قسمیں

خطوط کئی قسم کے ہوتے ہیں، چند خاص قسمیں یہ ہیں:

(۱) نجی اور ذاتی خطوط (۲) دفتری / سرکاری خطوط (۳) کاروباری / تجارتی خطوط

(۴) اخباری خطوط / مراسلے (۵) ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط۔

بقول رشیدہ خاتون خط کی دو قسمیں ہیں:

(۱) نجی / ذاتی خطوط، جن کا تعلق ذات سے ہوتا ہے، یہ نجی حیثیت سے لکھے جاتے ہیں اور منظر عام پر لانے کے لیے نہیں ہوتے، لیکن ان میں رعنائی، جاذبیت اور سحر کاری کی خصوصیات پیدا کی جاسکتی ہیں۔

(۲) غیر نجی یعنی کاروباری۔ دفتری، سیاسی، مذہبی، تجارتی اور اطلاعاتی وغیرہ وغیرہ۔ یہ خطوط متعلق اشخاص کے لیے مفید ہوسکتے ہیں، لیکن دوسروں کے لیے ان میں دلچسپی کا سامان کم ہوتا ہے، ان خطوط کا دائرہ متعین اور محدود ہوتا ہے، یہ خطوط عام طور پر غیر فنی ہوتے ہیں، ان میں دل ربائی ہوتی ہے نہ رعنائی، نہ جاذبیت اور نہ سحر کاری۔ اس کے بر خلاف نجی خطوط میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کی ہم اچھے خطوط سے توقع رکھتے ہیں۔(۱)

مختصراً ان خطوط کی تعریفیں بھی بیان کر دی جائیں اور وہ یہ ہیں:

(الف) نجی اور ذاتی خطوط:

یہ وہ خطوط ہیں جو کسی شناسا، دوست یا رشتہ دار کو لکھے جاتے ہیں، اس میں مکتوب نویس اور مکتوب الیہ کے باہمی تعلق کے لحاظ سے القاب اور آداب لکھے جاتے ہیں، جیسے بزرگوں کے لیے مخدومی و معظمی، محترمی، نیازیش، حضرت ابا جان قبلہ، جناب بھائی صاحب قبلہ۔ چھوٹوں کے لیے عزیزی، جان پدر، میرے نورِ نظر وغیرہ۔ بقول رشیدہ خاتون "خطوط بنیادی طور پر ایک شخصی اور نجی چیز ہوتی ہے، اس لیے اصولاً اگرچہ اس کی افادیت محدود ہوتی ہے، مگر عملاً منظر عام پر آکر یہ خط علم وادب کا قیمتی سرمایہ بن جاتے ہیں۔" (۲)

(ب) دفتری اور سرکاری خطوط:

یہ وہ خطوط یا مراسلے ہوتے ہیں جو ایک دفتر کا عہدہ دار دوسرے دفتر کے عہدہ دار کو لکھتا ہے،

---

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقاء، مطبع، نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۲ ۲۴۔

(۲) اردو خطوط نگاری کا ارتقاء، مطبع، نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۲۴۔

دفتری میمو، گشتی مراسلے، درخواستیں وغیرہ اسی ذیل میں آئیں گے۔

(ت) کاروباری اور تجارتی خطوط:

یہ خطوط دفتری خطوط سے مماثلت رکھتے ہیں۔ ان خطوط میں مکتوب نویس اور مکتوب الیہ بالعموم کاروباری ادارے اور خریدار ہوتے ہیں۔

(پ) اخباری خطوط / مراسلے:

یہ وہ خطوط ہیں جو اخبار کے قاری اخبار کے ایڈیٹر کو لکھتے ہیں۔ ان خطوط کے موضوعات متعین نہیں ہیں، ملک کے سیاسی حالات، معاشی مسائل، بلدی مسائل اور مختلف محکموں کی کارکردگی کے بارے میں تعریفیں یا شکایتی مراسلے لکھے جاتے ہیں، خط کے آغاز میں ایڈیٹر کو مخاطب کیا جاتا ہے، مراسلے کے موضوع کے لحاظ سے ایڈیٹر اس پر کوئی عنوان لگا دیتے ہیں، القاب، مکرمی ایڈیٹر صاحب کے بعد آداب، تسلیم، تسلیمات، آداب عرض ہے، لکھے جاتے ہیں۔

(ٹ) ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط:

ادبی، علمی، تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط بڑی اہمیت رکھتے ہیں، ادیبوں کے خطوط سے ان کی زندگی کے حالات، ان کی شخصیت، ان کے دور کی تہذیبی معاشرتی اور سیاسی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں ان کے تصورات کیا تھے، علاوہ ازیں ان خطوط سے ان کی شعری اور ادبی تخلیقات کی تحسین میں بھی مدد ملتی ہے، عالموں اور دانشوروں کے خطوط کے ذریعہ جہاں مختلف علمی مسائل پر ان کے خیالات تبصروں سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، وہیں ان سے اجتماعی زندگی کے مختلف شعبوں کی اصلاح اور ترقی میں رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ادیبوں، شاعروں، عالموں اور دانشوروں کے خطوط خاص ادبی شان رکھتے ہیں۔ انھیں اصنافِ ادب میں جگہ دی جاسکتی ہے اور ادب پارے کی حیثیت سے ان کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں ایسے خطوط کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ جن ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اس صنفِ

ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے ان میں چند قابلِ ذکر نام یہ ہیں: مرزا غالب، سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، مہدی افادی، ابو الکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، اقبال، فیض احمد فیض، عبد الرحمن بجنوری، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، اکبر الہ آبادی، امیر مینائی، شاد عظیم آبادی، امتیاز علی تاج، فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، جگر مراد آبادی وغیرہ۔

تنقیدی نقطۂ نظر سے نجی وذاتی خطوط کو منظر عام پر لایا جائے کہ نہیں، اس تعلق سے لوگوں کی الگ الگ رائیں ہیں جن میں سے چند کا ذکر کیا جارہا ہے:

رشید احمد صدیقی نے اس کے متعلق اپنے ایک خط میں عبد الماجد دریابادی کو مورخہ ۱۶/ جون ۱۹۶۳ئ کو لکھا ہے کہ "نجی خطوط کے شائع نہ کرنے کے جواز میں، دوستوں سے گفتگو اور بحث کے دوران میں مثال بجنسہ ہی دیتا تھا جو آپ نے دی ہے، یعنی غسل خانے میں تانک جھانک کس صحیفۂ اخلاق میں روا ہے"۔(۱)

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کے مکتوب مورخہ ۱۵/ جنوری ۱۹۵۲ء میں ایک ایسے ہی مکتوب کا حوالہ ملتا ہے:

"ان خطوط کو آپ ہی رکھ لیں، میں ایسے خطوط کو اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا جن میں لکھنے والے نے نجی باتیں لکھی ہوں اور اس کا امکان ہو کہ جس کو لکھا گیا ہو وہ کبھی اس سے اس طور پر فائدہ اٹھائے کہ لکھنے والے کو شرمساری ہو"۔(۲)

ان دونوں خطوط کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایسے خطوط جن سے کسی کی شخصیت مجروح ہو اور وہ طنز وظرافت کا نشانہ بنے اس سے بہتر ہے کہ ایسے خطوط شائع نہ کیے جائے یا تو وہ لوٹا دیے جائیں یا تلف کردیے جائیں۔ رشید احمد صدیقی کا اصرار تھا کہ میرے خطوط منظر عام پر نہ لائے جائیں چاہے وہ کسی کے نام ہوں۔ بقول رشیدہ خاتون:

---

(۱) عبد القوی دسنوی، مضمون خط نگاری، ماہنامہ کتاب، جون ۱۹۷۵ء

(۲) رشید احمد صدیقی نمبر، اکتوبر دسمبر شمارہ ۴، ماہ نامہ تحریر۔

”ان کا اصرار تھا کہ میرے خطوط خواہ کسی کے نام ہوں، شائع نہ کیے جائیں۔ نجی خطوط کے شائع ہونے سے مختلف شخصیات طنز وظرافت کا نشانہ بن سکتی ہیں، اور جہاں تہاں رازہائے دروں بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ غالباً انھوں نے اس نوعیت کے خطوط تلف نہیں کیے بلکہ واپس کر دیے ہیں۔“(۱)

ادیبوں، دانشوروں کے نجی وذاتی خطوط کو شائع کرنے نہ کرنے کے متعلق خوشید الاسلام لکھتے ہیں:

”وہ خط ادبی کارنامہ ہے جس کی بدولت لکھنے والا ان چند لمحوں کی طرح لازوال ہو جائے، جنھیں جنبش قلم نے محفوظ کرلیا ہو۔“(۲)

جب ادیبوں اور دانشوروں کے خطوط منظر عام پر آتے ہیں تو بہت سے دھندلے نقوش واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ ایسی تحریروں میں فنکار کا ذہن سامنے ہوتا ہے، جو پڑھنے والوں کو فکر و نظر کی دعوت دیتا ہے، یہ خطوط معلومات اور مطالعہ کے لیے ایک عظیم دستاویز بن جاتے ہیں، اس سے بہت سی راہیں کھل جاتی ہیں، مثلاً نپولین کے خطوط جو اس نے اپنی محبوبہ جوزنین کو لکھے ہیں، اور علامہ شبلی کے خطوط جو انھوں نے عطیہ کو لکھے ہیں ان دونوں شخصیتوں کے علاوہ اور بھی مثالیں موجود ہیں۔

مکاتیب کی اہمیت وافادیت

ادبی مکاتیب اپنی داخلی کیفیات اور خصوصیات کے لحاظ سے دیگر مکاتیب سے ممتاز ہیں، ادبی خیالات کو مکتوب میں اجاگر کرنا ہر مکتوب نگار کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے اعلیٰ ادبی مذاق اور زبان وبیان پر قدرت ضروری ہے، ادبی مکاتیب کو جن بنیادوں پر اعتبار حاصل ہے وہی مکتوب نگاری کے راہ نما اصول بن گئے ہیں، اس سلسلے میں پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، مولوی عبد الحق، علامہ شبلی نعمانی اور ڈاکٹر خورشید الاسلام وغیرہ کی تحریریں رہنما خطوط ہیں۔ پروفیسر خورشید الاسلام کا خیال ہے کہ ”خط لکھنا فن ہے“۔

---

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقائ، مطبع، نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ئ، ص ۲۵

(۲) ، تنقیدیں، مطبوعہ ۱۹۷۵ء ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔، ص ۱۲

رشید احمد صدیقی نے تو اسے ''فنون لطیفہ'' میں جگہ دی ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس فن پر دسترس کے لیے ویسی ریاضت کی ضرورت نہیں جیسی دوسرے فنون کے لیے لازمی ہے، مکاتیب کی اہمیت کا اندازہ ایسے ہوتا ہے کہ حالی نے ''یادگار غالب'' میں لکھا ہے:

''جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر ان کی نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظم اردو اور نظم فارسی اور نثر فارسی سے نہیں ہوئی۔'' (۱)

میتھو آرنلڈ نے لکھا ہے کہ کارلائل ان مضمونوں اور تاریخوں کے بل پر انگریزی ادب میں زندہ نہیں رہے گا جن سے پوری الماری بھری ہوئی ہے، بلکہ وہ بیش قیمت مراسلت جو اس کے اور ایمرسن کے درمیان ہوئی تھی اس کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھے گی۔

اچھے اور معیاری مکتوبات حسنِ اتفاق سے وجود میں آتے ہیں اس کے لیے سعی نہیں کی جاتی، بلکہ ان کا تعلق زیادہ تر ذہن کی وقتی حدوں سے ہوتا ہے، اور ایسے خطوط سطح ذہن سے منتقل ہو کر قلم پر آجاتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ ''خط لکھا نہیں جاتا بلکہ لکھ جاتا ہے، اور لکھنے والے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسے لکھے ''مکتوب کی سب سے بڑی خوبی اس کی ''قطعیت'' ہے، یہ ضروری ہے کہ مکتوب نگار جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ بآسانی ترسیل کے مرحلے سے گذر کر مکتوب الیہ تک پہنچ جائے۔

خط کی ایک خوبی جزئیات نگاری ہے، جزئیات میں وہ ادیب کامیاب ہو سکتا ہے جسے زندگی سے محبت ہو، اور جس نے زندگی کے واقعات کا محض ایک تماشائی کی طرح نہیں، بلکہ ایک خاص نقطۂ نظر سے مشاہدہ کیا ہو، مکتوب کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں محبت و موانست پائی جائے، اس عمل میں صرف دو انسان موجود ہوتے ہیں کسی تیسرے کا کوئی وجود نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کے وہ سبک، دلکش اور نازک پہلو، جو اس کے بلند کارناموں میں ظاہر نہیں ہوتے، مکتوب میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔

علماء کے نزدیک مکتوب کو زندہ رکھنے والا سب سے بڑا عنصر اس کا دلچسپ انداز بیان ہوتا ہے،

---

(۱) یادگار غالب، مطبوعہ ۱۹۳۱ئ، ص ۱۸۸

خط میں شخصی جذبے کا استعمال کچھ ایسے انداز میں ہو کہ شخصی ہونے کے باوجود اس کی حیثیت ہمہ گیر انسانی ہو، اس میں ایسی باتیں ہوں جو عام انسانی جذبات کو اپیل کر سکیں، ایسے مکتوبات کی دلچسپی اور دیر پا مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا، اردو میں اس کی مثال صرف غالب کے خطوط ہیں۔ بقول رشیدہ خاتون:

> "خطوط کی ادبی اہمیت تخلیقی کارناموں سے کم نہیں، جس طرح ادب کی مختلف اصناف سخن کا مطالعہ دلچپسی سے کیا جاتا ہے اسی طرح خطوط بھی دلچپسی سے پڑھے جاتے ہیں، بلکہ بعض حضرات کا تو یہ خیال ہے کہ اختصار کی وجہ سے اس صنف کو نثر کی دوسری اصناف پر فوقیت حاصل ہے، اور لوگ ناول اور افسانے کے مقابلے میں خطوط کا مطالعہ زیادہ پسند کرتے ہیں، نیز مکاتیب علم وادب کے چھوٹے چھوٹے جواہر پارے ہوتے ہیں جنھیں پڑھتے وقت دماغ پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا، استفادہ بیشتر ہوتا ہے اور زحمت کمتر۔"(۱)

مکاتیب کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے شہناز قادری اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"غرض مکتوب نویسی کو ہر دور نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مکتوب نویسوں کو تعظیم و تکریم کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ایجاد خط نے نہ صرف انسان کی حدِ نظر تک پھیلی ہوئی طویل مشکلات کا ازالہ کیا بلکہ اس میں مشاہیر کی شخصیات اور ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے اور ان کی شائستہ خصائل سے بھی پردے ہٹائے گئے۔ خط وکتابت کی اہمیت ہر دور میں کلیدی حیثیت کو حامل رہی ہے۔ دورِ اسلام نے مراسلت کو اس قدر اہمیت وافادیت عطا کی کہ اس دور کی ابتداء میں ہی یہ فن ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہوا۔"(۲)

مکتوب کی خوبی کے سلسلے میں بنیادی چیز اس کی لطافت ہے، مکتوب کا مضمون کچھ بھی ہو، غم والم

---

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقائ، مطبع، نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ئ، ص۳۷۔

(۲) رسالہ سب رس، سنہ اشاعت اکتوبر ۲۰۱۹ئ، حیدر آباد۔، ص۲۸۔

تلخی وناگواری، شکوہ وشکایت، تمنائے وصل یا شکوہ ہجر یا ضروریات زندگی کے مادی پہلوؤں کی کاروباری باتیں، لیکن یہ سب اچھے مکتوب نگاروں کے یہاں کچھ ایسے انداز میں بیان ہوتی ہیں کہ ایک خوشگوار اور لطیف کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادبی مکتوب شغل کی چیز نہیں، شوق کی متاع ہے، مکتوب اس بات کو ذہن میں رکھ کر نہیں لکھے جاتے کہ وہ ادبی شکل اختیار کریں۔ لیکن بعض لوگوں کے مکتوبات بے ساختگی، بے تکلفی اور طرز ادا کی وجہ سے اعلیٰ ادبی مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ بقول سید عبداللہ:

> "خط نگاری خود ادب نہیں، مگر اس کو خاص ماحول، خاص مزاج، خاص استعداد اور خاص فضا میسر آ جائے تو یہ ادب بن سکتی ہے، خط کو ادب بنانے کا کام بہت مشکل ہے، یہ شیشہ گری ہے بلکہ اس سے بھی نازک تر"۔(۱)

مکاتیب عام طور پر اشاعت کی غرض سے لکھے نہیں جاتے، مکتوب نگار زیادہ تر معلومات غیر ارادی طور پر پیش کرتا ہے اور ان معلومات میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی۔ لکھنے والا کسی خاص مقصد کے تحت کوئی خاص نتیجہ بر آمد کرانے یا کوئی خاص تعصب و تاثر پیدا کرنے کے لیے ان معلومات کو مسخ کر کے اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش نہیں کرتا۔ اس کی فراہم کردہ معلومات بے ساختہ ہوتی ہیں، اس لیے یہ مستند ہوتے ہیں۔ مکتوبات تمام اصناف میں سب سے زیادہ شخصی یا نجی ہوتے ہیں اور اس میں شخصیت کا پرتو پوری طرح منعکس ہوتا ہے۔ اردو کے ممتاز نقاد آل احمد سرور کے مطابق:

> "ادب میں تازگی، لذت، سچائی اور زندگی، شخصیت سے آتی ہے، شخصیت کی گرمی سے بے جان الفاظ منھ سے بولنے لگتے ہیں اور اقبال کے الفاظ میں نالہ نے، سرور مئے اور شیشے کی صراحی میں شمشیر کی تیزی ملنے لگتی ہے"۔(۲)

انیسویں صدی کی نفسیاتی موشگافیوں نے ادب کو بے حد متاثر کیا ہے، اب ادب پارے

---

(۱) اطراف غالب، ص۳۵۳

(۲) تنقیدی اشارے، ص۶۱۔۶۲

انفرادی حیثیت یا محض کسی فنکار کی ذہنی اختراع تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان پر ادیب کی ذات اور ماحول کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں، اس نقطۂ نظر سے ادب کی افہام و تفہیم میں مکاتیب اہم رول ادا کرتے ہیں۔

مکتوب ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے دور دراز رہنے کے باوجود قربت کا احساس دلاتے ہیں، مکتوب نگار اپنے دل کی بات کہتا ہے، جس سے اس کے ذہن کا اندازہ ہوتا ہے، فکر کو فضا کا علم ہوتا ہے، اس کی طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

مکاتیب کبھی تاریخ کی ترتیب و تدوین میں مورخ کی مدد کرتے ہیں، کبھی اس میں رپوز تاژ کی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں، اور وہ کبھی روزنامچے کے فرائض انجام دیتے ہیں، کبھی واقعات سناتے ہیں تو کبھی کہانی کا لطف عطا کرتے ہیں اور کبھی سانحات اور واقعات سے آگاہ کرتے ہیں، اس سلسلے میں ڈاکٹر اسرار اللہ انصاری نے اپنے مضمون تحریک آزادی اور اردو خطوط میں رقمطراز ہیں:

> ”غرض یہ کہ جب ہم جدوجہد آزادی کی پوری تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ آزادی کی لڑائی جن اہم ہتھیاروں سے لڑی گئی ان میں ایک خط کا بھی اہم حصہ ہے۔انگریزی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کے سلسلہ میں ابتداء سے لے کر صبح آزادی تک بے شمار خطوط لکھے گئے جن میں آزادئ وطن کی چنگاریاں موجود ہیں“۔(۱)

مکتوبات سوانح نگاری کے بہترین ماخذ ہوتے ہیں، مکتوب نگار کے خاندانی حالات، اس کی زندگی کے بیشتر واقعات، اس کے عقائد و نظریات، اس کی سیرت و شخصیت کا پورا علم ان خطوط سے ہوتا ہے، وہ اپنے پیشرو اور ہم عصر فنکاروں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟ یہ سب بہت واضح انداز میں مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے۔

مرزا غالب کے سوانح نگاروں نے ان کے خطوط کو بنیاد بنا کر اہم نکتے وا کیے ہیں۔ مولانا

---

(۱) نیا دور، اگست ۲۰۱۷ء، ص ۶

عبد الماجد دریابادی کی دو کتابیں ”حکیم الامت“ اور ”محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند ورق“ میں سوانح کے جو کرشمے نظر آتے ہیں وہ سب مکاتیب کی بدولت ہیں، مولانا عبد الماجد دریابادی نے جید عالم دین مولانا اشرف علی تھانویؒ کو لکھے گئے خطوط اور ان کے جوابات ”حکیم الامت“ میں شامل کیے ہیں۔ یہ مولانا کا کمال ہے کہ خطوط سے استفادہ کرتے ہوئے ”ذاتی ڈائری“ میں مولانا محمد علی کے حالات اور نجی واقعات کو موثر انداز میں درج کیا ہے، ان کتابوں کی اہمیت اس قدر ہے کہ کوئی بھی سوانح نگار یا پارکھ ان شخصیتوں کی افہام و تفہیم کے ضمن میں انھیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایک اچھے مکتوب نگار کا قلم ایسی گل افشانیاں کرتا ہے کہ مکاتیب میں تنوع، رنگا رنگی اور بو قلمونی پیدا ہو جاتی ہے، اچھے مکاتیب زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہو کر عہد کے انسان سے تعلق قائم کر لیتے ہیں، جہاں تاریخ خاموش ہوتی ہے وہاں مکتوبات گویا ہوتے ہیں، ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے متعلق معلومات کے جو ذرائع ہیں، ان میں غالب کے خطوط اہم ترین ہیں، ہر چند کہ تاریخ کی متعدد کتابیں موجود ہیں اور ہماری معلومات میں اضافہ بھی کرتی ہیں، کن اذیتوں سے وہ گزرے، ان سب کی تفصیلات کسی کتاب میں محال ہے، بہ الفاظ دیگر ان واقعات اور کیفیات کے چشم دید گواہ صرف خطوط غالب ہیں۔

مکاتیب محض موضوعات کے لحاظ سے اہم نہیں ہوتے بلکہ فکر و اسالیب کے نقطۂ نظر سے بھی اہمیت رکھتے ہیں، رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث خاں بے خبر کے خطوط میں بھی مضامین کا تنوع پایا جاتا ہے، ان میں اپنے عہد کی تصویریں بھی ملتی ہیں، لیکن سرورؔ اور بے خبر کے یہاں مدھم اور غیر دلکش ہیں، غالب کے یہاں یہ تصویریں جیتی جاگتی اور دل آویز نظر آتی ہیں، زبان کا چٹخارہ، لہجے کا خلوص اور اسلوب کی رفعت نے اس میں جان ڈال دی ہے۔ مکاتیب کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رشیدہ خاتون لکھتی ہیں:

> ”ہماری روز مرّہ کی زندگی میں خطوط نگاری کی بہت اہمیت ہوتی ہے، اس قسم کی اہمیت دور قدیم اور دور متوسط میں بھی تھی، مگر اس وقت رسل و رسائل کے ذرائع محدود تھے، اس لیے خطوط نگاری بہت زیادہ ترقی نہیں کر سکی، لوگ

عام طور سے خاص خاص مواقع پر خطوط لکھتے تھے، لیکن دور جدید میں محکمۂ ڈاک
کی ترقی کی وجہ سے خطوط کافی تعداد میں لکھے جارہے ہیں، لہذا خطوط کی اہمیت بھی
روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔"(۱)

ہر چند کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے دور میں مکتوب نگاری کی روایت ماند پڑتی جارہی ہے تاہم دورِ قدیم اور موجودہ عہد کی تاریخ وتہذیب کے امانت دار مکاتیب ہی ہیں، اس لیے ان کی حیثیت اور اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔

مکتوب نگاری کے مراحل (آغاز وارتقا)

یہ کہنا مشکل ہے کہ خطوط نویسی کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی؟ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب سے تحریر کی ابتدا ہوئی اسی وقت سے خطوط نویسی کی بھی ابتدا ہوئی، اور رسم تحریر اس وقت وجود میں آئی جب انسان نے وحشیانہ اور جنگلی زندگی چھوڑ کر تہذیب وتمدن کو گلے لگایا، ابتداءً تیز اور نوکیلی اشیائ، پتھر یا لکڑی وغیرہ کی مدد سے انسانوں نے چند علامتیں بنا کر اپنے احساس وجذبات کی ترجمانی کی اور یہی ابتدائی شکل ترقی کرکے رسمِ خط میں تبدیل ہوئی، بہ الفاظِ دیگر مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی فن تحریر کی، مکتوب انسانی ذہن کے دورِ ارتقا کی سب سے اہم اور ابتدائی ایجاد ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کاغذ کی ایجاد سے بہت پہلے ہی انسان نے مکتوب نگاری شروع کردی تھی۔ بقول شہناز قادری:

"اگرچہ دور حاضر میں بذریعہ کمپیوٹر انگلی کے چھوٹے سے اشارے سے
خط لکھنے والے خطوط نگاری میں انقلابی تبدیلیاں لاچکے ہیں تاہم ہمارے لیے ازحد
لازمی ہوجاتا ہے کہ تاریخ کے اوراق پلٹ کر ایک نگاہ اس عظیم نثری ورثے یعنی
مکتوب نویسی کی تاریخ پر ڈالی جائے، جہاں تک مکتوب نویسی یا خطوط نگاری کی
تاریخ کا تعلق ہے یہ بہت پرانی ہے، اگرچہ کاغذ کی ایجاد انسانی زندگی کی اہم ترین
اور انقلاب انگیز ایجاد ہے جس کو علم وادب کی دنیا میں

---

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقا، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ فیض آباد، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، ص ۳۷

غیر معمولی اہمیت حاصل ہے لیکن خطوط نویسی اس غیر معمولی ایجاد سے قبل ہی معرض وجود میں آچکی تھی، پتھر کے زمانے(Stone age) میں ہی انسان نے خطوط کی تحریر کا سلسلہ شروع کر دیا بلکہ بنی نوع انسان کی اولین ضروریات میں مکتوب نویسی کا عمل دخل ازل سے ہی تھا، انسان نے پہلے پہل مکاتیب درختوں کے پتوں، مٹی کی لوحوں اور چمڑے وغیرہ پر تحریر کیے، اس سے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ خطوط نویسی کسی قدر انسانی وجود کے ساتھ وابستہ رہی ہے، بنی نوع انسان نے ابتداءً ہی ذرائع ابلاغ کی اہمیت کو نہایت ہی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس ضرورت نے وسائل کے مطابق بتدریج ارتقا کی منزلوں کی تلاش کر کے ان پر گامزن ہونا شروع کر دیا، یہاں تک کہ اس ضرورت نے ایک لطیف ترین فن کی صورت اختیار کر کے خاص اہمیت حاصل کی، چنانچہ ظہور اسلام نے اس فن کو مزید وسعت واستحکام بخشا، یہ بات نہایت ہی غور طلب اور عالمِ مکتوب نویسی کی خوش بختی کی ضامن ہے کہ خود حضرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے مہر شدہ چند خطوط اپنی اصل حالت میں عالمِ ادب میں موجود ہیں۔

آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے لے کر دنیا کے بڑے بڑے انبیائ، اولیائ، مفکرین، شعرائ، حکماء اور عام انسانوں تک مکتوب نویسی کا ایک طویل سلسلہ جاری وساری رہا ہے۔ فن مکتوب نویسی کے لیے باقاعدہ وباضابطہ اصول وضوابط وضع کیے گئے اور ان پر کتابیں مرتب کی گئیں، مکتوب نویسی کی مختلف اقسام کے لیے مختلف اسالیب کو مقرر کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں پیشہ ورانہ طور پر خطوط تحریر کرنے والے رکھے گئے جنھیں مکتوب نویس اور منشی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، اور ان کے تحریر کردہ خطوط کے مجموعے دنیا کی ہر ترقی یافتہ

زبان کی نثر کا ایک عظیم اور اہم حصہ بن گئے۔"(۱)

بعض مورخین کا خیال ہے کہ مکتوب نگاری کی ابتدا کوئی چار ہزار برس قبل چین میں ہوئی، تاہم شواہد کی عدم موجودگی میں اسے محض قیاس آرائی ہی قرار دیا جائے گا، البتہ ۱۸۸۷ء میں سمرنا کے مقام پر جو کھدائی ہوئی ہے اس میں تین سو مٹی کی لوحیں ملی ہیں جن پر فراعنہ کے نام خطوط کندہ ہیں، اس تعلق سے رشیدہ خاتون لکھتی ہیں:

"خط کی ابتدا کب ہوئی؟ اس کا علم اب تک حاصل نہیں ہو سکا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ خط نے دو اشخاص کے درمیان دوری کو قربت میں بدلنے کی کوشش کی اور ہجر میں وصل کی لذتوں سے آشنا کیا، اس دوری نے خط لکھنے کی ابتدا کی، خط لکھنے کی ابتدا نے رسم تحریر کو ایجاد کیا، غرض کہ مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی فن تحریر کی، کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب انسان درختوں کے پتوں، دھات کی پیٹوں، چمڑے اور مٹی کی لوحوں پر لکھتا تھا، تب بھی خط لکھے جاتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔ خطوط نگاری کا رواج زبان وادب سے قدیم عہد سے چلا آرہا ہے، قیاس ہے کہ اب سے کوئی چار ہزار برس قبل سے پہلے چین کے بادشاہوں نے خط نگاری شروع کی تھی، چین کے اپنائے گئے طریقوں کا پورا حال نہیں ملتا۔"(۲)

بعض مورخ مکتوب نگاری کی ابتدا کا سہرا ایران کے ایک بادشاہ 'سائرس' کے سر باندھتے ہیں، جو ساڑھے پانچ سو برس قبل مسیح میں حکمراں تھا۔ سامانی عہد کے بادشاہ نوشیرواں عادل کے خطوط کا مجموعہ "توقیعات کسریٰ" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ رشیدہ خاتون لکھتی ہیں:

"تاریخ دانوں کا خیال یہ ہے کہ بالکل صحیح ڈھنگ سے اس طریقے کو

---

(۱) سب رس، مضمون اردو میں مکتوب نویسی، روایت اور تسلسل، اکتوبر ۲۰۱۹ئ، ص ۲۴

(۲) اردو خطوط نگاری کا ارتقا، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ئ، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد، ناشر: رشیدہ خاتون، ص ۳۹

ایران کے ایک بادشاہ سائرس نے شروع کیا تھا، یہ بادشاہ حضرت عیسیٰؑ سے کوئی ساڑھے پانچ سو سال پہلے حکومت کرتا تھا، اس نے گھڑ سواروں کے ذریعہ ڈاک لانے اور لے جانے کا انتظام کیا تھا، اس کی اس ایجاد کا اعتراف یونانی تاریخ داں ہیرڈوٹس نے بھی کیا ہے، اس ملک میں شاہی خطوط بھی لکھے گئے ہیں، چنانچہ ساسانی عہد کے بیسویں بادشاہ نوشیرواں عادل نے اپنے دربانیوں کے نام فرامین کی شکل میں خطوط لکھے ہیں جنھیں ''توقیعات کسریٰ'' کہتے ہیں، ایران کے بعد یہ طریقہ ساری دنیا میں اپنایا جانے لگا۔''(۱)

مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن اور معیار عطا کرنے میں ''رومیوں'' کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، عہدِ قدیم سے ہی روم علمی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے متمول واقع ہوا ہے، یہاں کی حکومتوں نے اپنے دور دراز صوبوں میں لائق اور باصلاحیت گورنروں کا تقرر کیا تھا اور دار الحکومت وصوبوں کے درمیان رابطے کا موثر ذریعہ مکتوب تھے۔ اس سلسلے میں سیسرو کے مکاتیب بطور خاص پیش کیے جاتے ہیں، جس میں روم کی معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی پر بڑی فصیح اور بلیغ انداز میں نظر ڈالی گئی ہے۔ رومیوں کے مکاتیب کی زبان، خطابت اور روز مرّہ کے بین ہے، عیسائی مذہب نے بھی مکتوب نگاری کے فروغ میں خاصا رول ادا کیا، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے خطوط انجیل مقدس میں شامل ہیں۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام:

''مکتوب نگاری کی ابتدا سلطنت روم کے سائے میں ہوئی، ممکن ہے قدیم تہذیب کے دوسرے مرکزوں میں بھی اس نے فروغ پایا ہو لیکن یہ ثابت نہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یونان میں یہ شغل نہ عوام میں محبوب ہوا نہ خواص میں، شاید اس لیے کہ یہ شہری ریاستیں، سیاسی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر سیاروں میں تبدیل ہو گئیں تھیں، ہر ریاست ایک دنیا تھی، معاشرت محدود تھی، بُت کدوں

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقا، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد، ناشر: رشیدہ خاتون، ص ۳۹۔۴۰، ایضاً

میں، ورزش کے میدانوں میں، دوستوں کی محفلوں میں، لوگ ایک دوسرے سے مل سکتے تھے، دل کے غبار اور سر کے خمار کے لیے راہیں کھلی تھیں، اپنے سیارہ کے علاوہ، دوسروں کا وجود وعدم ان کے لیے برابر تھا، وہاں کے بسنے والوں سے انھیں اتنی ہی دلچسپی تھی یا ہو سکتی تھی جتنی ہمیں فرشتوں سے ہو سکتی ہے، فرشتوں سے دوستی کے امکانات کم ہیں اور بفرض محال ہوں بھی تو یہ اندیشہ کیا کم ہے کہ فرشتے مسکراتے بھی ہیں، بہر حال اس روایت کے نشو ونما کے لیے شرط ہے، وسیع معاشرت باقاعدہ حکومت، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جاننے کے مواقع، عملی زندگی سے واقفیت ایک ایسی زبان جو دور ونزدیک بولی اور سمجھی جاتی ہو اور جس میں ادبی صلاحیتیں ہوں، یہ شرائط پہلی بار رومی معاشرت میں پورے ہوئے۔"(۱)

روم میں مکتوب نگاری کے آغاز وارتقاء کے متعلق ڈاکٹر خورشید الاسلام دوسرے صفحے پر رقم طراز ہیں:

"روم کی زندگی کی جھلکیاں اور اس کی معاشرت کی پرچھائیاں دیکھنی ہوں تو سسرو کے مکاتیب میں دیکھیے، آپ ان میں سادگی کی تلاش کریں گے تو خالی ہاتھ واپس آئیں گے، رومیوں کے مکاتیب کی زبان خطابت اور روزمرہ کی بول چال کے بین ہے، اس دور میں فن خطابت کے اصول اور بلاغت کے قواعد خواص کی ذہنی تربیت کی پہلی منزل تھے۔ زندگی بندھے ٹکے قوانین کی پابند تھی۔ اس لیے مکتوب نگاری کے فن کو بھی اسی نہج پر مرتب کیا گیا تھا، خطوط کی قسمیں تھیں، مبارکباد کے خطوط، تنبیہی خطوط، تعزیت کے خطوط، ناصحانہ خطوط جن میں کسی پر ملامت کی جائے اور وہ خطوط جن میں دوسروں کو تشفی دی

---

(۱) تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سنہ اشاعت ۱۹۵۷ء، ص ۱۴

جائے۔ ان کے علاوہ سرکاری فرمان اور رقعات بھی تھے اور ان سب کے آداب والقاب، مضامین، ابتدا اور انتہا کے اسالیب مقرر تھے، القاب وآداب کے بعد، غرض دیکھیے اب یہ پانی چلا، کے انداز پر گفتگو شروع ہوتی تھی جس میں بلاغت کے سارے زیورات صرف کر دیے جاتے تھے۔(۱)

رومیوں کے فن مکتوب نگاری کے متعلق رشیدہ خاتون لکھتی ہیں:

"لیکن رومیوں نے اس فن میں سب سے زیادہ ترقی کی، ان لوگوں نے مکتوب نگاری کو ایک باقاعدہ فن بنایا، ادبی مورخ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں قابل اور پڑھے لکھے لوگ دور دور کے صوبوں کی گورنری کے لئے بھیجے جاتے اپنے صوبے کے حالات بتانے اور روم کے حالات جاننے کے لیے خط وکتابت ضروری تھی، خطوط کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے آنے اور لے جانے کے لیے انھوں نے گھوڑوں کی جگہ ایسی گاڑی کو کام میں لانا شروع کیا جسے ہم آج رتھ کہہ سکتے ہیں "سسرو" اسی عہد کا مکتوب نگار ہے جن کے مکتوب میں ہمیں روم کی زندگی کی جھلکیاں اور معاشرت کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔"(۲)

مکتوب نگاری کے آغاز وارتقا کے سلسلہ میں ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ایک خط کا ذکر کیا ہے جو بڑی اہمیت کا حامل ہے، لکھتے ہیں:

"خطوط نگاری کے سلسلے میں ایک اہم خط کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ امیر تیمور لنگ نے ۱۴۰۲ئ میں فرانس کے چارلس ششم کے نام ایک خط لکھا تھا جو اب نیشنل ارکاٹوزیبیہ میں محفوظ ہے، اس خط کا ذکر محمد بن عبد الوہاب قزوینی نے

---

(۱) تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سنہ اشاعت ۱۹۵۷ء، ص ۱۵

(۲) اردو خطوط نگاری کا ارتقائ، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ئ، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد، ناشر: رشیدہ خاتون)، ص ۴۰

> ”بست مقالہ“ میں کیا ہے، ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ادوار کے نظریہ سے خطوط کی تین قسمیں بتائی ہیں، اول مذہبی خطوط، دوسرے شاہی خطوط، تیسرے ادبی خطوط“۔(۱)

ظہور اسلام سے قبل عرب میں مکتوب نگاری کی کوئی باضابطہ روایت نہیں ملتی، البتہ پیشہ ور کاتب اس کام کو انجام دیتے تھے جنھیں کاتب کہا جاتا تھا، اسلامی دور میں اس فن نے غیر معمولی ترقی کی، اس عہد میں باضابطہ منشی اور کاتب کا عہدہ مقرر کیا گیا، جو شخصی آئین مکتوب میں کامل مہارت رکھتا تھا، وہ نہ صرف معزز سمجھا جاتا تھا بلکہ وہ امور سلطنت میں محترم بھی تھا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط کھال، کھجور کے پتے اور مٹی کی تختوں پر تحریر کرائے جو مختلف مقامات پر بھیجے جاتے تھے، ان مکتوبات کی نوعیتیں بھی مختلف تھیں، بسا اوقات سیاسی امور پر ہدایتیں اور مشورے ہوتے تھے اور کبھی دعوت اسلام، یہ مکتوب جس رسم الخط میں ہوتے تھے اسے ”خط کوفی“ کہا جاتا ہے، اس ضمن میں کسرائے فارس، مصر واسکندریہ، شاہ عمان، شاہ دمشق اور شاہِ یمن وغیرہ کا نام بطور خاص لیا جا سکتا ہے۔ معین الدین احمد انصاری لکھتے ہیں:

> ”مکتوب نگاری کے قدیم نمونے عموماً بادشاہوں اور وزیروں کے احکام ہیں جو انھوں نے جاری کئے تھے۔ یا پھر مذہبی رہنماؤں کی ہدایات اور نصیحتوں کے مجموعے ہیں، ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب کہ خطوط کو یکجا کرنے کی طرف توجہ دی گئی تا کہ ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے، مثلاً ایسے خطوط جن میں مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کی نصیحتیں اور ارشادات تھے یا پھر مشہور ادیبوں کے وہ خطوط جن سے ان کی انشاء پردازی کی قابلیت سامنے آسکے، جمع کیے جاتے تھے، ایسی کوششیں تقریباً ہر زبان میں کی گئیں، اسلام کے ابتدائی زمانے کے خطوط کے نمونے اب بھی محفوظ ہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے خطوط کو جمع کرنے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ مختلف ممالک کو اسلام کی دعوت

---

(۱) تجزیہ و تجزیہ، نسیم بکڈپو، ۱۹۷۶ئ، ص ۳۴۵

دینے کے لیے جو خطوط لکھے جاتے تھے انھیں عربی انشاء پردازی کا عمدہ نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔"(۱)

مکتوب آغاز وارتقاء کے متعلق سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"خط کیا ہے؟ آپس میں دو آدمیوں کی بات چیت؛ اس بات چیت کو کاغذوں میں محفوظ رکھنے کا دستور بہت پرانا ہے، بادشاہوں اور وزیروں کے حکم احکام کے چھوٹے چھوٹے فقرے جو بلاغت کی جان ہوتے تھے اور توقیعات کہلاتے تھے یاد رکھے جاتے تھے، عیسائیوں میں مقدس حواریوں کے خطوط کی خاص اہمیت ہے، اور وہ مجموعۂ انجیل کے ضروری جزء خیال کیے جاتے ہیں اور قبول کے ہاتھوں سے لیے اور ادب کی آنکھوں سے پڑھے جاتے ہیں۔"

سید سلیمان ندوی اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"لیکن جہاں تک میرا علم ہے خطوط کی نگہداشت اور یاد داشت کو جو کثرت اور وسعت مسلمانوں کے دور میں ہوئی وہ اس سے پہلے نہ تھی، مسلمانوں نے پہلے خود رسول مقبولؐ کے خطوط کو محفوظ رکھا، روایتوں میں ان کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ بہت عالموں نے ان کو الگ کرکے ان کی کتابیں بنائی ہیں، دوسری صدی میں امام مالکؒ کا خط ہارون رشید کے نام اور امام لیثؒ کا خط امام مالک کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں، تیسری اور چوتھی صدی ہجری سے دیلمیوں، سامانیوں، غزنویوں اور سلجوقیوں کی حکومتوں میں اہل قلم ادیبوں کو اپنے خطوط اور مراسلات کے جمع کرنے کا خیال ہوا، اس خیال کی تحریک دو وجہوں سے ہوئی، ایک تو یہ کہ چونکہ ان عجمی بادشاہوں کی زبان فارسی اور ان کی حکومت کی زبان عربی تھی، اس لیے ان بادشاہوں کو ایسے محکمۂ اشاعت کی

---

(۱) ، شبلی مکاتیب کی روشنی میں، سنہ اشاعت ۱۹۶۷ئ، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ص ۲

ضرورت ہوئی جہاں ایسے اہل قلم موجود ہوں جو فارسی وعربی دونوں زبانوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں، اس ضرورت نے مانگ پیدا کی اور مانگ نے شی مطلوبہ کو پیدا کرنا شروع کیا، اس سے انشاء کا ایک فن پیدا ہوا، اور منشی پیدا ہوئے جو بڑی محنت اور جانکاہی سے شاہی فرمان اور مراسلے تیار کرتے تھے اور چونکہ ان کو وہ بڑی محنت سے تیار کرتے تھے اس لیے وہ جانتے تھے کہ ان کے اس خونِ جگر کا کوئی قطرہ ضائع نہ ہونے پائے، اس سے دوسری وجہ بھی پیدا ہوئی یعنی یہ کہ چونکہ انشاء کا ایک خاص فن پیدا ہو گیا تھا اس لیے اس کے سیکھنے اور سکھانے کے لیے لائق منشیوں کی تحریروں کی ایک ایک سطر، اس کی قدر جاننے اور پہنچانے والے جمع کرنے لگے۔"(۱)

خلفاء راشدین نے بھی اس روایت کو قائم رکھا، حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں باقاعدہ "دار الانشاء" قائم کیے گئے، حضرت عمرؓ نے حضرت زید بن ثابت اور عبد اللہ بن ابی بن خلف کو کاتب مقرر کیا تھا، ہر صوبے میں ایک ایک دار الانشاء تھا جو مدینہ منورہ میں واقع مرکزی دارالانشاء سے منسلک تھا، حضرت ابو بکرؓ کے کاتب عثمان بن عفان اور حضرت زید بن ثابتؓ تھے، جب کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں مروان بن حکم کو اس کام کے لیے مامور کیا گیا تھا، حضرت علیؓ نے عبد بن امی رافع اور حضرت سید بن بحزان الہمدانی کو اس اہم کام کی ذمہ داری سپرد کی تھی، خلفاء راشدین کے بعد بنو امیہ اور بنی عباس کے دور میں "دیوان الانشاء" مکتوب نگاری کے فرائض انجام دیتا تھا، خلیفہ مامون الرشید نے فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت میں خاصی دلچسپی لی، بعد ازاں سامانیوں، غزنیوں اور سلجوقیوں اور تمام عجمی بادشاہوں نے اپنے خط وکتابت کی زبان فارسی رکھی، یہی سبب ہے کہ مخطوطات اور فرامین کی زبان فارسی ہے۔

کوٹلیہ کی کتاب 'ارتھ شاستر' کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ چندر گپت موریہ کے عہد میں ڈاک کا بڑا عمدہ نظام تھا، اسلامی تہذیب وتمدن نے مکتوبات کو شائستگی اور اعلیٰ زندگی کے زاویے سے دیکھا

---

(۱) مکاتیب مہدی افادی ترتیب مہدی بیگم، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۲۰۱۰ء، ص ۴، ۵

تھا، خطوط و مکاتیب کے مخطوطات اہم کتب خانوں میں موجود ہیں۔ ابو الفضل فارسی کے جید عالم اور یکتائے روزگار انشاء پرداز تھے اور دربارِ اکبری میں ان کا شمار نورتنوں میں ہوتا تھا، یہ واقعہ مشہور ہے کہ اکبر کی طرف سے عباس کو تحریر کیے گئے مکاتیب کو پڑھ کر عباس نے برجستہ کہا تھا کہ: ”اکبر کے کارنامے تو نہیں دیکھے البتہ ابو الفضل کے قلم کی تحریر ضرور دیکھ لی“۔

واقعہ یہ ہے کہ ابو الفضل نے مکتوب نگاری کو ایک نئے ذائقے اور اچھوتے انداز سے متعارف کرایا، انھوں نے فارسی کے دقیق اور مشکل جملوں کے علاوہ آداب والقاب میں بھی طوالت سے کام لیا ہے تاہم ان کے مکاتیب ادب عالیہ میں شمار کیے جاتے ہیں، اورنگ زیب کے عہد میں مکتوب نگاری میں ابو الفضل کی مشکل پسندی اور القاب وآداب کی بے جا طوالت میں تبدیلی آئی، اورنگ زیب خود ایک صاحب قلم اور بلند انشاء پرداز تھے، انھوں نے سادہ اور شستہ عبارت لکھنے کی طرح ڈالی، ”واقعات عالمگیری“ اپنے خوشگوار اور سادہ اسلوب کے سبب مکتوباتی ادب میں لا فانی مقام رکھتے ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی:

> ”ادیبوں میں صابی صاحب اور عماد کاتب کے زمانے سے لے کر ”مثل السائر“ کے مصنف ابن عبد الکریم تک بیسیوں اہل انشاء ہیں جن کے خطوط اور مراسلے ادب کے خزانوں کے بیش قیمت موتی ہیں، ہندوستان کے شاہی منشیوں میں علامہ ابو الفضل کے خطوط ومنشآت سے پہلے کی کوئی چیز ہمارے ہاتھ میں نہیں، اس کے بعد تو شاید ہی کوئی فارسی کا انشاء پرداز غالب تک ایسا گزرا ہو جس نے اپنی عمر کی محنت کی یہ کمائی ترکہ میں چھوڑی ہو، چنانچہ انشآت، منشآت اور رقعات کے طرح طرح کے گلدستوں سے فارسی کی بزم ادب رشکِ گلستاں ہے، اور عالمگیر کے رقعات اس چمن کے سدابہار پھول۔“(۱)

بعض صوفیائے کرام کے مکتوبات پر مشتمل انشائیے مثلاً شیخ محمد جعفر کی ”انشائے عجیب“ خواجہ

(۱) مکاتیب مہدی افادی، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، سنہ اشاعت دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ء، ص ۵

غلام غوث ومظہر جان جاناں وغیرہ کی کاوشیں اس روایت کے فروغ میں قابل ذکر ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی:

"علماء اور صوفیوں میں امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ کے مکتوبات سے پہلے کی کوئی چیز ہمارے سامنے نہیں، صوفیانہ مکتوبات کے سلسلہ میں بھی ہندوستان کا نمبر سب ملکوں سے آگے ہے، دنیا میں جب تک تصوف کی دھاریں بہتی رہیں گی مکتوبات شیخ شرف الدین منیریؒ اور مکتوبات مجدد الف ثانیؒ کے کوثر وسلسبیل روحانی پیاسوں کی پیاس کو بجھاتے رہیں گے"۔(۱)

انگریزی ادب میں پندرہویں صدی سے مکتوب نگاری کی روایت ملتی ہے لیکن اس عہد کا کوئی مکتوب یا خط دستیاب نہیں گویا وہ مکاتیب، مکتوب نگاروں کے ساتھ ہی دفن ہوگئے، البتہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں رقعات ملتے ہیں، نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی زمانے کے جو مکتوبات دستیاب ہیں ان پر ادب کے بجائے مذہبی رنگ چڑھے ہوئے ہیں، سترہویں صدی میں پرانے اطالوی مکاتیب کے ترجمے ہوئے لیکن ان میں کوئی تخلیقی یا ادبی حسن نہیں ہے، جیمس ہاؤل جیسا مکتوب نگار اسی زمانے میں پیدا ہوا، جو انگلستان میں مکتوب نگاری کا باوا آدم کہلاتا ہے، علاوہ ازیں ہیر نگٹن (James Harrington) کا تعلق بھی اسی دور سے ہے جو اپنے بہترین اور شگفتہ طرز نگارش کی وجہ سے مشہور ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

"سترہویں صدی میں پرانے اطالوی مکاتیب کے ترجمے کیے گئے، لیکن ان سے کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوا، جیمز ہاول جسے انگلستان میں مکتوب نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، اسی دور کا آدمی ہے، لیکن اس کے خطوط میں بھی انھیں ادبی نفاستوں کا اہتمام ملتا ہے، البتہ جون ہیر نگٹن جو ملکہ کے درباریوں میں سے تھا ایک حد تک سادہ اور بے تکلف ہے اسی لیے اس کے خطوط میں بلاغت کی چاشنی کم اور زندگی کی چاشنی کافی ہے، اس طویل مایوسی کے بعد ہماری

---

(۱) مکاتیب مہدی افادی، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، سنہ اشاعت دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۰ئ، ص ۵،۶

ملاقات ایک شاعر سے ہوتی ہے جو ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، دوبار دیوانگی میں مبتلا رہ چکا ہے، تنہائی پسند ہے، اپنے باغ میں پھولوں کی دیکھ بھال، گنگنانا اور خط لکھنا اس کی زندگی کے مشاغل ہیں، خوبی یہ ہے کہ گھر کی چھوٹی چھوٹی باتیں اس کے قلم سے نکل کر گیت بن جاتی ہیں"۔(۱)

اٹھارہویں صدی میں ولیم کاپر (William Cowper) نے مکتوب نگاری کے فن کو معیار عطا کیا، وہ خوش لحن ہونے کے ساتھ شاعری کا اعلیٰ مذاق بھی رکھتا تھا، اسے تنہائی بے حد عزیز تھی اور باغوں میں پھولوں سے کھیلنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا، اس نے روز مرّہ کی معمولی باتوں میں جو مختلف رنگ بھر دیے ہیں، اس سے سحر انگیز کیفیت پیدا ہو گی، لہٰذا اس کے مکاتیب اپنے متحیر کن تیور کے لیے مشہور ہیں، مغربی ادب کے مکتوب نگاروں میں سسروؔ (Cicero) پہلا شخص ہے جس نے مکتوب نگاری کو مراسلہ سے مکالمہ بنا دیا، اسی صدی میں انگلستان کا مشہور شاعر گرے اپنے مکاتیب کے لیے بے حد مشہور ہے، اس کی بیشتر زندگی کیمبرج میں گذری، اس نے اپنے مخصوص دوستوں کو خطوط لکھے جن میں بڑی نفاست اور گہری انسانیت جھلکتی ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید الاسلام:

"اٹھارہویں صدی کے اس ادیب کا نام ولیم کوپرؔ ہے، اسی دور میں دو اور مکتوب نگار گزرے ہیں، ایک مشہور شاعر گرےؔ جس کی زندگی کا بیشتر حصہ کیمبرج یونیورسٹی کی منزلوں میں گزرا اور جس کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو، اس کی فطری جھجک تھی، یہ ان لوگوں میں سے تھا جن کو انسانوں سے محبت ہوتی ہے، لیکن جو اپنے خاص مذاق کے باعث، خواص کے دائرہ سے باہر نہیں جاسکتے اور عوام انھیں اجنبی معلوم ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو شاید اصولی طور پر انسانیت کے تصور سے محبت کرتے ہیں، لیکن افراد سے شیر و شکر ہونا ان کے لیے برزخ میں پہنچ جانے سے کم نہیں ہوتا، گرےؔ کے مکاتیب مخصوص دوستوں

---

(۱) تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، طبع اول اکتوبر ۱۹۵۷ء، ص ۱۶

> کے نام ہیں جن سے اس کی طبعی نفاست، ادبی ذوق اور گہری انسانیت چھلکی پڑتی ہے ان دو شاعروں کے علاوہ جن کی شہرت اس وقت تک قائم رہے گی جب تک دار العوام کا دستور باقی ہے۔(۱)

رومانی دور کے کامیاب مکتوب نگاروں میں چارلس لیمبؔ(Charles Lamb) اپنے بہترین مکاتیب اور نادر اسلوب کے لیے جانے جاتے ہیں، ان کے خطوں میں شہری زندگی کو تنہائی کے مزے اور محبت کی کہانیاں قاری پر اَن مِٹ نقوش چھوڑتے ہیں، اسی عہد میں بعض خواتین کے اہم مکاتیب ملتے ہیں جو اپنے سحر انگیز اسالیب اور خوشنما عبارت سے پہچانے جاتے ہیں ان میں کارلائل(Carluile) اور مادام ڈی سیون کے نام خاص ہیں، اس کے بعد جن شاعروں، ادیبوں اور نقادوں نے انگریزی مکتوب نگاری کو استحکام عطا کیا ان میں کیٹس(Keats) بائرنؔ(Byron) اور شیلی(Shelly) وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں کیٹس ایک جواں مرگ مکتوب نگار ہے جس کے یہاں شخصی تجربے اور احساس کی شدت ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک پر اسرار کیفیت پیدا کرتے ہیں۔بقول خورشید الاسلام:

> ”چارلس لیمب کے بعد کیٹسؔ، شیلی اور بائرن کے خطوط ہیں۔ سیاست دانوں، نقادوں اور مذہبی پیشواؤں کے خطوط ہیں، لیکن جو نظر اور ندرت کیٹسؔ کے خطوط میں ہے وہ ان لوگوں کے یہاں کم یاب ہے۔ اپنی محبوبہ کو جو مکاتب اس نے لکھے ہیں وہ پگھلتی ہوئی برف سے زیادہ حسین ہیں، یہ صرف تشبیہ نہیں ہے اس لیے کہ کیٹس ان خطوط میں خود برف کی طرح پگھلتا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی زندگی عرفی کا تغزل تھی اور وہ وقت سے پہلے سرشار ہو کر عرفیؔ کی طرح جوان مر گیا۔“ (۲)

شیلی اپنے مخصوص لب ولہجہ اور پیکر تراشی و منظر نگاری کے لیے بھی پہچانا جاتا ہے، اس کے

---

(۱) تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سنہ اشاعت طبع اول ۱۹۵۷ء، ص ۱۶

(۲) تنقیدیں، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سنہ اشاعت طبع اول ۱۹۵۷ء، ص ۱۷، ۱۸

مکاتیب میں حقیقی زندگی اور فطرت کی رنگارنگی بدرجہ اتم موجود ہے، برونس انگلستان کا ایسا مکتوب نگار ہے جس نے شعوری طور پر اس میدان میں نئے تجربے کیے، اس نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد کے نام خطوط لکھے، اس کے یہاں کوئی تخصیص وامتیاز نہیں ہے، وہ بنی نوع انسان کی اہمیت کا قائل ہے، اس لیے تاجر، عالم، پیشہ ور ڈاکٹر، وکیل کے علاوہ مزدور اور محنت کش، سبھی مکتوب الیہ ہیں، خطوط کے آغاز وارتقاء میں انسان کے وجود میں آنے سے لے کر فنائے دنیا تک ایک نیا باب ہے۔

اردو میں مکتوب نگاری کی روایتِ ”آغاز وارتقاء“

اردو ادب میں مکتوب نگاری کے باقاعدہ آغاز وارتقاء کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو غالب کا نام سرِفہرست آتا ہے، لیکن اردو میں مکتوب نگاری فارسی کی رہین منت ہے، اور دیگر اصناف ادب کی طرح اردو میں مکتوب نگاری کے اولین نمونے بھی دکن ہی میں ملتے ہیں، لیکن قطعی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ پہلا خط کب اور کس نے تحریر کیا تھا، ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی کے غیر مطبوعہ مقالے ”اردو مکتوب نگاری“ کے حوالے سے پروفیسر عنوان چشتی نے لکھا ہے کہ اردو کا پہلا خط ۶/ دسمبر ۱۸۲۲ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ”اردو میں مکتوباتی ادب کی عمر تقریباً ڈیڑھ سو برس ہے، لیکن اس طویل مدت میں مشاہیر کے مکتوبات کے جتنے مجموعے شائع ہوئے ہیں وہ اس مدت کو دیکھتے ہوئے بہت کم ہیں، اردو کا پہلا دستیاب شدہ خط ۶/ دسمبر ۱۸۲۲ء کا ہے، جس کے کاتب، والا جاہ بہادر نواب کرناٹک کے بیٹے نواب حسام الملک بہادر ہیں، انھوں نے یہ خط اپنی بڑی بھابھی نواب بیگم صاحبہ کو لکھا تھا۔“

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کا ایک متن یہاں درج کر دیا جائے:

> ”اگرچہ میرے تئیں عادت ہے کہ ہر ایک نصیحت کی بات جو اپنے باپ سے سنتا ہوں ہر ایک بھانجے بھتیجے اور بچے جو میرے ساتھ نزدیک کی قرابت رکھتے ہیں ہر ایک موقع پر ان سے ظاہر کرنا۔ چنانچہ تم کو بھی یاد ہوگا کہ ایک روز

کوئی سال گرہ کی رسم میں نواب عظیم الدولہ بہادر مرحوم ومغفور میرے تئیں
اپنے ہمراہ زنانے میں لے آئے، بعد ادائے رسم کے نواب اعظم جاہ بہادر تسلیم
کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر تسلیم کرنے لگے"۔(۱)

اب تک کا دریافت شدہ اردو کا خط کاتب والا جاہ بہادر کا ۶/ دسمبر ۱۸۲۲ء کا ہے لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے بہت پہلے بھی اردو میں مکتوب نگاری کا رجحان عام تھا، اردو کے قدیم ترین خطوط نظم کی ہیئت میں ملتے ہیں، شیر محمد خاں ایمانؔ متوفیٰ ۱۲۱۱ھ م ۱۸۰۶ء کے ایک "نامۂ منظوم" سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۱۸۰۶ء سے قبل بھی اردو نظم ونثر میں مکتوب نگاری کی روایت رہی ہے، ایمان کے منظوم خط کے چند اشعار دیکھیے:

(۱)

موزوں تمہارا پہنچا ہے نامہ
مژگانِ آہو جس کا تھا نامہ

(۲)

مضمون تازہ اس میں تھے مرقوم
وقت سے معنی ہوتے تھے معلوم

(۳)

تحسیں تو سو بار نکلے زباں سے
خوش رکھے اللہ امن واماں سے

(۱) مکاتیب احسن جلد اول، مرتبین: ڈاکٹر عنوان چشتی صغیر احسنی جلال آبادی، سنہ اشاعت ستمبر ۱۹۷۷ء، اردو سماج، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔ ص ۴۱،۴۱،۴۲۔

(۴)

نفی نثر میں یہ ترقیم نادر
ٹک ایک شکوہ ہوتا تھا صادر

(۵)

یعنی کہ اپنی خط وکتابت
خاطر پہ لائے سایۂ کدورت

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ایمانؔ نے اپنا منظوم خط کسی نثری خط کے جواب میں اپنی وفات ۱۸۰۶ء سے پہلے تحریر کیا تھا، جہاں تک اردو میں منظوم خطوط کا تعلق ہے، سب سے قدیم ترین دریافت شدہ خطوط ۱۱۷۵ھ م ۱۷۶۱ء سے قبل دو آصف جاہی منصب داروں مرزا یار علی و میر ابراہیم کے دریافت ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ لکھتے ہیں:

"عہد نواب ناصر جنگ شہید (۱۱۶۴ھ) کی لکھی ہوئی بیاض میں اس دور کے دو اصحاب کے اردو منظوم خطوط موجود ہیں جو اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں خاص اہمیت اور قدامت کے لحاظ سے اولیت کے حامل ہیں۔"(۱)

منظوم خطوط جو مرزا یار علی بیگ نے میر ابراہیم خاں جیو کے نام لکھے ان کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

"مرزا یار علی بیگ کا خط میر ابراہیم خاں جیو کے نام"

جا صبا کر بندگی میری ہر اک عنوان سے
صاحب مشفق مہرباں خاں والا شان سے
ہے تمہارے مخلصوں میں کمتریں یار علی
یاد سامی ہے سوا جس کوں تمہاری ازدلی

---
(۱) تذکرۂ مخطوطات جلد پنجم، سنہ اشاعت جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ص ۲۸۹

دم بدم ہر لحظہ لمحہ تمہاری یاد ہے
یہ دل محزوں تمہاری یاد سیں نت شاد ہے

نام غیر شمام لکھ کے بھجوائے ابھی
کمتریں کو فضل سیتے یاد فرمائے ابھی

اب تو خط فی الحال تم کوں لکھ کے بھجواتا ہوں میں
بعد اس خط کے جو خط ہو آپ ہی آتا ہوں میں(۱)

”جواب ابراہیم خاں جیو بنام مرزا یار علی بیگ“

رکھو ایزد تمہیں امن واماں میں
کرم اپنے سیتے دونوں جہاں میں

جو مرزا یار علی تم کوں اسم ہے
یقیں ہے تم پہ سرداری ختم ہے

کہوں کیا وصف میں تمنا کے اشعار
کیا حق نے ازل سے تم کو سردار

سدا ہو تم سپہ کی پرورش میں
اجر تم پاؤگے اس کا عرش میں

---

(۱) تذکرۂ مخطوطات جلد پنجم، سنہ اشاعت جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ص ۲۹۰۔

لکھوں کیا کیفیت اپنی دوبارہ
کہتے عاقل کو تکفیہ الاشارہ(۱)

خطوط نویسی غالب سے پہلے

عام طور پر مرزا غالب کو اردو میں مکتوب نگاری کا موجد سمجھا جاتا ہے، لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ غالب سے پہلے بھی اردو میں مکتوب نگاری کی روایت موجود تھی، یہ اور بات ہے کہ ان مکاتیب میں خطوط غالب کی سی سادگی اور بے تکلفی نہیں تھی، غالب سے پہلے اردو میں مکتوب نگاری کے سلسلے میں دو نام اہمیت کے حامل ہیں، ایک رجب علی بیگ سرور کا اور دوسرا غلام غوث بے خبر کا، اس کے علاوہ واجد علی شاہ اور بیگمات اودھ کے خطوط کا بھی نام آتا ہے، اس کے متعلق ڈاکٹر عنوان چشتی صغیر احسنی جلال آبادی لکھتے ہیں:

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ شاعری کی طرح مکتوب نگاری کے اولین نقوش بھی سر زمین دکن سے دستیاب ہوئے، لیکن اس فن کو شمالی ہند میں دوجہ اعتبار واستناد ملا، چنانچہ غالب اور ان کے معاصرین نے اردو مکتوب نگاری کو جو آبرو بخشی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اب تک غالب کا پہلا خط ۱۸۴۶ء کا دستیاب ہوا ہے، شمالی ہند میں رجب علی بیگ سرور (۱۷۸۷ء۔ ۱۸۶۹ء) غلام غوث بے خبر ۱۸۲۴ء۔ ۱۹۰۵ء) کے خطوط اور بعض نثری تحریریں سامنے آئیں، غلام غوث بے خبر کے خطوط اور نثری تحریروں کا مجموعہ "فغانِ بے خبر" ۱۸۹۱ء اور انشائیے بے خبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا، چونکہ ان کی بیشتر تحریروں پر سنہ و تاریخ درج نہیں ہے، صرف ایک خط پر ۱۲/ رمضان ۱۲۷۲ھ درج ہے، اس لیے ان کی اولیت مشکوک ہے، ۱۸۸۶ء میں رجب علی بیگ سرورؔ کے خطوط اور عرضیوں کا مجموعہ

---

(۱) تذکرۂ مخطوطات جلد پنجم، سنہ اشاعت جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ص ۲۹۱۔

شائع ہوا، جس کا نام "انشائے سرور" ہے۔"(۱)

اردو میں مکتوب نگاری کا ارتقاء، مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا غالب اردو کے جتنے اہم شاعر تھے، اتنے ہی اہم نثر نگار بھی تھے، اگر انھوں نے شاعری نہ کی ہوتی اور صرف اردو خطوط ہی لکھے ہوتے تب بھی تاریخ ادب اردو میں ان کا نام زندہ رہتا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام لکھتے ہیں:

"اس روشنی میں ہمیں اپنے سرمایہ پر نظر ڈالنی ہے، ہماری زبان میں مکتوب نگاری کی ابتدا غالب سے ہوتی ہے۔" (۲)

مرزا غالب کے متعلق ڈاکٹر عنوان چشتی اور صغیر احسن جلال آبادی لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے بعد مکتوبات کا جو ذخیرہ ملتا ہے اس پر "غالب" کے اسلوب کا اثر ہے، غالب کی نثر میں رنگینی و شادابی کے ساتھ سادگی و پرکاری ملتی ہے۔" (۳)

غالب کی خطوط نگاری کے آغاز و محرکات کے تعلق سے رشیدہ خاتون لکھتی ہیں:

"مرزا غالب کا پایہ شاعری کی طرح نثر نگاری میں بھی بہت بلند تھا، اردو نثر کو ان کی سب سے بڑی دین مکاتیب ہیں۔" (۴)

ڈاکٹر سید عبد اللہ غالب کی مکتوب نگاری کے متعلق اپنی کتاب میر امن سے عبد الحق تک میں رقم طراز ہیں:

"مرزا غالب کے خطوط اردو نگاری کی تاریخ میں منفرد امتیازات کے

---

(۱) مکاتیب احسن جلد اول، سنہ اشاعت ستمبر ۱۹۷۷ء، اردو سماج، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵، ص ۴۳

(۲) تنقیدیں، سنہ اشاعت اکتوبر ۱۹۵۷ء، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ص ۱۸

(۳) مکاتیب احسن جلد اول، سنہ اشاعت ۱۹۷۷ء، اردو سماج جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ ص ۴۵

(۴) اردو خطوط نگاری کا ارتقائ، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد، ص ۱۰۶

حامل ہیں، ان میں مرزا کی الگ طبیعت بلکہ نجی اور پرائیویٹ زندگی کے انعکاسات
بھی شعاع ریزی کرتے ہیں"۔(۱)

غالب کا شمار جدید اردو نثر کے معماروں میں ہوتا ہے، ابتدائی زمانے میں وہ اپنے دوست احباب کو فارسی میں خط لکھتے تھے، لیکن بعد کو جب بہادر شاہ ظفر کے ایما پر مغلیہ خاندان کی تاریخ (مہر نیم روز) فارسی زبان میں لکھنے کا کام ان کو تفویض ہوا تو ضعیفی اور عدیم الفرصتی کی وجہ سے انھوں نے اپنے احباب کو فارسی کے بجائے اردو میں خط لکھنے شروع کیے، بقول حالی:

"وہ (غالب) فارسی تحریریں بڑی محنت اور کاوش سے لکھا کرتے تھے،
اب اس کاوش کے ساتھ خطوط فارسی پر محنت کرنا دشوار تھا، اس لیے اردو میں خط
وکتابت شروع کردی"۔(۲)

مکتوبات غالب اردو مکتوب نگاری کی روایت میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، جو ان کے فنکارانہ اجتہاد اور فکری شعور کی بین مثال ہیں، انھوں نے اپنے قریبی پیشرو اور قدیم طرز پر ضرب کاری لگائی اور مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا، ان کے مکاتیب میں سماجی اور سیاسی شعور کے علاوہ زبان وادب کی باریکیوں کا عرفان ملتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ مکتوباتِ غالب ادبی، سماجی اور سیاسی تاریخ کا ایک ایسا مرقع ہیں کہ ان کے وسیلے سے غالب کے عہد کی سچی تصویر دیکھی جاسکتی ہے، اس عہد میں مکتوب نگاری کی روایت کو جن اکابرین نے تنوع عطا کیا ان میں سرسید، محسن الملک، وقار الملک، حالی، شبلی، مولانا آزاد، اکبر الہ آبادی، مہدی افادی، محمد علی جوہر، رشید احمد صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ غالب کے خطوط کے متعدد مجموعے یہ ہیں:

(۱) "مہر غالب" مرتبہ عبدالغفور سرور (۱۸۶۲ء) (۲) "انتخاب غالب" (۱۸۶۶ء) (۳) "عود ہندی" مرتبہ منشی ممتاز علی خاں (۱۸۶۸ء) (۴) "اردوئے معلی" مرتبہ حکیم غلام رضا خاں (۱۸۶۹ء) (۵) "مکاتیب غالب" مرتبہ امتیاز علی عرشی (۱۹۳۷ء) (۶) "ادبی خطوط غالب" مرتبہ

---

(۱) اردو خطوط نگاری کا ارتقائی، سنہ اشاعت نومبر ۱۹۸۹ء، مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد ص ۴۳۔
(۲) یادگارِ غالب، ص ۱۹۷۔

مرزا محمد عسکری (۱۹۳۹ء) "خطوط غالب" مرتبہ مہیش پرشاد ۱۹۶۱ ء) (۸) "نادرات غالب" مرتبہ آفاق حسن آفاق (۱۹۶۹ء) (۹) "خطوط غالب" مرتبہ غلام رسول مہر (۱۹۵۱ء) (۱۰) "غالب کے نادر تحریریں" مرتبہ خلیق انجم (۱۹۶۱ء) (۱۱) "غالب کے خطوط" مرتبہ خلیق انجم (۱۹۸۴ء) کے علاوہ ان کے اور بھی خطوط مختلف رسالوں اور کتابوں میں شائع ہوئے ہیں، ان مجموعوں میں سب سے زیادہ شہرت "عود ہندی" اور "اردوئے معلی" کو حاصل ہوئی ہے اور ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، اسی لیے غالب کی مکتوب نگاری اردو میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، غالب کے علاوہ اردو مکتوب نگاری میں کچھ اور بھی مکتوب نگار ہیں جنھوں نے مکتوب نگاری کے فن کو فروغ دیا اور مکتوباتی ادب میں اضافہ کیا ان میں واجد علی شاہ، سر سید احمد خاں، امیر مینائی، مرزا داغ، نواب محسن الملک، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی، مولانا حالی، علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد، احسن مارہروی، خواجہ حسن نظامی، پریم چند، مہدی افادی، مولوی عبد الحق، سید سلیمان ندوی، نیاز فتح پوری، مولانا ابو الکلام آزاد، شمس الرحمن فاروقی، مالک رام، حنفی نقوی اور شمس بدایونی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

2nd Chapter

باب دوم

مکتوباتِ شبلی کے موضوعات کا جائزہ

علامہ شبلی نعمانی کا شمار اردو کے ممتاز مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے غالب کے بعد جدت ولطافت، تازگی اور بے ساختگی جو شبلی کے خطوط میں ہے وہ دوسروں کے یہاں نہیں ملتی، شبلی کی شخصیت بڑی تہ دار تھی، وہ بلند پایہ عالم دین، ادیب، شاعر، محقق اور مورخ تھے۔شبلی نے تمام عمر قوم وملت اور زبان وادب کی خدمت کی ہے، وہ ایک وضع دار انسان تھے اور اصولی زندگی پر قائم رہے، کسی بڑی شخصیت کی زندگی کے حالات، اس کی سیرت اور سوانح عمری لکھنا ویسے بھی کوئی آسان کام نہیں لیکن کسی شخص کو اس کی تحریروں اور خطوں کی روشنی میں پیش کرنا اس سے زیادہ مشکل امر ہے بالخصوص جب کہ اردو ادب میں صرف چند ایک ہی تجربات اس سلسلے میں کیے گئے ہوں۔

ادب نہ صرف حالات اور ماحول کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس کا مطالعہ ادیب کی ذہنی کیفیات، اس کے احساسات، اس کی طبیعت کے انداز اور اخلاق و کردار کو بھی ایک حد تک بے نقاب کرتا ہے بشرطیکہ ہم اس کی تحریروں میں اس کی فطرت اور شخصی تاثرات کا عکس تلاش کریں، زیر نظر تحریر میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ شبلی کے وہ موضوعات جو ان کے خطوط میں بیان ہوئے ہیں ان ہی کے مکاتیب کی روشنی میں پیش کیا جائے، شبلی کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان تمام مسائل پر نظر ڈالی ہے جو ہم سے کوسوں دور ہے یعنی مکاتیب کی روشنی میں شبلی کے موضوعات کو ان مکتوبات کے ذریعہ کرید کرید کر دیکھنا ہوگا اور ان کی تحریروں کے پردوں کو ہٹاکر شبلی کے موضوعات کو بے نقاب کرنا ہوگا، سہولت کے پیشِ نظر شبلی کے موضوعات کو مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم

کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو یہ ہیں:

تعلیم کی فکر مندی

مولانا شبلی کی زندگی کا زیادہ تر وقت تعلیمی سرگرمیوں میں صرف ہواتھا، اعظم گڑھ سے لے کر علی گڑھ پھر بیرون ملک کا سفر، یہ تمام کوششیں صرف اور صرف تعلیم کے شغف کی وجہ سے تھیں، ان کا اندازہ شبلی کی ان تحریروں سے ہوتا ہے جوان کے خطوط اور مقالات کا حصہ ہیں۔بقول سید صباح الدین عبد الرحمن:

> ''تعلیم بھی ان کا خاص موضوع رہا، وہ وقتاً فوقتاً اس موضوع پر جو کچھ نہ کچھ لکھتے رہے، اس کے عناوین درج ذیل ہیں:
> (۱)مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (۲) مدرسہ اور دار العلوم (۳) قدیم تعلیم (۴) ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ (۵) درس نظامیہ (۶) ندوہ اور نصاب تعلیم (۷) فن نحو کی مروجہ کتابیں (۸) تعلیم قدیم وجدید (۹) مشرقی کانفرنس (۱۰) ریاست حیدر آباد کی مشرقی یونیورسٹی (۱۱) احیاء علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل۔'' (۱)

شبلی مکاتیب میں ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی ہمارے سامنے آتے ہیں، مولانا نصاب کی اصلاح کی خاطر اپنے خطوط میں اکثر مضطرب وبے چین نظر آتے ہیں، پرانا نصاب مولانا شبلی کے نزدیک قابل اصلاح تھا، نصاب کی متعدد کتابوں کو خارج کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کو لکھتے ہیں :

> ''لیکن خدا کے لیے پھر پنچایت پر معاملہ نہ اٹھا رکھیے گا، کوئی کتاب نئ قایم کی جائے خواہ نہ کی جائے لیکن کافیہ، شافیہ، شرح جامی، میر زاہد، ملا حسن، ملا جلال، قاضی یہ تو قطعاً نکلوا دیجیے، خدا کی قسم میں کانپ اٹھتا ہوں کہ ندوہ کے تمام وعدوں کا خدا کے یہاں ہم اور آپ

---

(۱)مولانا شبلی پر ایک نظر، مطبع معارف دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، طبع اول سنہ اشاعت ۱۹۸۵ء، ص ۸۰

کیاجواب دیں گے۔"(۱)

ایک دوسری جگہ تعلیم کے نصاب کے متعلق علامہ شبلی نعمانی مولانا حمید الدین صاحب بی۔اے کو لکھتے ہیں:

"مسٹر ہارویز نے کتاب کی سفارش کی جو منظور نہیں ہوئی، رجسٹرار کا خط میرے پاس آیا کہ یونیورسٹی نے آپ کی کتاب کسی امتحان میں نہیں رکھی، لیکن بطور ایک نہایت ممتاز تصنیف کے کالجوں اور اسکولوں کے نصاب کے کتب خانوں کے لیے سفارش کی، کیا ہارویز صاحب نصاب میں رکھنا چاہتے تھے؟ ایک اردو تصنیف فارسی نصاب میں کیوں کر داخل ہو سکتی ہے، پنجاب یونیورسٹی نے اتنا کیا کہ بی۔اے اور ایم۔اے کے طلبہ کو مطالعہ کی ہدایت کی۔"(۲)

شبلی دین ودنیا دونوں کی تعلیم کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے نزدیک دونوں میں تفریق مناسب نہیں۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بناکر اسی کو دین ودنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایاجائے، یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلیٰ تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو، تم اپنی رائے لکھو، ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہیے، ہم سب کو وہیں بود وباش کرنی چاہیے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں جمع ہونا چاہیے اگر تم بہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں۔"(۳)

علامہ شبلی کی تعلیمی سرگرمیوں کے متعلق ڈاکٹر الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، یوپی، سنہ اشاعت طبع جدید ۲۰۱۰ءص ۱۴۹، ۱۵۰۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص۳۰

(۳) مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۴۱

"مولانا شبلی کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تعلم میں گذرا، علی گڑھ سے پہلے بھی اعظم گڑھ میں انفرادی طور پر وہ درس و تدریس کا فریضہ انجام دے چکے تھے، پھر علی گڑھ کے ۱۶/ سال کے فرائض تدریس اور آخر میں ندوہ کے معتمد تعلیم اور درس و تدریس اور نصاب تعلیم وغیرہ کی تمام کیفیات ان خطوط میں موجود ہیں، تعلیم کے سلسلہ میں انھوں نے جو کوششیں کی، نیشنل اسکول کا قیام، دار العلوم کا قیام، نصاب تعلیم، قدیم وجدید تعلیم کا نظریہ، قدیم نصاب کی کمیاں وخامیاں، قدیم صالح اور جدید نافع کے فوائد وغیرہ کی تفصیلات، تعلیمی مباحث وغیرہ ان کے خطوط میں موجود ہیں بلکہ ان خطوط کے مطالعہ کے بغیر شبلی کے نظریہ تعلیم کا صحیح ادراک ممکن نہیں۔"(۱)

علامہ شبلی کی تعلیمی خدمات کے متعلق سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ایک پورا باب "بعض دوسرے تعلیمی خدمات" کے عنوان سے قائم کیا ہے، جس کی سرخیاں یہ ہیں:

(۱)ریاست حیدر آباد کی تعلیمی خود مختاری (۱۹۰۸ء ۔۱۹۱۴ء) (۲) مشرقی بنگال وآسام میں اصلاح مدارس کی تجویز (۱۹۱۰ء) (۳) مشرقی کمیٹی شملہ (۱۹۱۱ء) (۴) ڈھاکہ یونیورسٹی (جولائی ۱۹۱۲ء) (۵) ورینکلر اسکیم الہ آباد (۱۹۱۲ء) (۶) اردو کو دیو ناگری ہونے سے بچانا، مذہبی تعلیم کی کمیٹی میں شرکت (۷) صیغۂ تصحیح اغلاط تاریخی (۱۹۱۰ء ۔ ۱۹۱۲ء) (۸) عربی مدارس کی تنظیم کی تحریک (۱۹۱۲ء) (۹) مدینہ یونیورسٹی کی تجویز (۱۹۱۳ء) (۱۰) مسلم یونیورسٹی کی تجویز (۱۹۱۱ء) (۱۱) مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی (۱۹۱۴ء) (۱۲) ناگ پور یونیورسٹی میں مشورہ (۱۹۱۴ء)۔(۲)

مولانا شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات کے متعلق مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ لکھے ہیں:

"وہ قوم کی ترقی اور اصلاح کے لیے تعلیم کو بہت زیادہ ضروری

---

(۱) آثار شبلی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سنہ اشاعت طبع اول جنوری ۲۰۱۳ء) ص ۵۹۹،

(۲)حیات شبلی۔ مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ایڈیشن اکتوبر ۲۰۱۵ء ،ص ۲۱

اور مقدم چیز سمجھتے تھے، ان کے نزدیک یہی قوم کی رفعت وعظمت کا پہلا زینہ ہے، اسی سے اس کی ذہنی، دماغی اور اخلاقی تربیت ہوتی ہے اور اسی کی بدولت اس کو ایسے لائق اور قابل افراد ملتے ہیں جو اسے قعر مذلت سے نکال کر بام عروج پر پہنچا دیتے ہیں، شروع میں مسلمان اسی طاقت سے لیس تھے، اس لیے اپنی بے سرو سامانی، تعداد کی قلت اور اسباب ووسائل سے محرومی کے باوجود انھوں نے دنیا کو زیر نگیں بنا لیا تھا، وہ جہاں جاتے علم وہنر کی ایک نئی دنیا آباد کردیتے تھے، یورپ کی موجودہ علمی فتوحات اور سائنسی ایجادات انھیں کی رہین منت ہیں، مولانا کو علم وتعلیم سے مسلمانوں کی بے رغبتی اور بد شوقی دیکھ کر بڑا ملال ہوتا تھا، اپنے غیر ملکی سفر میں وہ بیروت بھی تشریف لے گئے تھے۔"(۱)

علامہ شبلی نعمانی ایسی تعلیم کے خواہاں اور اس کے لیے کوشاں تھے جو قدیم وجدید دونوں کی جامع ہو، ان کے نزدیک مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کے حل کی یہی ایک صورت تھی۔ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"یہ ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لیے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے نہ قدیم عربی مدرسوں کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جز مشرقی اور دوسرا مغربی ہے۔" (۲)

مولانا شبلی کے پیشِ نظر مختلف کام تھے، یہ انہی کا جگر تھا کہ ایک ہی وقت میں کئی ایک کاموں کو جاری رکھیں، تمام تر موانع ومشکلات کے باوجود شبلی نے علمی اور تعلیمی مشاغل کو جاری رکھا، ایک خط میں اپنے دوست حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

"اعجاز خسروی کا ایک عجیب وغریب نسخہ ہاتھ آیا، امیر کی وفات کے دس برس بعد کا لکھا ہوا ہے، نہایت صحیح اور سرتاپا محشیٰ ہے اور

---

(۱) عظمتِ شبلی، جمع وترتیب، ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی، محمد معتصم اعظمی، سنہ طباعت ۲۰۱۷ء، ناشر اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن نئی دہلی، ص ۲۶۶

(۲)مقالاتِ شبلی (تعلیمی) جلد سوم، مولانا شبلی نعمانیؒ، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ایڈیشن ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۳

کمال یہ ہے کہ لفظی رعایت میں ایک لفظ کے کئی ٹکڑے میں بھی کوئی رعایت ہے تو اس قدر ٹکڑا سرخ لکھا ہے مثلاً باغ کی رعایت میں بو کا لفظ آگیا ہے تو بو کو سرخ لکھا ہے، تمام کتاب میں یہ التزام ہے، اس قدر دیدہ ریزی شاید خود مصنف نے کی ہو۔"(۱)

علامہ شبلی کے خطوط کی تعلیمی اور علمی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے استاذ محترم ڈاکٹر شباب الدین لکھتے ہیں:

"شبلی کے خطوط علمی وادبی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں، انھوں نے ہندوستان کے تمام مشہور کتب خانوں کو کھنگال ڈالا تھا، جب اس سے بھی پیاس نہ بجھی تو ترکی کا سفر کیا اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا، ان کے خطوط میں نایاب ونادر کتابوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ اکثر کے متعلق انھوں نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس لحاظ سے ان کے خطوط بڑے اہم ہیں، ان کے مطالعہ سے شائقین علم وادب کے ذوق کی محض تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ نئی نئی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔"(۲)

علامہ شبلی نعمانی کے تعلیمی افکار تابندہ حیات ہیں، اور محققین، مدبرین ، مقدمین اور متاخرین کے لیے مشعل راہ ہیں۔

قومی، سیاسی، جمہوری پسِ منظر مکاتیب کی روشنی میں

مکاتیب شبلی کے مطالعے سے جہاں شبلی کی زندگی کے مختلف پہلو ابھرتے ہیں، جہاں ان کے اخلاق اور کردار کی متعدد خوبیاں اجاگر ہوتی اور ایسی خصوصیات نمایاں طور پر

(۱)مکاتیب شبلی جلد اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۰۹ء، ص ۱۸۱

(۲)دار المصنّفین کی ادبی خدمات کا تعارف (۱۹۸۰ء تک)سنہ اشاعت ۲۰۰۸ء ، ناشر ڈاکٹر شباب الدین، ص ۱۵۱

سامنے آتی ہیں وہیں ان کا جوش اور ولولہ، مسلسل جد وجہد اور قومی وملی اور مذہبی کاموں کے کرنے کا جذبۂ صادق بھی سامنے آتا ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ان کی طبیعت کی جذباتیت اور زود حسی ان کا دامن نہیں چھوڑتی، خلافِ طبیعت اگر کوئی بات ہوتی ہے چاہے وہ معمولی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، ان کے ماتھے پر شکن آجاتی اور وہ برہم ہوجاتے ہیں لیکن خوبی یہ ہے کہ ایسی برہمی اکثر وقتی ثابت ہوتی ہے۔اس لیے کہ ان کے پیشِ نظر قومی خدمات تھیں، وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کا اثر ضرور قبول کرلیتے تھے، لیکن اپنے مقصد کو بھول جانا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

مولانا شبلی کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خود بھی کام کرتے تھے اور دوسروں کو بھی کام کرنے کی ترغیب دیتے تھے کہ وہ بھی ان کا ساتھ دیں اور قومی خدمات انجام دیں، اگر کوئی کسی وجہ سے ان کا ساتھ نہ دیتا تو اس سے ناراضگی بھی ظاہر کرتے تھے، وہ ایک خط میں مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں:

> ''یہاں مدت سے غلغلہ تھا کہ تم رخصت لے کر آتے ہو اور دروس الاولیہ پڑھاؤگے تمہارے بھی متعدد وعدے ہوچکے تھے، سب کو انتظار تھا بلکہ مستقل قیام کی توقع تھی،اب تم نے اپنے وعدے پر میری ضمانت واعتبار پر، طلبہ کی امید پر، قومی کام پر، ان سب باتوں پر بچوں کی طرح گھر کے قیام کو مقدم رکھا اور کہا کہ وہیں کوئی لڑکا چلے اور تم پڑھادو، افسوس صد افسوس۔
>
> خیر دنیا کا کوئی کام اٹکا نہیں رہتا، خدا مسبب الاسباب ہے، لیکن تم سے جو امیدیں تھیں ان کا خاتمہ ہوچکا، میرے بست سالہ حقوق کے مقابلہ میں تم ایک مہینہ نہ دے سکے، اس کا افسوس نہیں کہ کام رہ جائے بلکہ اس کا افسوس ہے کہ جن لوگوں کو عالی ظرف اور بلند ہمت سمجھتا تھا ان کا یہ حال ہے توتا بہ دیگراں چہ رسد گویا وعدہ کرنا باد فروش ہے۔اس خط کے جواب لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔(شبلی) (۱)

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی، سنہ اشاعت ۲۰۱۲ء، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ص ۲۰، ۲۱

اس خط کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا شبلی نے ایک مرتبہ اپنے ایک شاگرد اور عزیز مولوی حمید الدین سے یہ خواہش کی کہ وہ "ندوہ" آجائیں اور طالب علموں کو "دروس الاولیہ" پڑھا جائیں، (جس میں سائنس کے جدید مسائل بھی شامل تھے)، لیکن مولوی حمید الدین بعض وجوہات اور مجبوریوں کی بناء پر ایسا نہ کرسکے جو مولانا کی برہمی کا باعث ہوا، طبیعت کی جذباتیت کے سبب وہ جلد متاثر بھی ہوجاتے تھے اور یک لخت نا امید بھی، مولوی حمید الدین کا اس وقت کا نہ آنا مولانا کی ساری امیدوں کو ختم کردیتا ہے جو ان سے وابستہ تھیں، اس خط میں مولانا کی تحریر کا انداز کچھ ایسا ہے کہ مخاطب یا تو متاثر ہوگا یا وہ بھی ناراض ہوجائے گا یا پھر اپنے وعدہ کا کچھ پاس ہو تو وہ مجبور ہوجائے گا کہ ان کی خواہش کے مطابق عمل کرے، اس تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کو وقتی طور پر غصہ آتا تھا لیکن وہ ان باتوں کی وجہ سے نہ تو دوسروں سے بگاڑ کرتے اور نہ مقصد کو پسِ پشت ڈالتے تھے، اس خط کے بعد ہی دوسرے خط میں ان کا انداز بدل جاتا ہے، مولوی حمید الدین کو اس کام کی طرف پھر متوجہ کرتے ہیں لکھتے ہیں:

> "اب شاید بمبئی جاؤں، تم تیار رہو، دو تین مہینہ قیام کرکے صرف دروس الاولیہ پڑھادو، تمہارے رہنے کے لیے میرا کوٹھا نہایت مناسب اور حسب مزاج ہوگا، اگر تم ترک تعلق کروگے تو سدّ رمق کی بقدر کچھ بند وبست ہورہے گا۔" (۱)

علامہ شبلی چاہتے تھے کہ جو کام ناراضگی سے نہ بن سکا ہو وہ نرمی اور محبت سے بن جائے، وہ جذبات میں سخت الفاظ بھی لکھ جاتے تھے لیکن ایسا بس کچھ دیر کے لیے ہوتا، اس نوعیت کا ایک دوسرا خط اپنے ایک اور عزیز شاگرد سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں جس میں ان کو بعض بے پروائیوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں:

> "انسان اگر بے تعلق بسر کرنا چاہے تو وہ جس قسم کی چاہے زندگی بسر کرسکتا ہے لیکن تعلق کے ساتھ خاموشی، کاہلی اور بے پرواہی خلاف اصول ہے۔"(۲)

سرسید اور مولانا شبلی دو ایسے شخص ہیں جنھوں نے قوم وملت کے لیے اپنی تمام تر کاوشیں اور زر وزمین سب کچھ قربان کردیا لیکن اس کے باوجود بھی لوگوں نے ان پر

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، مرتبہ علامہ سید سلیمان ندوی، سنہ اشاعت ۲۰۱۲ء، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ص ۳۱
(۲) ایضاً جلد دوم ،ص ۵۶، ۵۷

تنقیدیں کیں، سرسید اور علامہ شبلی کے سیاسی نظریہ پر بھی سوال اٹھایا گیا، سیاسی مسلک اور سرسید احمد خاں سے اختلاف کے متعلق لکھتے ہیں:

"رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۶/ برس رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان سے مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں"۔(۱)

ایک دوسرے خط میں قوم کی حقیقت کے متعلق لکھتے ہیں:

"پولیٹکل معاملات میں جو طوائف الملوکی پیدا ہوگئی ہے سخت قابل نفرت ہے، وزیر حسن اور امیر علی کا کیا مقابلہ ہے؟ قوم حقیقت میں سرسید مرحوم کے وقت میں بھی اندھی تھی اور اب بھی ہے"۔(۲)

قوم میں نیک وبد کی تمیز کرتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ اگر انسان برائی اور نیکی میں فراق رکھتا ہے اور کبھی ان دونوں چیزوں کو خلط ملط نہیں کرتا تو وہ ہمیشہ سرخرو ہوتا ہے، اور اس کو پورا بھروسہ ہوتا ہے کہ وہ ہر فیصلہ اپنے دم پر کرسکتا ہے، اس تعلق سے علامہ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

"قوم میں جب نیک وبد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود بھروسہ ہوتاہے کہ وہ اخذ ماصفا کرلے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد اور رشک کے سوا اور کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بناتے ہیں"۔(۳)

مولاناسید سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"المعین اور دوسرے اور کاموں سے بے تعلق ہوکر یہ خاموشی زیب دیتی ہے ، سخت افسوس اور رنج پیدا ہوتا ہے کہ خدا قابل طبیعتوں میں ایک نہ ایک عیب ایسا پیدا کردیتا ہے کہ وہ دنیا میں کام نہیں کرسکتے، میں نے تم کو سخت تاکید کردی تھی کہ دفتر میں دیکھ کر مظفر پور کے وکیل کا نام لکھ دینا، تم نے خبر نہ لی، اب ویسا ہی خالی

---

(۱)معارف نومبر، ص ۳۹۴، ۱۹۲۳ء

(۲) مکاتیب شبلی جلد دوم ، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، یوپی، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۲۷۸

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۲۹۲

وکیل کا لفظ چھپ گیا، بھلا یہ کیا طریقہ ہے۔"(۱)

یہ خط طویل ہے پورے خط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک دفعہ سید سلیمان ندوی بغیر اطلاع کہیں چلے گئے حالانکہ ان کے ذمے رسالے کا کام تھا، مولانا شبلی نعمانی نے ان کو ایک خط لکھا "جواب ندارد" تو مولانا نے ان کو تنبیہاً یہ باتیں تحریر کیں کہ یہ اچھا طریقہ نہیں ہے کیوں کہ ہمیں اپنا خیال ہو یا نہ ہو لیکن عوام کا احساس ہو اگر رسالہ دیر سے شائع ہوا اور اگر اس میں کوئی غلطی رہی تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا، سوال تو ہمیں سے کیا جائے گا، اس لیے آگاہی ضروری ہے آئندہ دھیان دینا، شبلی اپنے ان شاگردوں اور شرکائے کار سے سخت ناراض ہوتے جو اپنے کاموں میں لاپرواہی کرتا اور جو اپنا مفوضہ کام ٹھیک سے انجام نہ دیتا، کیوں کہ مولانا شبلی نئی پود کو تربیت دینا چاہتے تھے تاکہ وہ مستقبل کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکے۔اس سلسلے میں ایک خط میں لکھتے ہیں:

"الندوہ کے پرچے دیکھے، بد خطی اور ناموزونی ایک طرف الفاظ کا مسخ ہونا کیوں کر گوارا کرتے ہو، سید سلیمان کو جو اس وقت الندوہ کے ایڈیٹر تھے اس طرف متوجہ کرتے ہیں اور تاکید کرتے ہیں کہ وہ خود کاپیوں کا مقابلہ کیا کریں، ورنہ پرچے کو غارت کرنے سے کیا فائدہ، ایک سطر بھی تو صحیح نہیں ہوتی، افسوس! میں پہلے کہتا تھا کہ وہاں کے کاتب سخت جاہل ہیں۔"(۲)

ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کتنے متفکر ہوتے تھے اگر کسی شاگرد یا کسی بھی کاتب وغیرہ سے کوئی غلطی سرزد ہوتی تو فوراً اسے اس کی آگاہی کی جاتی، وہ چاہتے تھے کہ کام اچھے طریقے سے ہوا اور اعلیٰ معیار پر بھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مختلف انداز میں اپنے مکتوب الیہ کو آئندہ کے لیے محتاط رہنے کی رائے دیتے تھے۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"فرائض میں محابات اور مدارا نہیں چل سکتا اور تعلقات کے بدمزہ ہونے کا سبب ہوتا ہے، تمہاری طبیعت قدرتی کاہل اور سست واقع ہوئی ہے، جس کو غالباً اب نہیں بدل سکتے، اس لیے اب تم کو یہ طے کرنا چاہیے کہ تم الندوہ کی ایڈیٹری کرسکتے ہو یا نہیں۔"(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۵۷
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۵٦
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم ص ٦۱

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی طبیعت کی کاہلی اور سستی کو برداشت نہیں کرتے تھے، سید سلیمان کی طبیعت کی کاہلی اور سستی سے اس درجہ خائف ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ اب سید سلیمان کی طبیعت نہیں بدل سکتی، حالانکہ وہی سید سلیمان آگے چل کر مولانا شبلی کے دست راست بن جاتے ہیں اور خود علامہ شبلی نعمانی ان کی تعریف کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔در اصل یہ شبلی کا تربیت دینے کا انداز اور طریقہ تھا، اس مکتوب سے مولانا شبلی کی صاف گوئی کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرائض اور قومی کاموں کے سلسلے میں تعلقات کا مطلق خیال نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے ایک عزیز شاگرد کو صاف طور پر یہ لکھ دیا کہ ایسی باتیں آپس کے تعلقات کو بدمزہ کرتی ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی ان لوگوں سے بہت ناراض ہوتے جو اپنی کوتاہیوں سے قوم وملت کا نقصان کرتے ہیں، ایک شاگرد سے ناراضگی کا اظہار ایک دوسرے مکتوب میں یوں کرتے ہیں:

> ”حمید سے تعلق نہیں رکھتا، اس سے کہہ دو کہ وہ اپنے کام سے استعفیٰ
> دے دیں اور ساتھ ہی میرے تعلق سے بھی، میں اس کی کاہل طبیعت سے بے خبر
> نہ تھا، ادھر عبد الغفور کا ساتھ اور یاں لکھنو کا مجمع ہوگیا ہے، میاں حمید کو غفور کی ہم
> کلامی سے فرصت ہی تو نہیں مل سکتی، جب کسی قوم میں ادبار پھیلتا ہے تو یوں پھیلتا
> ہے، ”فصبر جمیل“ میرا پیغام ضرور اس سے کہہ دینا ورنہ مجھ کو سخت رنج ہوگا“۔(۱)

یہ خط علامہ شبلی نعمانی نے مولوی محمد سمیع صاحب کو لکھا تھا اصلاً آپ کی منشا یہ ہوتی تھی کہ وہ کام جو کسی کے سپرد کیا جائے وہ اس کو بحسن وخوبی انجام دے، اگر اس میں کوئی لاپرواہی برتتا تھا تو ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ مشاغل میں کوتاہی قوم کے ساتھ ناانصافی ہے اس میں سب کو محتاط رہنا چاہیے۔

علامہ شبلی جمہوریت کے بڑے قائل تھے وہ ہمیشہ چاہتے تھے کہ قوم میں ایک عام بیداری پیدا ہو، لوگ تعمیری کاموں میں حصہ لیں اور مل کر کام کریں، انھوں نے جو بھی کام کیے اور قوم کی بہبودی کے سلسلہ میں جو جد وجہد کی اس سے ان کی طبیعت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے، ان کے دل میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔وہ دل سے چاہتے تھے کہ قوم سنبھلے اور اپنی بھلائی کی طرف قدم اٹھائے۔دار العلوم ندوہ کی نظامت کے تقرر کے سلسلے میں بھی ان کا یہ خیال تھا کہ مختلف شہروں میں جلسے ہوں، ”جن میں لوگ کسی حقیقی قابل شخص کا نام نظامت کے لیے پیش کریں“ ان کا مقصد تھا کہ ”قومی کام میں تمام قوم کی حقیقی رائے معلوم

(۱)مکاتیب شبلی جلد اول ،ص ٦٦

ہو اور قوم کی عام دلچسپی بڑھے"۔(۱)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

"مکاتیب شبلی کا ایک موضوع حکومتوں کا ذکر ہے، ہندوستان کی انگریزی حکومت، عالم اسلام کی حکومتیں، یورپ کی بعض حکومتیں، ہندوستان کی دیسی ریاستیں بھوپال اور حیدر آباد وغیرہ۔ غرض اس وقت کی حکومتوں کا حال احوال بھی مختصراً سہی اس میں مضمر ہے، اس وقت ملک کے کیا حالات تھے ان کے ایک خط سے اس کی جھلک سامنے آتی ہے۔"

وہ لکھتے ہیں:

"میری نظموں کی ضبطی کا بہت بڑا اثر پڑا،لفٹیننٹ گورنر صاحب سے ایک پارٹی میں سامنا ہوگیا پہلے تو کہا مزاج مقدس، پھر شکایت آمیز وطعن آمیز فقرے کہے، ابھی تک میں ان سے مل نہ سکا اور جاسوس نے سب نظمیں ان کو پہنچائیں اور معنی سمجھائے، چیف سکریٹری صاحب بھی مجھ سے شاکی تھے"(۲)

سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب مولانا شبلی کے سیاسی، قومی اور جمہوری نظریہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مولانا خالصتہً علمی آدمی تھے، مگر زمانہ کی سیاست سے بیگانہ بھی نہ رہے، قومی اور ملی درد پوری طور پر رکھتے تھے، سیاسی حالات اور واقعات سے متاثر ہوتے تو اس کا اظہار خاص طور سے اپنی نظموں میں جرأت اور بے باکی سے کرنے میں تامل نہ کرتے، بین الاقوامی سیاست میں وہ ترکوں کے حامی تھے۔"(۳)

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۹۰

(۲)آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سنہ اشاعت جنوری ۲۰۱۳ء) ،ص ۲۰۲

(۳)مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، مطبع معارف دار المصنّفین اعظم گڑھ، طبع اول ۱۹۵۸ء، ص ۱۱۶

اگر علامہ شبلی نعمانی کے خطوط اور ناقدین کے احوال کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ شبلی جمہوریت پسند ذہنیت کے حامل تھے۔ یہ بات اس زمانے کے لیے زیادہ ترقی پسندانہ تھی، اس لیے کہ لوگ عام طور پر اس بات کے عادی تھے کہ من مانی کرتے اور زبردستی اس بات کو قوم پر مسلط کر دیتے لیکن شبلی کو اپنی ذمہ داریوں کااحساس تھا گو وہ جانتے تھے کہ قومی کاموں میں خود قوم جب تک دلچسپی نہ لے اس وقت تک کسی کام میں کامیابی مشکل ہے، اور در اصل کام کرنے کے طریقے بھی یہی ہوتے ہیں کہ

ع: "چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو"

شبلی کی اس جمہوریت پسندی کا اظہار ایک اور مکتوب سے بھی ہوتا ہے جس میں ابو الکلام آزاد کو لکھتے ہیں:

"مدت سے میری رائے تھی اور اب تو بالکل موقع آگیا کہ تمام قومی کام قوم کے ہاتھ میں آجائیں اور دو چار شخصوں کی خود اختیاری مٹ جائے"۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں سے متعلق بڑی پُرجوش نظمیں لکھیں ان میں "شہر آشوب اسلام" بہت مشہور ہے، مولانا نے اس زمانے میں مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ کے عنوان سے ایک پر زور اور طویل مضمون لکھا جس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ بدل دیا۔ امین زبیری مولانا کی سیاسی نظمیں چھاپنا چاہتے تھے، مولانا شبلی نے انھیں لکھا:

"بہرحال اگر آپ سیاسی نظمیں بھی چھاپنا چاہتے ہیں تو ضرور ہے کہ میرے تینوں آرٹیکل پولٹیکل کروٹ (۳) والے بھی شامل کیجیے، اس نظم کی وہ نثری شرح ہے، کچھ دیباچہ بھی ہونا چاہیے، وہ میں لکھ دوں گا۔(۲)

علامہ شبلی نعمانی کو قومی خدمت کا اتنا احساس تھا کہ کبھی اپنی ذات سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا، وہ مذہبی، قومی اور تعلیمی اداروں میں عہدوں کے خواہش مند نہ تھے،

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۷۲
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۳۱

البتہ خود کو جس کام اور خدمت کے مناسب اور اہل سمجھتے ضرور پیش کرتے، جب مولانا شروانی نے انھیں نظامت ندوہ کی پیشکش کی تو لکھتے ہیں:

"والا نامہ پہنچا، میں اگر نظامت کے قابل ہوتا تو اپنا نام کسی دوست سے پیش کراتا کیوں کہ اس موقع پر خاکساری کرنا ایمانداری کے خلاف تھا، لیکن میں اس عہدہ کے ناقابل ہوں، میں بادشاہ بن کر کام نہیں کرسکتا بلکہ وزیر بن کر کرسکتا ہوں، بخدا میری نظامت سے ابھی ندوہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا بلکہ الٹے نقصان ہوگا۔"(۱)

ان کو اس بات کا احتمال تھا کہ مخالفین محض ذاتی رنجشوں کی بنا پر ان کی مخالفت کریں گے اور اس سے ندوہ کا مفاد متاثر ہوگا۔ ایک اور مکتوب کے ذریعہ مولانا شروانی کو تبدیل نصاب کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو ندوہ کے کاموں سے ایک دلی لگاؤ تھا، اٹھتے بیٹھتے بس انھیں اپنی قوم کی تربیت کا خیال ستاتا رہتا تھا، مولانا شروانی اس معاملے کو ملتوی رکھنا چاہتے تھے کہ تاکہ اور لوگ بھی اس بات سے متفق ہوجائیں ورنہ کہیں گالیوں میں شبلی کی ذات ایسی نہ تھی کہ خاموش ہو رہتی، لکھتے ہیں:

"مکرمی، اس طرح کام نہیں چلتا، سید صاحب نے اس طرح کام نہیں چلایا"۔(۲)

آگے لکھتے ہیں:

"اور اگر آپ اتفاق کی راہ دیکھتے رہے تو خدا کی قسم قیامت تک کچھ نہ ہوگا، ایسی حالت میں معتمدی نصاب کا نام کیوں بدنام کیجیے"۔(۳(

در اصل علامہ شبلی ہمہ وقت متحرک اور سرگرم عمل رہنا چاہتے تھے، جمود ان کے عملی مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا، مولانا شروانی کو یہ خط لکھ کر اس لیے جھنجھوڑنے کی کوشش کی اور آخر کو صاف صاف کہہ ہی دیا کہ معتمدی نصاب کا نام کیوں بدنام کیجیے،

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۱۴۶
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ، ص ۱۴۸
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۱۴۸

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ یہ کام انجام نہیں دے سکتے تو معتمدی سے علیحدگی اختیار کر لیجیے تاکہ کوئی اور اس خدمت پر آئے اور نصاب کی تبدیلی کے معاملے کو جلد رو بہ عمل لائے، آگے ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میری بھی یہ رائے ہے کہ جس کام کو آپ قلت صرف، فرصت یا اور کسی وجہ سے نہ کرسکتے ہوں اس سے استعفیٰ دنیا بہتر ہے، ورنہ محض انتساب کے فخر سے کیا حاصل۔" (۱)

اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا اصولوں کے پابند تھے، اور اپنے دوست اورعزیز کو بھی یہی رائے دیتے کہ آپ جس کام کو نہ کرسکیں اس سے استعفیٰ دے دیں، مولانا شبلی اپنی خدمات کا بھی جائزہ لیتے رہتے تھے اور ہمیشہ قوم کی فلاح وبہبود کے لیے فکر مند رہتے، لکھتے ہیں:

"خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کرسکتا ہوں اور بے تکلف کرسکتا ہوں۔" (۲)

بقول مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی:

"مولانا کے مکاتیب کے آئینہ میں ان کے اخلاق وسیرت کی جھلک بھی جا بجا ملتی ہے، جس سے ان کے کردار کا ہلکا سا نقشہ سامنے آجاتا ہے، مولانا کی پوری زندگی ایثار اور قومی خدمت میں گذری، ان کی شخصیت جیسی جلیل القدر تھی اگر وہ چاہتے تو بہت دولت دنیا حاصل کرسکتے تھے، ان کے ادبی شاگرد بڑے بڑے درجوں پر پہنچ گئے تھے، لیکن انھوں نے ہمیشہ قوم کی خدمت کو دولتِ دنیا پر ترجیح دی"۔(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۵۰

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۱۶۵

(۳)ادیب ستمبر ۱۹۶۵ء، شبلی نمبر ص ۲۵۸

متعلقین سے ہمدردی اور سلوک

مولانا شبلی کی علمی، سیاسی، جمہوری اور عوامی زندگی سے ہٹ کر ان کی خانگی زندگی کا جائزہ لینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ شبلی کی سیرت کا مکمل خاکہ سامنے آسکے، متعلقین بالخصوص والدین اور اولاد سے محبت فطری بات ہے، شاید ہی کوئی ایسا ہو جو یہ جذبہ نہ رکھتا ہو اور حقیقت میں کسی شخص کو انسانی روپ میں دیکھنے کے لیے اس کی خانگی اور عوامی زندگی دونوں کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ بعض شخصیتیں ایسی دیکھنے میں آتی ہیں کہ گھر سے باہر ان کا شمار بڑوں میں کیا جاسکتا ہے، لیکن ان کی گھریلو زندگی خود ان کے طرز عمل کی وجہ سے انتہائی تلخ ہوجاتی ہے، لیکن علامہ شبلی کی زندگی کا مطالعہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے دل میں والدین کی بڑی عزت تھی، ان کا طرز عمل کبھی قابل اعتراض نہ رہا، بھائیوں سے ان کو انتہائی ہمدردی اور محبت تھی، اپنی اولاد سے تو کس کو پیار نہیں ہوتا، اہلیہ کی وفات پر بیحد متاثر اور رنجور ہوئے، غرض یہ کہ وہ ایک گھریلو انسان بھی تھے، لیکن شبلی کے تذکرہ نگاروں نے بعض واقعات کو خوب بڑھا چڑھاکر اور غلط رنگ دے کر پیش کیا، ان میں سے ایک واقعہ ان کے والد کے عقد ثانی کا ہے، جس پر وہ ناراض ہوگئے تھے، اس کی وجہ اپنی حقیقی والدہ سے بے انتہا محبت ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان کو اپنے والد سے نفرت ہوگئی تھی اگر ایسا ہوتا تو والد کے انتقال کے بعد وہ اپنی سوتیلی ماں کے ساتھ اتنی سعادت مندی سے کیوں پیش آتے اور والد نے تیس ہزار روپیہ کا جو قرض چھوڑا تھا اس کی ادائیگی کے لیے تکالیف کا کیوں سامنا کرتے، انھیں اپنے والدین سے جومحبت تھی اس کا اندازہ ایک مکتوب سے ہوتا ہے جو محمد سمیع کے نام ہے اس مکتوب سے شبلی کے جذبات کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے:

> ”اب تم پورے یتیم ہو اور سچ تو یہ ہے کہ سخت رحم کے قابل ہو، بھائی جو لوگ باپ ماں کا اس لیے ماتم کرتے ہیں کہ وہ دنیاوی فائدوں کے مرکز تھے، ان بے دردوں کا مذکور نہیں، ان کے دل سے پوچھیے جو والدین کی جھڑکیوں میں بھی دوسروں کے مرحبا سے زیادہ مزہ

> پاتے ہیں، جن کو والدین کے طمانچے بھی اصلی ہمدردی کی یادگار بن کر سامنے آتے ہیں، جن کو یہ خیال بے چین کر دیتا ہے، ہائے وہ کیا ہوئے جو ہماری تکلیفوں میں ہم سے زیادہ تڑپ جاتے تھے، بھائی یہ لوگ قسمت سے ساتھ رہتے ہیں اور گئے تو پھر اپنا قائم مقام بھی چھوڑ نہیں جاتے، ہائے یہ خیال اور ستاتا ہے کہ ان کی روحیں اب بھی چین سے نہیں، ہمارا خیال اب بھی ان کے مایۂ آزاد ہے، خیر میری طرح تمھیں بھی خدا صبر دے"۔(۱)

کیا اس خط کے مطالعے کے بعد بھی اس شبہہ کی گنجائش ہے کہ شبلی کو اپنے والد سے محبت نہ تھی، علامہ شبلی پر ایک اور اعتراض عائد کیا جاتا ہے کہ انھیں اولاد سے زیادہ لگاؤ نہ تھا، محمد اکرام نے اپنی کتاب شبلی نامہ میں لکھا ہے کہ شبلی کی اپنی لڑکی کے نام ''شبلی کے خطوط پڑھیں تو کسی خاص شفقت کا اظہار نہیں ملتا، اور جس وقت ان کی لڑکی فاطمہ خانم بیمار تھیں تو شبلی بمبئی میں بیگمات فیضی کے ساتھ پر لطف دن گزار رہے تھے، حالانکہ شبلی کی تحریر سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی کو دیکھنے کے لیے کتنے بے چین تھے، لکھتے ہیں:

> "قرۃ العین من! سخت افسوس سے سنا کہ تم کو ابھی تک افاقہ نہیں ہوا، عزیزی! میری اولاد میں جس کو مجھ سے پدری محبت ہے صرف تمھیں ہو، اس لیے تم سمجھتی ہو کہ مجھ کو کس قدر تمہاری بیماری کا رنج ہے، میں اس وقت لکھنؤ سے بہت دور ہوں ورنہ فوراً پہنچتا، خدا نے چاہا تو لکھنؤ پہنچ کر سب سے پہلے بندول آؤں گا، ابھی چند روز اور سفر میں گذریں گے"۔(۲)

اپنے بیٹے محمد حامد کے گھر چھوڑ جانے کی وجہ سے علامہ شبلی اتنے پریشان ہوگئے تھے کہ کئی وقت کا کھانا نہیں کھایا، اس واقعہ سے بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ءشبلی کو اپنی اولاد سے کتنی محبت تھی۔ایک اور مکتوب سے جو مہدی حسن کے نام ہے یہ بات واضح ہوتی ہے

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، طبع جدید ۲۰۱۰ء، ص ۸۱، ۸۲

(۲)مکتوبات شبلی حصہ اول، ص ۳۳۱

کہ ان کے دو مشغلے تھے، کتاب اور اولاد۔لکھتے ہیں:

"اس پیرانہ سری میں خدا نے مجھ کو پھر باپ بنایا، کتاب سے
گھبراتا ہوں تو اس سے جی بہلاتا ہوں۔"(۱)

علامہ شبلی اپنی پہلی اہلیہ کے انتقال پر بیحد رنجیدہ رہے لیکن پانچ سال بعد غالباً طبی مشورہ پر دوسری شادی کی نوبت آئی مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کو اس شادی سے زیادہ خوشی نہ ہوئی۔

غالباً وہ ایک آئیڈیل بیوی کے خواہشمند تھے جس میں حسن صورت اور حسنِ سیرت دونوں خوبیاں موجود ہوتا کہ گھریلوزندگی سکون اور چین سے گزر سکے۔لکھتے ہیں:

"مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل
ہیں، ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے؟ افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ پانچ
برس کے انقطاع کے بعد میں نے جو تعلق اختیار کیا (۴) وہ صرف اس
لیے تھا کہ ایک زنجیر پاؤں میں پڑجائے تاکہ مارا مارا نہ پھروں، لیکن بد
قسمتی دیکھو کہ مصرعِ ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں۔زندگی
کے چند انفاس باقی ہیں۔ وہ آرام سے کٹ جاتے لیکن ایسے نصیب
کہاں؟"(۲)

اس سے ناکامی اور حسرت کا اظہار ہوتا ہے۔اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں :

"تم جانتے ہو کہ حسن صورت کی نوبت ہوچکی، میری قسمت میں دونوں
کا اجتماع نہ تھا اب کوئی چیز مایۂ تسکین ہوسکتی ہے تو صرف حسنِ سیرت
ہے، اس کے لیے سب سے مقدم تعلیم ہے"۔(۳)

علامہ شبلی کو اپنے بھائیوں سے اپنی اولاد سے زیادہ پیار تھا۔بھائی مہدی کے انتقال پر اتنی بری طرح تڑپتے ہیں کہ ان کا قلم بھی آنسو بہاتا ہے۔میں بدبخت پاس تھا اور اس لیے جتنے

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم ،ص ۱۷۳
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۰۴، ۱۰۵۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۰۴، ۱۰۵۔

تیر پھینکے سب میرے ہی جگر پر گئے، ہائے اس کی جوانہ مرگی، ہائے کیا معلوم تھا کہ وہ اس قدر جلد دنیا سے جائے گا، پھر آگے لکھتے ہیں :

"ہائے سب برائیوں پر وہ سب سے اچھا تھا، آج چوتھا دن ہے لیکن خدا کی قسم اس وقت تک دل نہیں ٹھہرتا، سو بار رو چکاہوں اور دل نہیں ٹھہرتا، اس کی ایک محبوب یادگار ہے جو وہ بین کہتا تھا یعنی شافیہ (۱) اس سے بارہا لپٹ کر رویا ہوں لیکن کچھ بھی تو تسلی نہیں ہوتی اس کو تسلی دینا چاہتا ہوں لیکن خود بیقرار ہوجاتا ہوں، ایک اور اس کے نام سے وابستہ بدقسمت ہے جو پہلے چھوٹی بھاوج تھی لیکن اب پیاری بہت ہے"۔(۱)

مہدی کے علاوہ دوسرے بھائی محمد اسحاق سے انھیں جو غیر معمولی محبت تھی اس کا شاہد وہ مرثیہ ہے جو انھوں نے اسحاق مرحوم کی وفات پر لکھا ہے۔ایک شاگرد کو لکھتے ہیں:

"جو مصیبت مجھ پر پڑی، شاید تمہیں معلوم نہیں، عزیز بھائی اسحاق نے جو میرا دست وبازو تھا، انتقال کیا، میں مدت تک کسی کام کے قابل نہیں رہا"۔(۲)

ایک دوسرے خط میں مولوی مسعود علی ندوی لکھتے ہیں:

"جو مصیبت مجھ پر پڑی (محمد اسحاق کی وفات) اس نے بہت دنوں تک بیکار کردیا"۔(۳)

ایک اور مکتوب میں مولوی عبد الباری ندوی صاحب کو لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۹۹، ۱۰۰۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۱۳۹۔

(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۱۲۔

"میں واقعات حال سے اس قدر افسردہ ہوگیا ہوں کہ اب کسی
بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی" (۱)

خطوں کے ان اقتباسات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شبلی باوجود ایک مصروف علمی زندگی گزارنے کے ایک گھریلو آدمی کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔ان کو اپنے متعلقین اور عزیز واقارب سے ویسی ہی محبت تھی جیسی ہر ذمہ دار انسان کو ہونی چاہیے طبیعت حساس واقع ہوئی تھی اس لیے حالات بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔چنانچہ محمد اسحاق کے انتقال کے چند ہی مہینے بعد ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ آخری وقت تک بھائی کی موت کا رنج ختم نہ ہوا تھا، محمد اسحاق سے ان کو بڑی توقعات وابستہ تھیں، ان کی ہمیشہ ہمت افزائی کرتے تھے۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"شاید تم کو معلوم ہوگا کہ میں لوگوں سے تمہاری نسبت کسی
قدر علمی زندگی بسر کرنے کا تذکرہ سنتا ہوں"۔(۲)

شاگردوں سے ہمدردی اور سلوک

مولانا شبلی نعمانی کو نہ صرف اپنے عزیزوں کا حد درجہ خیال تھا بلکہ اپنے شاگردوں اور شاگردوں کے عزیزوں کو بھی وہ اپنا عزیز سمجھتے تھے اور ہر ممکن اعانت اپنا فرض جانتے تھے۔محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

"تمہارا عزیز میرا عزیز ہے، اس لیے جو اعانت ہوسکے میرا فرض
ہے اور اس کے قبول کرنے میں مضائقہ نہ کرنا چاہیے، اگر میں عزیزانِ
قوم کے کام نہ آسکوں تو کس کام کا؟"(۳)

مولوی حمید الدین ان کے ماموں زاد بھائی تھے، شاگرد بھی اور رفیق کار بھی۔مولانا شبلی کو ایک مرتبہ حکومت کابل کی طرف سے دس ہزار روپئے کی پیشکش کی گئی جس کے

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۳۸۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۳۵۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۸۹۔

معاوضہ میں ان سے ابن خلدون کا ترجمہ کرنے کی خواہش کی گئی۔مولانا شبلی نے اپنی صحت کا عذر کرتے ہوئے پہلے تو اس سے انکار کیا لیکن ان کا خیال مولوی حمید الدین کی طرف گیا، ان کو اس طرف متوجہ کرنے کے لیے لکھتے ہیں:

"اگر تم پبلک میں آجاؤ تو اس قسم کے کاموں سے اچھی طرح آزاد بسر کرسکو" (۱)

بعد میں اعزہ اور احباب کے اصرار پر مولانا شبلی نعمانی نے اپنی رضامندی کا اظہار کر ہی دیا کہ وہ اس کام کو انجام دیں گے۔امیر کابل انگریزی کتابوں کے ترجمہ کے لیے ایک محکمہ قائم کرکے اس کا سکریٹری مولانا شبلی کو مقرر کرنا چاہتے تھے۔ان کی رضامندی بھی شاگردوں کے مفاد کے لیے ہوتی تھی، اس کے متعلق وہ اپنے ایک شاگرد کو مکتوب میں لکھتے ہیں:

"لیکن میں نے انکار لکھ بھیجا، اور زیادہ تر امید ہے کہ اگر تمہارے لیے مناسب تحریک کروں گا تو تم کو یہ عہدہ مل جائے گا، اس صورت میں اتنے بڑے وسیع کام کا تمہاری ماتحتی میں انجام پانا بہت سے فوائد کا مثمر ہوگا، اب اپنی رائے لکھو"۔(۲)

اکثر دیکھا گیا کہ مولانا شبلی کو ان کی علمیت اور شہرت کی وجہ سے کوئی عہدہ یا اعزاز پیش کیا جاتا تو وہ کوشش کرتے کہ ان کے بجائے ان کے شاگرد اس سے مستفید ہوں۔اپنے اثر ورسوخ سے اگر کسی کو فائدہ پہنچ سکتا (بشرطیکہ وہ مستحق ہو) تو شبلی فائدہ پہنچانے سے دریغ نہ کرتے تھے۔مولوی حمید الدین نے ان سے غالباً خواہش کی تھی کہ وہ ماریسن سے ان کی سفارش کریں۔اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"خط پہنچا، اس کو بلا مبالغہ خیال کرو کہ اگر مجھ کو یقین ہو کہ کسی کام میں اپنے سلف رسپکٹ کو کھوکر تم کو فائدہ پہنچا سکتا ہوں تو میں ہرگز رسپکٹ کو عزیز نہیں رکھ سکتا، میں ماریسن کو جس وقت کہو اور جن

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم ،ص۷۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ، ص۹۔

الفاظ میں کہو خط لکھ دوں"۔(۱)

ایک اور مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں:

"میں سچ کہتا ہوں کہ میں تمہارے وجود کو اپنی تمام برادری کے لیے تاج عزت سمجھتا ہوں اور تم کو مہدی واسحاق سے کم نہیں جانتا،اس غیر ضروری اظہار کی ضرورت یہ ہے کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو، رخصت لو، وطن جاؤ، چند روز میرے پاس رہو، یہ ضرور کرنا چاہیے"۔(۲)

جب سید سلیمان ندوی تعلیم سے فارغ ہوئے تو مولانا شبلی کو ملازمت کے سلسلے میں لکھا لیکن شاید دبے دبے الفاظ میں اظہار کیا تھا جس کے جواب میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"تم نے اپنی حالت کے متعلق حجابانہ طریقہ میں اظہار خواہش کیا ہے۔ عزیزی کیا اس کے کہنے کی حاجت ہے، تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو اور میں موقع ڈھونڈھتا رہتا ہوں لیکن اتنی جلدی کون کامیاب ہوا ہے"۔(۳)

مولانا شبلی کو اپنے شاگردوں کا بے حد خیال رہتا تھا، وہ خود اس بات کے متمنی تھے کہ ان کے شاگرد اور رفقاء ویسی ہی شہرت حاصل کریں جو انھیں حاصل تھی۔ آگے لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے جو موقع ملے گا میں تم کو پیش کروں گا، بھوپال میں تو علم کی کوڑی برابر قدر نہیں، حیدر آباد میں شاید کوئی صورت نکلے، لیکن ابھی تم کو شہرت کے عام منظر پر زیادہ نمایاں ہوکر آنا چاہیے"۔(۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص۱۹
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص۱۵
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۵۹
(۴)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۶۰

الندوہ میں انھیں مضامین لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور اسے شہرت کا ایک ذریعہ بتاتے ہیں، الندوہ میں جب سید سلیمان کے مضامین چھپتے تو ان کی تعریف کرتے اور اس طرح ان کی ہمت افزائی ہوتی۔لکھتے ہیں:

"دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا، البتہ عبارت کی کمزوری باقی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ یہ ممکن ہے کہ تم کو مصر بھیجا جائے، اس لیے اگر تم کسی قدر انگریزی پڑھ لیتے تو تمہاری ترجیح کو کوئی شخص دبا نہ سکتا تھا"۔(۱)

سید سلیمان ندوی کو حیدر آباد آنے کے لیے لکھتے ہیں لیکن مصارف کے خیال سے غالباً سید سلیمان وہاں جانے کا قصد نہ کرسکے، اس کے جواب میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"تم یہاں آجاتے تو بہت اچھا ہوتا کہ یہاں کے عمائد سے تمہاری خوب معرفت کرا دیتا، خیر یہ موقع تو نکل گیا، ایک اور کوشش ہو رہی ہے، جواب کا انتظار ہے"۔(۲)

غالباً یہ اشارہ دکن کالج پونا کی اسسٹنٹ پروفیسری کی طرف ہے جس پر بعد میں سید سلیمان ندوی کا تقرر مولانا ہی کی کوشش سے عمل میں آیا۔ایک اور شاگرد مسعود علی ندوی کو وہ عملی آدمی سمجھتے تھے اور ان کو قومی اشغال کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دیتے رہے۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

واقعی ایک کارکن آدمی کے لیے بے شغلی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں، لیکن تم نے لکھا تھا کہ تم نے کسی شغل کی بنیاد ڈالی ہے اور اب شروع کردوگے، وہ کیا تھا۔(۳)

(۱(مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۶۴

(۲(مکاتیب شبلی جلددوم،ص ۸۸، ۸۹

(۳(مکاتیب شبلی جلددوم،ص ۱۱۰

پھر انھیں دار المصنّفین کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ ان معاملات کو سنبھال لیں۔ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"تمہارے استقلال سے بہت مسرت ہوئی، خدا قائم رکھے، میں نے (احباب نے بھی یہی مشورہ دیا) تو یہ عزم کرلیا ہے کہ جہاں رہوں ندوہ اپنے ساتھ رکھوں، ندوہ درو دیوار کا نام نہیں، سید سلیمان وغیرہ کا نام ہے، ایسے اشخاص پیدا کرنے چاہئیں"۔(۱)

کام کرنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ اور لوگ بھی کام کریں، چاہے کہیں ہوں، وہاں ایک علمی اور ادبی ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے۔اشخاص کی موجودگی سے کام کرنے کا ماحول بنتا ہے اور کوئی تحریک چلائی جاسکتی ہے، ایسی تحریکیں در ودیوار کی قید سے آزاد ہیں، شبلی نے بھی کوشش کی کہ وہ ایک علمی ماحول اور فضا پیدا کریں۔چانچہ سید سلیمان، مسعود علی ندوی وغیرہ سب اسی ماحول کے پروردہ ہیں۔مولانا ضیاء الحسن ندوی سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ چند روز ان کے ساتھ رہیں:

"میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا میرا ساتھ رہتا تاکہ میں ادب وفلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا اور مضمون نگاری کی تعلیم بھی دیتا، دیکھیے خدا کب موقع لاتا ہے"۔(۲)

لیکن مکتوب الیہ سے چار سال تک کوئی خط وکتابت نہیں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مدت انھوں نے مولانا کی صحبت میں گزار دی، بعد کا خط اس کی نسبت زیادہ بے تکلف ہے۔تحریر فرماتے ہیں:

"مبارک، تمہارے پاس ہونے کی بے حد خوشی ہوئی اور تمہاری نسبت حسن ظن بڑھ گیا، فراید معانی وبیان میں ہے، مطول وغیرہ کی یہ نسبت کسی قدر جدت ہے، کلکتہ میں اس کا ایک حصہ چھپا ہے، مولوی فاروق صاحب کے ایک عزیز گورکھپور میں ہیں ان کے پاس بھی جدید

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۱۱۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۲۲

الخط ایک نسخہ ہے، اب تو تم کالج میں ضرور پڑھوگے، الندوہ میں تم پر
نوٹ دوں گا" (۱)

چنانچہ اسی ہمت افزائی نے کچھ مدت بعد ضیاء الحسن ندوی کو ایم۔اے۔ بھی کروا دیا۔ ایک اور شاگرد عبد الباری ندوی کی ملازمت کے سلسلے میں بھی ان ہی کی کوشش کا دخل ہے۔لکھتے ہیں:

"آئندہ مراحل کے لیے بھی مجھ سے جو کچھ ہوسکتا ہے میں
ہمیشہ موجود ہوں"۔(۲)

مولانا شبلی چاہتے تھے کہ قوم قابل افراد پیدا کرے۔لکھتے ہیں:

"میں چاہتا ہوں کہ دو چار قابل طلبہ اپنے ساتھ رکھوں، کسی
فن کی ان کو تکمیل کراؤں، ان میں سے جن میں تصنیف کا مادہ ہو ان
کو تصنیف کے لیے تیار کیا جائے۔ جو غیر مستطیع ہوں گے ان کے
مصارف کا بند وبست ہوگا، اس لیے ایسے طلبہ کی (اگر ہوں اور پسند
کریں) ایک فہرست لکھ بھیجو"۔(۳)

بہرحال ان کی ہمت افزائیوں اور ہمدردیوں کی وجہ سے ان کے شاگردوں کے حوصلے بلند ہوئے۔بلکہ دیکھا جائے تو مولانا ہی کی کوششوں نے بعض اشخاص کو بام شہرت پر پہنچایا۔

جہاں تک ممکن ہوسکے دوسروں کو فائدہ پہنچانا ان کا مقصود تھا لیکن سفارش وغیرہ کے سلسلے میں وہ محتاط بھی تھے، جو سفارش کا مستحق ہوتا اس کی سفارش میں کبھی پس وپیش نہ کرتے۔ سید سلیمان ندوی صاحب کے تقرر اسسٹنٹ پروفیسری کے سلسلے میں پروفیسر عبد القادر کو لکھتے ہیں:

"بے شبہہ سید سلیمان کی کامیابی حیرت انگیز ہے لیکن اصل
حیرت انگیز آپ کا زورِ اثر ہے، بہرحال ایک قابل شخص کی قدردانی

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۲۲ ، ۱۲۳۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۳۴۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۰۷۔

منتج نتائج مفید ہوگی"۔(۱)

ایک مرتبہ مولوی ضیاء الحسن ندوی نے مولانا سے ایک سر ٹیفکیٹ منصور احمد ایم۔ اے۔ کے نام عطا کرنے کی خواہش کی جو تحصیل عربی کے لیے یورپ جارہے تھے۔ چونکہ مولانا کی علمیت اور شہرت کا چرچا دور دور تھا، اس لیے ان کا ایک سر ٹیفکیٹ بھی ایک "ایم۔ اے" کے لیے اہمیت رکھتا تھا لیکن باوجود ہمدرد انسان ہونے کے مولانا کی اصول پسند طبیعت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ منصور احمد کی کوئی عبارت اور تحریر دیکھے بغیر ایک سر ٹیفکیٹ عطاء کریں، ان کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا، اس لیے وہ ایسا نہ کرنے پر مجبور تھے۔ جب ان صاحب کی عربی عبارت مولانا کے سامنے آئی تو اس پر انھوں نے رائے قائم کی وہ بے لاگ تھی۔ مولوی ضیاء الحسن سے مولانا کے جو تعلقات تھے وہ کسی طرح بھی ان کی رائے کو متاثر نہ کرسکے۔ غیر جانبداری سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عربی عبارت تو بہت معمولی ہے، اس سے گئی گزری اور کیا ہوتی، سرٹیفکیٹ لکھوں گا تو یہ لکھوں گا کہ عربی عبارت معمولی لکھ سکتے ہیں، ان کے کیا کام آئے گا، اس کے علاوہ جب ڈاکٹر صاحب ان کو سرٹیفکیٹ دیں گے تو اس کے سامنے میرے سرٹیفکیٹ کی کیا ضرورت اور لندن میں اس کی وقعت ہوگی"۔(۲)

یہاں ڈاکٹر صاحب سے مراد ڈاکٹر ہارویز سے ہوگی جو اس زمانہ میں علی گڑھ میں عربی کے پروفیسر تھے اور جو غالباً منصور احمد کے بھی استاذ تھے، ان کے بعد مولانا اپنے سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن ضیاء الحسن کو بھی ناخوش کرنا انھیں گوارہ نہیں، اس لیے لکھتے ہیں:

"باوجوداس کے تم کہو تو بھیج دوں لیکن الفاظ کمزور ہوں گے" (۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۲۰۔
(۲)مکاتیب شبلی جلددوم،ص ۱۲۴ تا ۱۲۵۔
(۳)مکاتیب شبلی جلددوم،ص ۱۲۵۔

الفاظ کے کمزور ہونے کی وضاحت بھی کردی تاکہ بعد میں ضیاء الحسن یا منصور احمد کو تکلیف نہ پہنچے۔

جب منصور احمد کی عبارت سے متعلق ان کی رائے زیادہ اچھی نہ تھی تو وہ سرٹیفکیٹ میں پرزور الفاظ لکھ کر مبالغہ آرائی سے کیسے کام لے سکتے تھے، اس لیے کہ ان کی طبیعت میں غیر جانبداری اور انصاف پسندی تھی اور وہ جو کچھ کہتے تھے صاف صاف کہتے تھے۔

مولانا شبلی جائز تائید اور سفارش کے قائل تھے۔ان کا منشاء تھا کہ قوم کے افراد کو خود اس قابل بنایا جائے کہ وہ خود اپنی سفارش بن سکیں اور ان کی قابلیت اور ان کا تجربہ ان کے آگے بڑھنے میں مددگار ہو۔چنانچہ اسی بات کے پیشِ نظر انھوں نے مدارس قائم کیے، ندوہ کو ترقی دی، الندوہ میں مضامین لکھے تاکہ قوم تعلیم کی طرف متوجہ ہو اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو، متذکرہ بالا اصول کا اظہار ان کے ایک مکتوب سے بھی ہوتا ہے جو نواب محسن الملک کے نام ہے۔لکھتے ہیں:

> ''رہا قوم کی خدمت کرنی، اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کرکے دو چار کو نوکری دلادی جائے، ان کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ خود اپنی سفارش کرسکیں''(۱)

اس اصول کی وضاحت ایک اور مکتوب سے بھی ہوتی ہے جو مولوی عبد الماجد دریابادی کے نام ہے:

> ''میاں عبد الباری کے معاملے میں کس کا قصور ہے، پبلک سے کسی کی سفارش کرنا اس وقت بہت آسان ہوتا ہے، جب خود اس نے بھی پبلک میں پیش کیا ہو''۔(۲)

غالباً ان ہی صاحب کی ملازمت کے سلسلے میں مولانا اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۹۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۷۶۔

"ان کی ظاہری صورت سے بجز اس کے کہ کسی اسکول کا نیم
تعلیم یافتہ شخص ہے اور کیا متبادر ہوتا ہے، عربی دانی کا کوئی اثر ان کے
چہرہ پر نہیں ہے، میں ان کی قدر کرتا ہوں اور ان کو قابل ترقی سمجھتا
ہوں اور اس کے لیے آمادہ ہوں لیکن میں پبلک تو نہیں بن سکتا"۔(۱)

ان کا مقصود اور منشاء یہ تھا کہ اپنے کاموں سے خود کو اتنا نمایاں کیا جائے کہ پھر کسی کی سفارش کی حاجت نہ رہے اور ہر لحاظ سے خود کو اس طرح مستحق ثابت کرے کہ خود اپنی سفارش بن جائے۔

ان خطوط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی اپنے شاگردوں کے ساتھ کتنے ہمدرد تھے اور ان کی ہر طرح سے خدمت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، لیکن بیجا نہیں، علامہ شبلی کا اصل مقصد یہ تھا کہ شاگردوں کی ایک کھیپ تیار کردی جائے جس سے آنے والی نسلیں استفادہ کریں اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے۔اس موضوع کے تحت اور بہت سی باتیں بھی پیش نظر رہی جس کا تعلق شاگردوں کے ساتھ ساتھ قوم وملت کی ہمدردی کا ہے۔ محض یہ ایک کوشش ہے جو ہمارے لیے راہ ہموار کرے۔

مکتوبات شبلی کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں موضوعات کا تنوع بہت ہے۔جس بھی مکتوب کا مطالعہ کریں ایک نیا موضوع ابھر کر سامنے آتا ہے اور فکروخیال کے دریچوں کوکھولتا چلا جاتا ہے۔

شبلی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، ان کے پیشِ نظر مختلف منصوبے تھے۔اپنے خطوط میں وہ کبھی علمی اور ادبی کاموں میں مصروف نظر آتے ہیں اور کبھی قومی اور مذہبی سرگرمیوں میں منہمک۔ کبھی وہ علی گڑھ کی سرزمین پر موجود ہوتے ہیں، کبھی دار العلوم ندوہ میں ، اور کبھی وہ بمبئی کی سیر میں مصروف نظر آتے ہیں، کہیں وہ حیدر آباد میں تصنیف وتالیف میں مشغول پائے جاتے ہیں، تو کہیں ان کے پیش نظر سیرت النبیؐ کی ترتیب ہے اور اکثر دار المصنفین کے کاموں میں سرگرداں نظر آتے ہیں، وہ کبھی کسی علمی بحث میں الجھے ہوئے ہیں اور کبھی اسلام کے کسی معترض کا جواب لکھنے میں محو ہیں، ان ساری باتوں کو اگر یکجا کیا جائے تو ان

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۷۶۔

کی خدمات اور ان کے مشاغل کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شبلی کی کتابوں سے دلچسپی اور ان کا ذوق مطالعہ

چونکہ شبلی کو ابتدائی ماحول فاضل اساتذہ کا ملا اور خود طبیعت بھی حصول علم کی طرف مائل تھی اس لیے ان کا تعلق ہمیشہ کتابوں کی دنیا سے رہا اور در اصل ان کی شہرت کا باعث ہی ان کی علمیت اور قابلیت ہے۔شبلی کی آج بھی ہم محض ان کے عالم ہونے کی وجہ سے قدر کرتے ہیں۔اپنی علمیت ہی کی وجہ سے وہ بڑے مورخ بھی بن سکے اور ان کے وسیع مطالعہ ہی نے ان کو بہترین سیرت نگار بننے میں مدد دی۔اسی وسیع مطالعہ اور علمی ذوق نے شبلی کو علامہ شبلی بنا دیا۔

شبلی کو کتابوں سے اور کتب خانوں سے بے حد دلچسپی تھی۔کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا تھیں، ایک سے تھک جاتے تو دوسرے سے دل بہلاتے۔کتابوں کی دیکھ ریکھ اور ان کی حفاظت کا خیال ہمیشہ رہتا تھا اور اسی لگاؤ کے سبب وہ اپنے تلامذہ و منتسبین کو بیشتر ہدایت دیتے رہتے تھے ، اپنے ایک شاگرد کو ہدایت دیتے ہیں کہ:

> ”میری کتابوں کو الماری میں سے نکلواکر ہوا دو، کہیں کیڑے نہ لگ جائیں“۔(۱)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ”میری کتابوں کو دیکھتے رہو، برسات کے دن ہیں، کمرہ مرطوب ہے، کتابوں میں ضرور پھپھوند لگ جائے گی، دھوپ دکھلانی چاہیے“۔(۲)

ان کے بہت کم مکتوب ایسے ہیں جن میں کتابوں کا ذکر نہ ہو یا ان سے متعلق ان کی رائے نہ ہو۔اگر دوسروں کی کتابوں کا ذکر نہیں ہوتا تو اپنی ہی تصانیف سے متعلق کچھ لکھیں گے مگر کتابیں ضرور زیر بحث ہونگی۔چونکہ مطالعہ وسیع تھا اور قلم نے بھی ہمیشہ ساتھ دیا

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ، از سید سلیمان ندوی، ص ۵۶

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۵۵۔

اس لیے لکھتے رہے اور تیز رفتاری سے لکھتے رہے، اتنا لکھا کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، نہ زمانے نے ساتھ دیا اور نہ لوگوں نے مخالفت میں کوئی کسر اٹھا رکھی، یہاں تک کہ خود ان کے جسم نے بھی ان کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کی ممکنہ کوشش کی، لیکن آفریں ہے شبلی کے قلم پر کہ صرف اس نے ان تمام مزاحمتوں کے باوجود ان کا ساتھ دیا اور ان کے خیالات کو اور ان کی وسیع معلومات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کردیا۔ورنہ آج شاید شبلی کو بہت کم لوگ جانتے۔اس قلم نے ان کو علمی اور ادبی دنیا سے روشناس کرایا اور ایک بڑا مصنف بنایا۔شبلی ہمیشہ لکھنے میں مصروف رہے اور انھیں کسی نہ کسی نئ تصنیف کی ہمیشہ فکر لگی رہی۔ مہدی افادی شبلی کے نام ایک خط میں بڑے پر لطف انداز میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

> ”کوئی نئ حرکت آپ نے اس درمیان میں اور سوچی، ہندوستانی ماؤں کی طرح کہ ایک گود میں، ایک پیٹ میں، آپ کے طبع زاد معنوی بھی انھیں ترکیب سے وجود میں آتے رہتے ہیں۔نئ امید ہو تو پتہ دیجیے گا“۔(۱)

شبلی کو تاریخی کتابوں سے بڑی دلچسپی تھی او ردر اصل ان میں تصنیفی ذوق ایسی ہی کتابوں کی وجہ سے پیدا ہوا۔اس کا اعتراف ایک مکتوب میں کرتے ہیں جو ایڈیٹر رسالۂ زمانہ کانپور کے نام ہے:

> ”تصانیف کا شوق ابتداءاً مجھ کو ان تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا ملی تھی جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا“۔(۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ شبلی کو اسلام سے بے پناہ محبت تھی۔انھوں نے جب یہ دیکھا کہ بعض متعصب مورخوں نے اسلام کے خلاف بڑا زہر اگلا ہے تو انھوں نے اپنا قلم سنبھالااور ان کے اعتراضات اور بے بنیاد الزامات کا خوب جی کھول کر جواب لکھا اور ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن سے صحیح اسلامی اصول اور تصورات سامنے آسکیں۔ان کی اکثر تصانیف اسی

---

(۱)مکاتیب مہدی افادی ، مرتبہ مہدی بیگم۔اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۲۰۱۰ء) ،ص ۸
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۲۰۱۔

جذبہ کے ماتحت وجود میں آئیں۔

شبلی کو علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں سرسید کے کتب خانے میں مطالعہ کا بڑا موقع ملا۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ”میں جس حالت میں ہوں اچھا ہوں، سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے، سید صاحب کے پاس تاریخ وجغرافیہ عربی کی چند ایسی کتابیں ہیں جن کی حقیقت میں کیا بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے مگر یہ سب کتابیں جرمنی میں طبع ہوئی ہیں، مصر کے لوگوں کو بھی نصیب نہیں ہوئیں“۔(۱)

انھوں نے بالخصوص اسلام اور تاریخ اسلام کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا۔اردو میں ان کی سب سے پہلی تصنیف ”مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم“ ہے جو بہت مقبول ہوئی اور بار بار چھپی۔ویسے تو عربی میں اس سے قبل وہ ایک چھوٹا سا رسالہ ”اسکات المعتدی“ لکھ چکے تھے لیکن اردو تصنیفات میں اس رسالے کو اولیت حاصل ہے۔شبلی کے تصنیفی ذوق کو آگے بڑھانے میں سرسید کے کتب خانے کے علاوہ جس سے شبلی کو پوری طرح مستفید ہونے کا موقع ملا خود سرسید کی ذات بھی تھی۔چونکہ سرسید کا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا اس لیے دونوں کی یکجائی نے ضرور اس بات کا موقع دیا ہوگا کہ ایک دوسرے کے خیالات سے مستفید ہوں۔سرسید نے گبن کی تاریخ کا ترجمہ بھی کروایا تھا جو شبلی کے مطالعے میں آیا۔تاریخی کتابوں کے مطالعہ کی وجہ سے خود شبلی کو تاریخ اسلام کے موضوعات پر کچھ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔محمد سمیع کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ”سنین اسلام جلد اول جناب ماموں عبد الکریم صاحب کے پاس ہے، ان سے بذریعۂ عبد الحمید لے کر فوراً مجھ کو بھیج دو، پھر لکھتے ہیں سنین الاسلام اگر میاں حمید صاحب عنایت فرمادیں تو بہت جلد بھیجو، اس وقت میں معتصم کا حال لکھ رہا ہوں اور پہلی جلد ان شاء اللہ یہیں

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۶۳۔

تک ختم کردی جائے گی"۔(۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی کا خیال تاریخ بنی عباس لکھنے کا تھا۔ایک اور مکتوب سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ:

"مجھ کو تو آج تاریخ بنی عباس کی پڑی ہے" (۲)

لیکن بعد میں انھوں نے اپنے اس خیال میں کچھ تبدیلی کردی اور ناموران اسلام کے نام سے ایک سلسلہ شروع کیا۔اردو میں سب سے پہلی سوانح عمری جو نئے انداز میں لکھی گئی حالی کی حیات سعدی ہے جس کے معترف خود شبلی بھی تھے۔لکھتے ہیں:

"ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفہ بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے"۔(۳)

ایڈیٹر زمانہ کو اپنی پسندیدہ کتب کے سلسلے میں جو مکتوب لکھا تھا اس میں بھی حیات سعدی کا ذکر ہے۔

اس کے بعد ۱۸۸۷ء میں شبلی کی "المامون" شائع ہوئی جو شبلی کی سوانح نگاری کا پہلا نمونہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے "النعمان" لکھی۔ حضرت امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابتؒ سے انھیں غیر معمولی عقیدت تھی۔ اپنے نام کے آگے نعمانی لکھنا خود اس بات کا ثبوت ہے۔ اس زمانے میں‌اہل حدیث سے ان کا اکثر مناظرہ رہتا تھا۔ اس جذبہ کے تحت انھوں نے ابوحنیفہؒ کی سوانح حیات لکھنی شروع کی جس کا پہلا حصہ ۱۸۸۹ء میں ختم کیا اور دوسرا حصہ ۱۸۹۰ء کے آخر میں تکمیل پایا جس کی اطلاع ایک مکتوب کے ذریعہ اس طرح دیتے ہیں:

"سیرۃ النعمان یعنی لائف آف ابوحنیفہ بالکل تیار ہے، اخیر

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۷۴، ۷۵

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۵۸۔

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۷۹۔

دسمبر میں ان شاء اللہ مطبع سے شائع ہوگی، تین سو صفحوں کی کتاب
ہے"۔(۱)

کسی اور دوست کو سیرت نعمان کے ابواب کی تفصیل لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"لیکن امید ہے کہ دوسرا حصہ پہلے سے ضخامت میں زیادہ ہوگا
اور حقیقت میں میری محنتوں کا وہی تماشاگاہ ہوگا، اس کتاب کی تصنیف
میں گو بڑی خاک چھاننی پڑی، بہت سے کتب خانے دیکھنے پڑے، تاہم
اگر کتاب مرضی کے موافق تیار ہوگی تو ایک نادر چیز ہوگی اور تمام
محنت وکاوش کا معاوضہ ہوجائے گا"۔(۲)

حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ کتاب بڑی محنت اور جانکاہی سے لکھی گئی تھی جس کا اظہار وہ اپنے ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:

"یہ کتاب وہاں خوب پھیلانی چاہیے، گو محنت اور جانکاہی بہت
ہوئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ کتاب بھی اچھی تیار ہوئی"۔(۳)

وہ چاہتے تھے کہ اس کتاب کی خاطر خواہ تشہیر ہو اور لوگ اس سے مستفید ہوں۔ اپنے شاگرد سمیع کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اعظم گڑھ اور دیہات واطراف میں اس کتاب کے بہت سے
نسخے شائع ہونے چاہئیں، حنفیوں کی مزید اطلاع کا باعث ہوگا، چند
اشتہارات بھی بھیج دیئے ہیں، کچہری کے عمال اور سوداگروں کو اس سے
واقف ہونا چاہیے"۔(۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۹۰۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ، ص ۱۵۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۹۰۔
(۴)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۹۱۔

اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن تین مہینے میں ختم ہوگیا اور اس کو دوسری مرتبہ شائع کرنا پڑا۔ شبلی کی ان دونوں سوانح عمریوں نے ان کو مذہبی اور ادبی دنیا میں کافی مشہور کر دیا۔

سیر وسیاحت سے ویسے بھی علم بڑھتا ہے اور جب کوئی عالم اس غرض سے سفر کرے تو ظاہر ہے کہ اس کو ہر جگہ علم کے چشمے مل جاتے ہیں جن سے وہ بڑی حد تک اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ بزرگانِ دین کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ شبلی کو اسلام سے، اسلامی ممالک سے اور اسلامی لٹریچر سے بے پناہ عشق تھا، چنانچہ انھوں نے ۱۸۹۱ء میں ترکی کے سفر کا قصد کیا لیکن علالت کے سبب نہ جاسکے۔ ۱۸۹۲ء میں دوبارہ قصد کیا اور مسٹر آرنلڈ (جو علی گڑھ میں پروفیسر رہ چکے تھے اور مولانا سے اچھے مراسم تھے) کی معیت میں اسی جہاز میں سفر کیا۔ ۲۲/ مئی کو وہ قسطنطنیہ پہونچے، وہاں سے سرسید کو ایک تفصیلی خط یوں لکھا:

> "حالات دلچسپ ہیں اور سفرنامہ کے لیے بہت سامان مل جائے گا، لیکن اس وقت بلکہ زمانۂ قیام تک مطلق فرصت نہیں مل سکتی، ہر روز تین چار میل کا چکر کرنا پڑتا ہے، بہت بڑا شہر ہے اور تمام کتب خانے وغیرہ دور دور واقع ہیں"۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی کے ان مکتوبات میں جو ترکی سے لکھے گئے تھے کتابوں اور کتب خانوں ہی کے تذکرے ہیں جس سے ان کی تحقیقی جستجو اور تفحص کا پتہ چلتا ہے۔ "امام غزالی کی تصنیفیں یہاں موجود ہیں اور بوعلی سینا کی تو شاید کل تصنیفات مل سکتی ہیں، امام غزالی کے خطوط بھی موجود ہیں"۔ اسی مکتوب میں سرسید کو آگے لکھتے ہیں:

> "یہاں آج کل عینی کی شرح بخاری چھپ رہی ہے، ۹/ جلدیں چھپ چکی ہیں، بہت بڑی کتاب ہے، حنفیوں کو اس کی تلاش تھی، وہاں کسی متصلب حنفی کو درکار ہو تو منگوا سکتے ہیں۔ بیروت کے علماء نے تمام

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۱۴۔

نصارائے عرب خواہ جاہلیت کے ہوں خواہ اسلام کے، ان سب کے اشعار کا ایک مجموعہ تیار کرکے چھاپنا شروع کیا ہے، ایک جلد چھپ چکی ہے، اسی میں اخطل کا دیوان بھی ہے، لیکن وہ مستقل تین جلدوں میں چھپ چکا ہے، یہ آج تک کہیں نہیں مل سکا تھا، یورپ میں بھی اس کی تلاش تھی"۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی چاہتے تھے کہ وہاں سے کچھ قلمی کتابیں خرید کر لے آئیں۔ اپنے ایک مکتوب میں اس کا ذکر کرتے ہیں:

"قلمی کتابیں یہاں نہیں ملیں، مصر میں کبھی کبھی ہاتھ آجاتی ہیں، اس لیے صرف مطبوع کتابیں خریدی جاسکتی ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی معتدبہ ہے، یہاں امام غزالی کی تمام کتابیں اور رسالے موجود ہیں، مکاتبات کا نسخہ بھی ہے۔ بوعلی سینا کی اس قدر تصنیفات ہیں کہ کہیں نہ ہوں گی، ارسطو وغیرہ کی کتابوں کے اصل ترجمے نہایت قدیم خط میں موجود ہیں، لیکن کیا حاصل؟ کتابت کی شرح ۴؍روپئے جز سے کسی حال میں کم نہیں، معتزلہ کی کتابیں البتہ ناپید ہیں، عبد القاہر جرجانی کی تفسیر ہے مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں"۔(۲)

اپنے والد کو قسطنطنیہ سے خط لکھتے ہیں:

"کتابیں یہاں عجائب وغرائب ہیں، لیکن حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، نہ نقل ہوسکتی ہیں نہ حافظہ ان کے لیے کافی ہے، میں ہر روز دو تین میل پیادہ سیر کرتاہوں، کیوں کہ کتب خانے دور دور واقع ہیں"۔(۳)

ان کے والد حبیب اللہ صاحب کے خطوط میں ترکی کے حالات اور مسجد حمیدیہ میں سلطان ترکی کی آمد کا حال بیان کیا ہے جن سے وہ بڑے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ شبلی کے

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص۱۴۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۵۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۲۲۔

اس سفر کی بڑی غرض وغایت نادر کتابوں کا مطالعہ اور ان کا حصول تھا۔ ساتھ ہی انھوں نے وہاں کے نظام تعلیم کا بھی مطالعہ کیا۔ اپنے سفر کا تفصیلی حال شبلی نے "سفر نامے" میں بیان کیا ہے، لیکن خطوط سے بھی ان کے تاثرات کا علم ہوتا ہے۔ اپنے والد شیخ حبیب اللہ صاحب کو لکھتے ہیں:

"اگرچہ میری امیدیں مسلمانوں کی ترقی وقوت کی نسبت بالکل برباد ہوگئی ہیں، کیوں کہ یہاں کی حالت وہاں سے کچھ اچھی نہیں، تاہم سفر بے شبہہ ضرور تھا، جو اثر اس سفر سے میرے دل پر ہوا وہ ہزاروں کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہوسکتا تھا، مجھ کو معلوم ہوا کہ انسان جب تک دنیا کے بڑے بڑے حصے نہ دیکھے انسان نہیں ہوسکتا، افسوس ہے ان لوگوں پر جن کی تمام عمر ایک مختصر سی چہار دیواری پر بسر ہوجاتی ہے"۔(۱)

ترکی سے واپس آتے ہوئے شبلی نے بیروت، بیت المقدس اور مصر کا بھی سفر کیا، ہر جگہ انھوں نے ماضی کی عظمت کے آثار دیکھے، اس سفر نے ان کی معلومات کو وسیع کیا اور ان کے تجربوں میں اضافہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے واپسی کے بعد مسلمانوں کی تعلیم وتربیت سے متعلق جو اسکیمیں بنائیں وہ ان کی وسیع النظری، عمیق مشاہدے اور روشن خیالی کی دلیل ہیں۔ سفر کے دوران ہی مولانا کا خیال سفر نامہ لکھنے کا تھا جس کا اظہار سرسید کے ایک خط میں کیا ہے لیکن وہ مصروفیت کے سبب ایسا نہ کرسکے۔ ان کے مشاہدات اور معلومات سے مستفید ہونے کے لیے لوگوں نے اس بات پر اصرار کیا کہ سفر نامہ لکھا جائے، لکھتے ہیں:

"سفر نامہ کے لیے عام اصرار ہے اور تمام اطراف سے مانگ آنی شروع ہوگئی ہے، لیکن میرا ارادہ ابھی تک لکھنے کا نہیں ہے، جس کے متعدد اسباب ہیں" (۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۲۳۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۳۸۔

اپنے ایک عزیز کو اس کام کے آغاز کی اطلاع دیتے ہیں کہ ”میں آج کل سفرنامہ لکھ رہاہوں“۔ لیکن مولانا کا سفرنامہ چھپا تو اس وقت انگریزوں اور ترکوں کے تعلقات انتہائی تلخ تھے، ترکی کے تعلق سے مسلمانوں نے مولانا کے سفرنامے کی بڑی قدر کی۔

”سفرنامہ“ ترکی کی یہ مقبولیت انگریزوں اور انگریز پرستوں کو کب گوارا ہوسکتی تھی، نتیجتاً بدگمانیوں نے دلوں میں جگہ کرلی اور ویسے بھی شبلی کو ”تمغۂ مجیدی“ کا ملنا بعض لوگوں کے لیے رشک وحسد کا باعث تھا، مختصر یہ کہ شبلی کی مخالفت شروع ہوگئی۔

اسی اثناء میں ان کی فارسی نظموں کا مجموعہ بھی شائع ہوا۔ ۲۶/ مارچ ۱۸۹۳ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

”میرا مجموعۂ نظم فارسی مطبع میں چھپنے کے لیے گیا اور امید ہے کہ جلد تیار ہوجائے گا، اخبار کے پرانے فائلوں اور بعض اور طریقوں سے جہاں تک ہوسکا، اشعار جمع کیے گئے جس کے محرک بلکہ جامع نواب سید علی حسن خاں فرزند نواب صدیق الحسن خاں مرحوم ہیں“۔(۱)

المامون اور النعمان کے بعد شبلی کی سب سے مشہور تصنیف ”الفاروق“ شائع ہوئی۔ شبلی کے بلاد اسلامیہ کے سفر کا ایک بڑا مقصد اس تصنیف کے لیے مواد جمع کرنا تھا۔ شبلی کا الفاروق لکھنے کا خیال ”النعمان“ سے پہلے تھا لیکن وہ ایسا نہ کرسکے۔ ۱۱/اپریل ۱۸۹۲ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”الفاروق ان شاء اللہ تعالیٰ لکھوں گا، لیکن وقت کی تعیین نہیں کرسکتا۔

۲۳/جون ۱۸۹۷ئ کے ایک خط سے یہ علم ہوتا ہے کہ الفاروق کی طباعت کا کام شروع ہوگیا تھا۔“ (۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۹۴۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۹۵۔

الفاروق تصنیف کرنے کا مقصد دنیا کو اسلام کے ایک بہت بڑے ہیرو کی سوانح سے واقف کروانا تھا۔ عمر فاروقؓ پر آج تک اس سے زیادہ مستند تصنیف کوئی کتاب نہیں۔ شبلی کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے صرف الفاروق ہی کافی ہے۔ فاروق اعظمؓ پر اور لوگوں نے بھی ضرور لکھا ہے لیکن اس مقام تک کوئی نہ پہونچ سکا۔ ایک مکتوب میں مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں:

"آج کل مصر میں سیرت الفاروق لکھی گئی، بڑا اہتمام کیا گیا،
مشہور مصنف (ا) نے لکھا لیکن دیکھا تو الفاروق کا عشر عشیر بھی نہ تھی،
اس پر خیال ہوا کہ الفاروق کا عربی میں ترجمہ کرا لیا جائے"۔(ا)

خود شبلی کو الفاروق اپنی ساری تصانیف میں بے حد پسند تھی۔ زمانہ کانپور کے ایڈیٹر کے موسومہ خط جنوری ۱۹۱۱ء میں شبلی اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی دوسری تصانیف الغزالی، علم الکلام اور موازنہ انیس ودبیر وغیرہ ہیں۔

۷/نومبر ۱۹۰۳ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں نے میر انیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے جو
ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوگا"۔(۲)

اس سے پہلے الغزالی چھپ چکی تھی، ۲۲/فروری ۱۹۰۲ء کو مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں:

"غزالی ختم ہوکر مطبع میں جاچکی، شاید سیرت النعمان کے لگ بھگ
ہوجائے، علم الکلام کی تاریخ لکھ رہا تھا، وہ قریب الختم ہے۔"(۳)

لیکن علم کلام سے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ مطمئن نہ تھے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں نے علم الکلام نہایت ناتمام کتاب لکھی اور وہ در حقیقت میری

(ا)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۱۳۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۰۷۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۰۔

تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے"۔(۱)

در حقیقت علم الکلام کی تصنیف کے وقت مولانا سخت بیمار تھے، اس کا بہت کچھ حصہ انھوں نے لیٹے لیٹے لکھا تھا۔اپنی ایک اور تصنیف مولانا روم کی سوانح عمری سے متعلق بذریعہ مکتوب مورخہ ۱۴/اگست ۱۹۰۶ءاطلاع دیتے ہیں کہ وہ اب تیار ہوچکی ہے، اس سے قبل کے ایک مکتوب میں حمید الدین کو لکھتے ہیں:

"تم نے ایک زمانہ میں مجھ سے کہا تھا کہ تم نے مثنوی مولوی روم غور سے پڑھی اور ان کے اصول اور پرنسپلز متعین کیے، اگر خیال میں ہو تو لکھ بھیجو"۔(۲)

غالباً سوانح لکھنے سے قبل وہ اس کو بھی ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔

مولانا شبلی نعمانی کی ایک اور تصنیف شعر العجم ہے، جب اس تصنیف کا آغاز کیا تو ۱۴/اپریل ۱۹۰۶ءکے ایک مکتوب میں لکھا:

"میں نے شعر العجم لکھنا شروع کر دیا اگرچہ سخت عدیم الفرصت ہوں"۔(۳)

اگست ۱۹۰۹ءکے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"شعر العجم میں صرف خواجہ حافظ کا حال چھپنا رہ گیا ہے اور وہ بھی قریب الانجاز ہے"۔(۴)

شعر العجم حقیقت میں فارسی شاعری کی ایک اچھی تاریخ ہے۔شعر العجم شروع کرنے سے قبل لکھتے ہیں:

"میں ایک کتاب شعر العجم لکھنی چاہتا ہوں، گو فرصت نہیں، لیکن بچپن سے آج تک کا مذاق ضائع کرنے کو جی نہیں چاہتا"۔(۵)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۲۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۷۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۲۲۔
(۴)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۲۸۔
(۵)مکاتیب شبلی جلددوم ،ص ۲۰۔

شبلی نے مولانا شروانی سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ دونوں مل کر شعر العجم لکھیں گے۔لکھتے ہیں:

> ”آپ کو مرغوب ہوتا تو فارسی شاعری کی تاریخ اور عہد بعہد کی خصوصیتیں اور ترقیاں لیجیے، ان تمام مضامین میں آپ کو اسسٹنٹی کا کام دے سکتا ہے، موادِ تحریر، عنوانات مضامین وغیرہ وغیرہ سب سامان مہیا کردوں گا، یہ بھی ممکن ہے کہ ہم آپ مل کر کوئی کتاب لکھیں اور ترکوں کی طرح وہ مرکب نام سے شائع ہو مثلاً حبیبِ شبلی“۔(۱)

افسوس کہ شبلی کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

شبلی نہ صرف خود تصنیفی کاموں میں مصروف رہتے بلکہ جس کسی کو تھوڑا بہت ایسے کاموں سے لگاؤ ہوتا اسے ترغیب دیتے۔اس نوعیت کے بعض خطوط پروفیسر عبد القادر، مولوی حمید الدین اور مولوی سید سلیمان ندوہ کے نام ہیں۔وقتاً فوقتاً وہ ان کو مشورہ دیا کرتے تھے اور بعض امور میں ان حضرات سے مشورہ لیا کرتے تھے۔سید سلیمان ندوی کو سیرتِ عائشہؓ لکھنے کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”حضرت عائشہؓ اور دیگر ازواج مطہرات کو ملاکر ایک مستقل کتاب لکھو اور وہ بھی شاملِ سیرت ہو اور مخصوص تمہارے نام سے ہو، اس کی اشاعت اور اس کا نفع بھی تم ہی سے متعلق ہوگا، البتہ یہ ضرور ہے کہ صاف شدہ مسودہ میں ایک نظر دیکھ لوں“۔(۲)

ایک اور مکتوب میں سیرتِ عائشہؓ جلد لکھنے کا تقاضا کرتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں:

> ”حضرت عائشہؓ کے متعلق میری خاص معلومات ہیں، میں تمہارا مسودہ دیکھتا تو رائے ظاہر کرسکتا“۔(۳)

علامہ شبلی چاہتے تھے کہ اپنے شاگردوں کی تصانیف بھی اسی پایہ اور معیار کی ہوں

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۱۱۶۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۹۶۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم ،ص ۹۶۔

جیسے کہ خود ان کی تھیں۔ لکھتے ہیں:

''ہاں اسلم جیراجپوری نے بھی توشاید حضرت عائشہؓ کی سوانح لکھی ہے، اس کو دیکھ لو کہ اس سے بہت الگ رہے، یا بہت آگے نکل جائے''۔(۱)

شبلی اپنے مکتوبات میں اکثر ہدایات دیتے رہے تاکہ لکھنے والے کی رہبری اور مدد ہوسکے۔

مولانا شبلی کی ایک اور تصنیف کا ذکر بھی کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو ''الانتقاد'' کے نام سے ۱۹۱۱ء میں منظر عام پر آئی اور جو عربی کے مشہور ادیب اور مورخ جرجی زیدان کی ''تمدن اسلام'' کا رد تھی۔ جرجی زیدان نے اسلام سے متعلق بعض باتیں ایسی لکھی تھیں جس سے مولانا جیسے سچے مسلمان کا دل بہت مجروح ہوا، لکھتے ہیں:

''میں خود قیاس نہیں کرسکتا تھا کہ جرجی یا کوئی شخص اس قدر جھوٹ بول سکتا ہے''۔(۲)

تمدن اسلام نے انگریزوں کو ضرور خوش کیا ہوگا کہ اس لیے پروفیسر ہارویز نے اس کو علی گڑھ کے نصاب میں شامل کرنے کی کوشش کی، اس سے متاثر ہوکر مولانا شبلی ابو الکلام آزاد کو لکھتے ہیں:

''تمدن اسلام (ا) کا ضرر بہت متعدی ہوا، یہاں تک کہ ڈاکٹر ہارویز پروفیسر علی گڑھ نے اپنی تحریری رائے یونیورسٹی میں بھیجی کہ امتحاناتِ فاضل وعالم میں وہ داخل درس کی جائے، مجھ پر اس کا سخت اثر ہوا اور میں نے سب کام چھوڑ کر اس کی دروغ بیانیوں پر ایک مضمون لکھنا شروع کیا، اس وقت تک ۲۰/ صفحے ہوچکے ہیں، عربی میں بھی لکھوں گا اور عربی اخبارات میں طبع کراؤں گا، لیکن اس کا تیسرا حصہ نہیں ہے، آپ کے پاس ہو تو بھیج دیجیے، پھر واپس

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۹۷۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۸۶۔

کر دوں گا"۔(۱)

چنانچہ یہ مضمون مصر کے المنار میں شائع ہوا اور بڑی تعریف ہوئی۔ شبلی لکھتے ہیں:

"جرجی زیدان کارد (پروف) بھیج دیا تھا، المنار نے بہت احسان مندی ظاہر کی کہ بڑا اہم کام انجام پایا، جس کی یہاں کے لوگوں کو ہمت نہیں ہوتی تھی"۔(۲)

الغرض یہ کہ علامہ شبلی نعمانی کی حیات کا بیشتر حصہ تصنیفی کاموں میں گزرا، ایسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں کہ ان کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔اس کے متعلق ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

"علامہ شبلی کی علمی جستجو حد انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور وہ ہمہ وقت تحقیقات وتدقیقات اور تصنیفات کے لیے کتابوں کی تلاش وجستجو میں سرگرداں رہتے۔اس لیے مکاتیب میں مختلف موضوعات کی سیکڑوں کتابوں کا ذکر ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو کے مکتوباتی ادب میں کسی ایک مکتوب نگار کے یہاں کتابوں سے اس قدر دلچسپی اور ان کا ذکر شاید ہی مل سکے"۔(۳)

اس لئے یہ کہہ دینا صحیح نہیں لگتا کہ "مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے نونی لگنی شروع ہوگئی" اس لیے کہ آج بھی غیر زبانوں اور غیر ملکوں کے ماہرین اور مختلف مکتب خیال کے لوگ شبلی کا اور ان کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہیں۔اور علمی دنیا میں علامہ شبلی کو سراہا بھی جاتا ہے۔علامہ شبلی نعمانی کے موضوعات میں ایک اہم موضوع سیرت نگاری کا بھی ہے، اس موضوع کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب شبلی اور سیرت النبیؐ کا ذکر ہوتاہے، ہیروز آف اسلام کی سوانح نگاری ہر عالم کے بس کی بات نہیں، علامہ شبلی نعمانی جیسا شخص ہی اس موضوع پر قلم اٹھا سکتا ہے، میرے مقالے کا اگلا ب "سیرت النبیؐ اور علامہ شبلی نعمانی" سے متعلق ہے۔

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۲۶۷۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص ۱۸۷۔

(۳) آثار شبلی، ازڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔دار المصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، طبع اول، جنوری ۲۰۱۳ء) ،ص ۲۰۶

سیرت النبیؐ اور علامہ شبلی

اس سے پہلے اوپر جن تصنیفات کا ذکر کیا گیا ان کے مطالعے کے بعد علامہ شبلی نعمانی کا درجہ تو بلند ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ آپ کا مرتبہ اس وقت بلند ہوتا ہے جب آپ اپنی سب سے اہم تصنیف سیرت النبیؐ لکھنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔اسلام کے بعض ناموروں کے حالات اور سوانح لکھنے کے بعد شبلی نے آخر میں سیرت رسالت مآبؐ لکھنے کا ارادہ کیا۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”سیرت النبیؐ بقدر امکان ہوتی جاتی ہے، یہ عمر بھر کا حاصل اور وسیلۂ نجات ہے۔

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہاہوں سیرتِ پیغمبر خاتمؐ
خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا (۱)

اس میں شک نہیں کہ سیرۃ النبیؐ کی تصنیف کا کام شبلی نے سب سے آخر میں شروع کیا، لیکن ان کے دل میں یہ خیال پہلے ہی پیدا ہوا تھا۔بلکہ انھوں نے کچھ لکھنا بھی شروع کر دیا تھا، لیکن وہ کام نا تمام رہا اور ان کی حسب خواہش نہ ہوسکا۔شبلی چاہتے تھے کہ جو بھی کام ہو وہ اونچے معیار پر ہو، عمدہ سے عمدہ ہو اور بلند پایہ ہو، غالباً اس وجہ سے وہ سیرۃ النبیؐ کے کام کا آغاز جلد نہ کرسکے۔یہ بات یقینی ہے کہ وہ اس اہم تصنیف کو نہایت بلند معیار پر پیش کرنا چاہتے تھے۔

آنحضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وعقیدت کس مسلمان کے دل میں

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۰۹)

نہیں۔ شبلی ۱۹/برس کی عمر میں حج وزیارت سے مشرف ہوئے، مدینہ منورہ کی حاضری نے دل میں عشق محمدیؐ کی آگ کو اور تیز کردیا تھا اس لیے ان کی یہ تمنا تھی کہ اس ارض مقدس کی طرف چلے جائیں جس کا اظہار بعض مکتوبات میں کیا ہے:

''بہت کچھ ارادہ ہجرت کا ہے۔اگر عرب پہنچ گیا تو تمام جھگڑوں سے نجات ہوجائے گی''۔(۱)

یہ علامہ شبلی کی آرزو تھی کہ اُس دار الامن میں پہنچ جائیں اور حبیب خدا کی قوموں کے قریب اپنی زندگی کے باقی دن گزار دیں لیکن اللہ تعالی کا منشا کچھ اور ہی تھا وہ اس مخالف ماحول میں شبلی سے بہت سارے کام لینا چاہتا تھا اور بڑی بات یہ کہ اپنے حبیب کی سیرت پاک لکھوانا مقصود تھی۔ شبلی کی کیا مجال کہ عدول حکمی کرتے۔ان کی غرض بھی یہی تھی کہ حضورؐ کے دربار میں کسی طرح حاضر رہیں۔ان کا جسم خاکی ہندوستان کی سرزمین پر تھا لیکن روح ارضِ مقدس میں آستانۂ پاک کے قریب تھی۔ وہ جو کچھ لکھتے جاتے تھے ان کی روشنائی اور قلم کی خوبی نہ تھی بلکہ شبلی کا دماغ اور شبلی کا دل اس نور پاک سے ایسا منور ہوگیا تھا کہ اس کی شعاعوں سے ان کا قلم بھی برقایا جا چکا تھا۔وہ سیرت پاک لکھنے میں محو ہوگئے اور شرپسندوں سے محفوظ ہوگئے۔لکھتے ہیں:

''بہرحال اب تو ایک دو برس، ان بدباطنوں سے نجات رہے گی، اور دربار رسالت کا آستانہ ہوگا''۔(۲)

۲۷/مئی ۱۹۰۳ء کے ایک خط سے جو مولوی حسین عطاء اللہ صاحب حیدر آبادی کے نام تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے سیرۃ پاک لکھنے کا آغاز کردیا تھا:

''میں نے جناب سرور کائنات علیہ الصلاۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنی شروع کی ہے، جو سعادت دارین کا ذریعہ ہے''۔(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۰۴۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۹۳

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۳۳۲ تا ۳۳۳۔

لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ اس انداز اور معیار پر نہ لکھ سکے جو وہ چاہتے تھے۔اس لیے یہ کام مکمل اور ناتمام رہ گیا۔مولانا سید سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق صرف ہجرت تک لکھا جاسکتا تھا اور وہ مسودہ اب بھی دار المصنفین میں موجود ہے۔چونکہ حسین عطاء اللہ صاحب کے پاس اچھا کتب خانہ تھا اس لیے شبلی نے اس سلسلے میں ان سے کچھ کتابیں مانگی تھیں جس کا علم اسی مکتوب سے ہوتا ہے۔شبلی اس زمانہ میں حیدر آباد میں تھے اور ان کا کتب خانہ اعظم گڑھ میں ، اس لیے بھی وہ اس کام کو جاری نہ رکھ سکے، لیکن انھوں نے اس ارادے ہی کو ختم نہ کردیا بلکہ وہ مناسب وقت اور موقع کے متلاشی تھے۔سیرۃ النبیؐ کی اہمیت ان کے پیش نظر تھی۔وہ دیکھ رہے تھے کہ مغربی تعلیم کے اثرات قوم کو مذہب سے بے گانہ کرتے جارہے ہیں۔فرنگی پروپیگنڈہ نے محمد رسول اللہؐ کو دنیا کی دیگر شخصیتوں کی طرح صرف ایک بڑی شخصیت سمجھنے پر مجبور کردیا تھا۔ مسلمان حضورؐ کی تعلیمات سے دور ہوتے جارہے تھے۔ان کے سامنے کوئی کتاب رسول مقبولؐ سے متعلق آتی تو انگریزی میں آتی اور اس میں تعصب کی جھلک ضرور ہوتی یا پھر اردو میں ایسی کتابیں تھیں جن سے طبیعت سیر نہ ہوتی۔شبلی کو رہ رہ کر یہ بات کھٹکتی تھی کہ اردو میں سیرۃ پاک سے متعلق کوئی جامع اور مستند کتاب نہیں۔دیگر اکابر نے بھی شبلی کی توجہ اس طرف منعطف کی اور خود شبلی کے اس ارادے میں استحکام پیدا ہوگیا اور انھوں نے اس کو علمی صورت دینے کا تہیہ کرلیا۔ ۱۹۱۲ءکے آغاز کے ساتھ ہی سیرۃ نبوی کے کام کا بھی آغاز ہوگیا۔شبلی مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

> ”سیرۃ نبویؐ کا شروع سال سے عزم ہے لیکن پچاس ہزار سرمایہ کی ضرورت ہے، کیا قوم سے یہ امید ہوسکتی ہے“۔(۱)

شبلی ہر کام باقاعدگی سے کرتے تھے، انھوں نے اس خصوص میں ایک اسکیم بنائی اور اس کے مصارف کا تخمینہ لگایا۔سیرۃ النبیؐ لکھنے کا شبلی نے جونہی قصد کیا ہر طرف سے اس تحریک کو خوش آمدید کہا گیا۔الندوہ میں اعلان شائع ہوا اور ایک مجلس تالیف کے قیام کی تجویز ہوئی۔اس مبارک کام کے لیے پچاس ہزار روپیہ کے سرمایہ کا جمع ہوجانا کوئی مشکل بات نہیں تھی، لیکن والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم نے اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ وہ تنہا اس

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۸۶۔

خصوص میں امداد دیں گی۔ غالباً مولانا شبلی نے امداد کے لیے خود درخواست بھی دی تھی یا پھر درخواست دینے کے لیے ان سے کہا گیا تھا، اس کا علم محمد امین زبیری کے نام ایک خط سے ہوتا ہے:

"ریاست کے عطیہ کی درخواست تو کی، لیکن اب قبول کرتے ایک بڑا بار محسوس کرتا ہوں"۔(۱)

لیکن شبلی کے پیش نظر چونکہ ایک اہم کام تھا اس لیے انھوں نے امداد قبول کرنے میں پس وپیش نہ کیا ورنہ اس سے ان کی ذات کو فائدہ پہنچنا مقصود ہوتا تو کبھی بھی قبول نہ کرتے۔ بہرحال والیۂ بھوپال کی مالی ہمدردیوں نے شبلی کو بڑی حد تک مطمئن کردیا کہ وہ انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوجائیں۔ لکھنؤ میں رہتے ہوئے ندوہ کے جھگڑوں کے سبب وہ پر اطمینان طریقے پر کام نہیں کرسکتے تھے اس لیے ارادہ تھا کہ بمبئی رہ کر اس کام کو انجام دیں۔ لکھتے ہیں:

"میرا ارادہ ہے کہ مستقل بمبئی میں قیام کرکے سیرت کو ختم کردوں، یہاں روز ایک قصہ رہتا ہے اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا، اسٹاف ساتھ لے جاؤں گا، سید سلیمان ساتھ رہیں گے، خوشنویس اور انگریزی مترجم وغیرہ بھی"۔(۲)

سیرت کے سلسلے میں ہر طرف سے امداد دی جانے لگی لیکن غالباً سلطان جہاں بیگم کی یہ خواہش تھی کہ یہ سعادت صرف ان ہی کے حصے میں آئے اس لیے شبلی نے دوسرے عطیوں کو واپس کردیا، لکھتے ہیں:

"ماہواری چندے اور یک مشت رقمیں بہت سی آئیں، میں نے سب واپس کردیں، لوگوں کو شکایت ہے کہ اس سعادت میں ہم کو کیوں موقع نہیں دیا جاسکتا"۔(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۲۶۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ،ص ۲۲۸۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص۱۲۸

بہر حال شبلی نے اسٹاف کا تقرر کرلیا اور سیرۃ النبیؐ لکھنا شروع کردی۔اس غرض سے ان کو کافی مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ انگریزی کے علاوہ مختلف زبانوں کی کتابوں سے بھی استفادہ ضروری تھا۔انگریزی سے وہ اتنے واقف نہ تھے کہ پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے، اس غرض سے ان کو مترجم رکھنے پڑے۔ پیر سے تو معذور تھے ہی آنکھ نے بھی ستانا شروع کردیا۔ان تمام رکاوٹوں کے باوجود وہ کام کرتے رہے، ایک مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

> ”بقدر ہمت کام کر رہا ہوں، آنکھ کی معذوری کا بہت اثر ہے، خود لکھ نہیں سکتا بلکہ لکھواتا ہوں اور اس کی کبھی مشق نہ تھی، البتہ کتابوں کا مطالعہ اب تک کرسکتا ہوں، یوروپین مورخوں کی تصنیفات کشت زعفران نظر آتی ہیں، سیکڑوں ہوائی قلعے بنائے ہیں تمام انگریزی کتابیں خرید لی ہیں، ایک بی۔اے کو جو ایم۔اے ہیں، میں زادِ راہ بھیج دیا ہے، کل پرسوں تک آجائیں گے“۔(۱)

اسی مکتوب میں سرکار بھوپال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”ان کے صاحبزادے کے دو ہزار روپیہ بابت خریداری کتب آگئے“۔(۲)

سیرۃ النبیؐ کے متعلق علامہ شبلی نعمانی نے انگریزی کتابیں تو خرید لی تھیں لیکن ان سب کا ترجمہ کروانا ممکن نہ تھا اس کے لیے تو ایک بڑے پیمانے پر دار الترجمہ کے قیام کی ضرورت تھی، اس لیے شبلی نے مناسب یہ خیال کیا کہ ان احباب کے پاس جو عالم وبا ذوق ہوں ایک کتاب بھیج دی جائے تاکہ وہ پڑھ کر اہم مقامات پر نشان لگاتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تاکہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جاسکے۔اس بات میں کئی مقاصد پنہاں تھے اور کئی فوائد۔سب سے بڑی بات یہ کہ اس طرح یہ کام تقسیم کار کے اصول پر آسان ہوجاتا، وقت ضائع نہ ہوتا، دوسرے یہ کہ لوگ جبراً ہی سہی مطالعہ پر مجبور ہوتے۔ مختلف اشخاص مختلف زاویۂ خیال سے کتابوں کا مطالعہ کرتے اور نشان لگاتے جاتے، جس سے

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۹۰۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۹۱۔

شبلی کو اپنے کام میں بڑی مدد ملتی، اس طرح انگریزی کتابوں کا زیادہ سے زیادہ مواد سامنے آتا تو ان کے بیانات اور اعتراضات کا وہ پوری طرح جواب دے سکتے۔ اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''سیرت النبیؐ جو زیر تصنیف ہے، میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لکھا ہے اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت الزامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں نہایت زور وقوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے''۔(۱)

اس غرض سے شبلی کو جتنا وسیع مطالعہ کرنا پڑا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ وہ سیرت کو محدود رکھنا نہ چاہتے تھے۔ اس کو ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت دینے کا مقصد رکھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

> ''چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب سیرت میں آجائیں یعنی تمام مسائل مہمات پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا ہو اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا، گو لمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا''۔(۲)

نامساعد حالات وقت کی تنگی اور طبیعت کی خرابی نے شبلی کی اسکیم کو اپنے حقیقی روپ میں پیش ہونے نہ دیا لیکن اس کے باوجود جو کام ہورہا تھا وہ غیر معمولی ہی کہا جاسکتا تھا۔ محمد امین زبیری کو اطلاع دیتے ہیں کہ:

> ''سیرت کے سو صفحے ہوچکے تھے، لیکن نظر ثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہوگیا، یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے، ان کے ایک ایک حرف کے لیے سیکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں، یہ کمبخت لکھتے تو جھوٹ ہیں لیکن بے پتہ نہیں لکھتے۔

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۱۹۲۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص۱۹۳۔

یہاں ہمارے سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں"۔(۱)

ہمارے سیرت نگاروں کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے شبلی کو زیادہ محتاط اور مستند انداز میں لکھنا پڑا اس لیے وہ تیز رفتاری سے نہ لکھ سکے۔ بھوپال کی امداد صرف دو سال کے لیے تھی اور شبلی جس انداز پر کام کرنا چاہتے تھے وہ دو برس میں کسی طرح بھی تکمیل نہیں پاسکتا تھا۔ لیکن وہ اس بات سے گھبراتے نہیں کہ بھوپال کی امداد بند ہوجائے گی ان کے پاس جوش اور جذبہ تھا اور ارادے میں استحکام، ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا، یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کردیں، لیکن اب روپیہ کا نہیں بلکہ میری جان کا معاملہ ہے، ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی"۔(۲)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"سیرت چل رہی ہے، اب نظر آتا ہے کہ واقعی ایک ایسی تصنیف کی سخت ضرورت تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میں پورا کرسکوں گا یا نہیں"۔(۳)

شبلی کو اپنی ذات پر بھروسہ تھا، اپنی تصنیفوں کی برتری کا احساس تھا کہ لیکن اگر کسی سے معقول مشورہ ملتا تو وہ ضرور قبول کرتے بلکہ دوسروں سے وہ خواہش کرتے کہ مدد دیں، مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

"سیرت کو چاہتا تھا کہ آپ کی نظر سے مسودہ گذر جاتا، لیکن کوئی تدبیر خیال میں نہیں آتی، اردو کا ٹائپ رائٹر نہیں، ورنہ دو تین کاپیاں ہوجایا کرتیں"۔

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۳۰۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول: ص۲۳۱۔

(۳)مکاتیب جلد دوم: ص ۱۳۴

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"پہلی جلد کا نصف حصہ گو یا تیار ہے، ہر ہفتہ میں دو تین روز طبیعت ناساز ہوجاتی ہے، اس لیے ناغہ سے حرج ہوجاتا ہے، بڑے بڑے معرکے طے ہوئے، اس فن کو نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت تھی، مجھ کو خود خیال نہ تھا کہ ایسی کامیابی ہوگی، لیکن قدر کون کرے گا، کوئی شخص پہلے طبری وابن الاثیر کو چھان چکاہو، تب اندازہ کرسکتا ہے"۔(۱)

وہ وقتاً فوقتاً مولوی حمید الدین اور سید سلیمان سے بھی استفسار کرتے جاتے تھے۔ مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں:

"میں اب سیرت ابتدا سے اس طرح لکھ رہاہوں کہ مکمل ہوتی جاتی ہے اور ساتھ ہی مطبع میں دے دی جائے، لیکن اس ترتیب میں بعض جگہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور بعض مباحث ایسے پیش آجاتے ہیں کہ تم سے استفسار وتحقیق کی ضرورت پیش آتی ہے"۔(۲)

وہ اس طرح دوسروں کو تربیت بھی دیتے جاتے اور کام کرنے کے انداز بھی سکھلاتے تھے۔سید سلیمان کو لکھتے ہیں:

"سیرت کے متعلق جو عام امور ذہن میں آئیں یعنی کن کن امور پر زیادہ توجہ کی جائے وغیرہ وغیرہ، ان کو وقتاً فوقتاً جب جو بات ذہن میں آئے لکھ بھیجا کرو"۔(۳)

ان کا جی تو چاہتا تھا کہ تفریح بھی کریں لیکن کام کو فوقیت پر رکھتے تھے۔ابو الکلام آزاد نے کلکتہ آنے کی دعوت دی تھی اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول: ص ۱۹۶۔

(۲)مکاتیب شبلی دوم: ص ۳۵۔

(۳)مکاتیب شبلی دوم: ص ۷۷۔

> ”کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے، لیکن کیا کروں سیرۃ کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں کہاں لیے پھروں“۔(۱)

ایک اور خط میں ابو الکلام آزاد کو لکھتے ہیں:

> ”سیرت کی وجہ سے میری نقل وحرکت سخت مشکل ہوگئی ہے، ہر جگہ ایک اونٹ کتابیں لاد کر لے جانی پڑتی ہیں“۔(۲)

لیکن نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کی خواہش پر وہ حیدر آباد گئے تاکہ ان کو ترجمۂ قرآن مجید کے متعلق مشورہ دے سکیں۔ مولانا کے مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ عماد الملک پندرہ پارے مکمل کرچکے تھے اور وہ روزانہ کام کرتے تھے۔ حیدر آباد پہونچ کر شبلی اپنے کام سے غافل نہیں ہوگئے بلکہ بعض مفید کتابیں جو وہاں ان کے ہاتھ آئیں ان سے استفادہ کیا جس کا اظہار ایک اور مکتوب سے ہوتا ہے۔

> ” یہاں سیرت کے متعلق بعض اچھی کتابیں ہاتھ آئیں، ہاں مطبوعات یورپ یہاں اکثر ملتی ہیں“۔(۳)

یورپ کی مطبوعات کا مطالعہ کرتے جاتے تھے اور غلط بیانیوں کی تردید لکھتے جاتے تھے۔ ایک خط میں سید نواب علی پروفیسر بڑودہ کالج کو لکھتے ہیں:

> ”سیرت کے متعلق یورپ کی غلط کاریوں کا تعجب نہیں جب کہ خود اسلامی مورخین اور اربابِ روایت نے سیکڑوں غلطیاں کی ہیں، مجھ کو تاریخ نہیں بلکہ عدالت کا فیصلہ لکھنا پڑتا ہے، لیکن انداز بیان تاریخی ہوتا ہے، ورنہ بے لطف ہوجائے“۔(۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول:ص ۲۷۰۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۷۲۔

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۷۱۔

(۴)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۹۸ تا ۲۹۹۔

بہرحال ۱۳؍اکتوبر ۱۹۱۳ء کو جو خط محمد امین زبیری کو لکھا اس کا اقتباس یہ ہے:

"کتاب کا پہلا حصہ جس میں سادہ حالاتِ زندگی ہیں، قریباً تیار ہوگیا ہے، اگرچہ اس میں بھی نہایت کد وکاوش اور تمام کتب حدیث ورجال کی چھان بین کرنی پڑی، تاہم اصلی مرحلے آگے ہیں، کتاب پانچ جلدوں میں ہوگی، جو حصہ گو تیار ہے وہ قریباً ۵۰۰؍صفحوں میں ہے، پوری کتاب کو اس کا چوگنا کرلیجیے"۔(۱)

جہاں تک خیال کیا جاتا ہے کہ پہلی جلد حیدر آباد کے قیام میں تکمیل پا رہی تھی جیسا کہ ان کا ارادہ تھا۔لکھتے ہیں:

"اب یہاں طبیعت درست ہوچلی ہے اور ہر روز کام کرلیتا ہوں، گو زیادہ نہیں کرسکتا، غرض یہ ہے کہ ارادہ یہ ہوگیا ہے کہ پہلی جلد ختم کرکے یہاں سے اٹھوں، اسٹاف بھی یہیں بلا لیا ہے، سید سلیمان کو بھی بلایا ہے اور انگریزی مترجم بھی"۔(۲)

یہ جواب ہے مولوی حمید الدین صاحب کے خط کا، جنھوں نے مولانا سے لکھنؤ آجانے کی خواہش کی تھی۔ان کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہاں کے کاموں کو ان کے آنے تک اٹھا نہ رکھا جائے۔اس لیے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے اور جمنے میں وقت لگتا ہے۔اور وہ اپنا سارا وقت سیرت ہی پر صرف کرنا چاہتے تھے۔اس لیے لکھتے ہیں:

"بھائی سیرت سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے"۔(۳)

مولوی مسعود علی ندوی کے نام ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول:ص ۲۳۴ تا ۲۳۵۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۴۲۔

(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۴۲۔

''ایک نہایت ضروری لیکن پر کیف خدمت میں مصروف ہوں، (سیرت نبویؐ) وہ جس قدر زیادہ ختم کے قریب آتی جاتی ہے ذوق بڑھتا جاتا ہے،اس لیے اکثر یہ ارادہ ہوتا ہے کہ پہلی جلد تمام کرکے یہاں سے نکلوں، وہاں یہ یکسوئی کہاں، لیکن بظاہر پہلے آنا پڑے گا، اس غرض سے کہ بعض امور میں میاں حمید سے مشورہ رہ سکے''۔(۱)

سیرت کا جب کچھ حصہ تکمیل پاگیا تو انھیں اس کی طباعت کی فکر ہوئی سخت متردد تھے کہ کہاں بھیجیں چھاپنے والوں پر اعتماد نہ تھا اور ٹائپ سے متعلق انھیں شبہہ تھا کہ لوگ پسند نہ کریں گے۔ سید سلیمان اور دیگر اصحاب سے اس متعلق مشورہ بھی کرتے ہیں۔ سید سلیمان نے غالباً ٹائپ کی موافقت میں لکھا تھا اس لیے لکھتے ہیں:

''میں تو ٹائپ کے بارہ میں تم سے متفق ہوں لیکن عام پبلک تو اب تک چشم آشنا نہیں، مولوی ابوالکلام صاحب سے کہو کہ چھپائی کا بہتر سے بہتر نمونہ، بہتر سے بہتر کاغذ پر ایک صفحہ چھپوادیں''۔ (۲)

معلوم ہوتا ہے کہ شبلی خود ٹائپ کی موافقت میں تھے۔ان کا ارادہ تھا کہ پچاس صفحے نہایت عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں چھپوائیں اور اس کی جلد بھی بنوادی جائے تاکہ یہ اندازہ ہوجائے کہ ٹائپ بھی چل سکتا ہے ورنہ تو لیتھو ہی میں چھپوانے کا قصد تھا۔سیرت کی طباعت سے متعلق مولانا شروانی کو بھی لکھتے ہیں:

''سیرت کے چھپنے کا مرحلہ پیش ہے، الہلال میں چار صفحے نمونہ کے لیے چھپوائے بہت عمدہ چھپا، لیکن لوگ ٹائپ کو بالکل پسند نہیں کرتے، لطف یہ کہ انگریزی خواں بھی''۔(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۰۲ تا ۱۰۳۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۸۳۔

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۰۰۔

اسی مکتوب میں ایک اور خیال کا اظہار کرتے ہیں:

"عرب کے قدیم خطوط، دو ہزار برس قبل اسلام، حمیری اور
نابتی خطوط جو کھنڈروں میں ملے، ان کے فوٹو منگوا لیے ہیں، سیرت میں
شامل ہوں گے"۔

غرض یہ کہ مولانا شبلی سیرت کے لکھنے میں ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف تھے۔ جنوری ۱۹۱۲ئ سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک باوجود مزاحمتوں کے کام کرتے رہے۔ بھوپال کی امداد صرف دو سال کے لیے تھی، لیکن والیۂ بھوپال نے جو خود بھی علم دوست اور با ذوق تھیں اس امداد میں توسیع کردی۔ شبلی اس سے بڑے خوش ہوگئے اور محمد امین زبیری کو لکھا کہ:

"حضور سرکار عالیہ لکھنؤ تشریف لائیں گی تو ان کا نہایت پر شان
استقبال اہل شہر اور ندوہ کی طرف سے ہونا چاہیے"۔(۱)

اسی مکتوب میں مندرجہ ذیل اشعار بھی لکھ بھیجے:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر فیضِ سلطانِ جہاں بیگم زر افشاں ہے
وہی تالیف وتنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر مرا دل ہے، مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے، ایک سلطاں ہے

دیکھا جائے تو ان کو ذات خداوندی پر اتنا بھروسہ تھا کہ بھوپال کی امداد کی چنداں فکر نہ تھی، جب امداد کی مدت ختم ہونے لگی تو لکھتے ہیں:

"معلوم نہیں بھوپال اس کے بعد اضافہ کرتا ہے یا نہیں، خیر ایسی
باتیں مہمات میں سد راہ نہیں ہوسکتیں لیکن عزم وثبات درکار ہے"۔(۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۳۹۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم:ص ۱۰۴۔

اس خط کے جملے سے شبلی کی فطرت کا ایک جوہر سامنے ابھر کر آتا ہے وہ ہے عزم وثبات، حوصلہ، انھوں نے علمی طور پر واقعی ہر موقع پر اپنے عزم وثبات کا بہترین ثبوت دیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ بھی شبلی کے مقابلے میں آسانی سے ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔جب سیرت کے ابتدائی اوراق چھپ کر منظر عام پر آئے تو مخالفین نے بھی قدم آگے بڑھائے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ منتظر ہی بیٹھے تھے اور بھوپال کی امداد میں توسیع نے تو ان کے لیے آگ پر تیل کا کام کیا۔اعتراضوں کے تیر چلائے جانے لگے، جن سے صاف یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ذاتی اختلاف اور حسد اس کا سبب ہے۔شبلی کے لیے کفر کے فتوے جاری ہوئے اور بھوپال بھیجے گئے کہ کسی طرح یہ امداد بند ہوجائے۔شبلی سے غالباً والیۂ بھوپال نے امین زبیر کے توسعاً یہ خواہش کی کہ شبلی ان اعتراضات کا جواب لکھیں۔شبلی نے امین زبیری کو جواب میں لکھا:

"اعتراضات کا جواب میں کہہ چکا (۱)، نہایت مہمل اور محض معاندانہ اعتراضات تھے"۔(۱)

شبلی کی طبیعت کے خلاف تھا کہ ہر اعتراض کا جواب دیں۔وہ اسے کسر شان سمجھتے ہوں گے۔امین زبیری نے یہ بھی خواہش کی تھی کہ وہ خود بھوپال تشریف لائیں تاکہ معاملات کی یکسوئی ہوجائے لیکن یہ بات بھی ان کو ناگوار ہوئی۔جواب میں لکھتے ہیں:

"میں بارش کے قبل نہیں آسکتا بہت ضرورت ہو تو ایک دو دن کے لیے آجاؤں، لیکن اگر اسی درجہ کے لوگوں کے لکھنے پر میری داروگیر ہوتی رہے گی تو میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اعانت سے مستعفی ہوجاؤں"۔(۲)

شبلی نعمانی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اگر کوئی مستند عالم ان کے مسودہ کی نظر ثانی کرلے تو وہ اس پر بھی رضامند ہیں۔انھوں نے ابتدائی اوراق میں بھی کچھ رد وبدل کردیا جن پر اعتراضات کیے گئے تھے۔لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۴۴۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۲۴۴

"اگرچہ اعتراضات میں اعلانیہ خیانت کی ہے یعنی عبارت جو نقل
کی ہے اس کے الفاظ تک بدل دیئے ہیں اور اکثر اعتراضات محض غلط
تعبیری پر مبنی ہیں"۔(۱)

ان تمام الجھنوں کے باوجود شبلی کام میں مصروف رہے، اس مکتوب کے آخر میں لکھتے
ہیں:

"یہاں کام نہایت سکون اور اطمینان سے ہورہا ہے، ارادہ تو یہ
ہے کہ اب بغیر تکمیل کتاب یہاں سے نہ ٹلوں"۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ بمبئی میں رہ کر نہایت سکون کے ساتھ کام کرسکتے تھے۔لکھتے
ہیں :

"بمبئی میں سارا دن کام کے لیے ملتا ہے، دن بھر کو ئی جھانکتا
نہیں، اس لیے برس دن تک یہاں سے ٹلنے کا ارادہ نہیں"۔(۲)

یہی بات مولانا شروانی کو بھی لکھی۔

"تسلیم! سیرت کے اتمام کے لیے یہیں (ا) کی خاموشی اور
سکون درکار ہے، دن بھر کوئی جھانکتا نہیں"۔(۳)

شبلی کی یہ تجویز کہ کوئی مستند عالم مسودہ دیکھے مخالفین کو کب منظور تھی۔ شبلی کے
ایک مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ جب مولوی عبید اللہ سندھی مسودہ لے کر دیوبند پہونچے کہ
مولوی محمود حسن کو دکھلائیں تو وہاں کے مولویوں نے محمود حسن کو ایسا کرنے سے باز رکھا
اور عبید اللہ کو کافر ٹھہرایا۔والیۂ بھوپال کے سکریٹری محمد امین زبیری کو لکھتے ہیں:

"میں جس تحقیق وتدقیق سے سیرت لکھ رہا ہوں ناممکن تھا کہ
مولوی محمود حسن صاحب اس کو دیکھتے اور تحسین نہ کرتے، لیکن
مخالفوں نے ان کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سرے سے دیکھنے ہی سے انکار

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۴۵۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول: ص ۲۴۶۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۰۲۔

کردیں۔البتہ مولوی عبید اللہ سندھی مسودہ دیکھ رہے ہیں، ان کی رائے
آجائے گی تو بھیج دوں گا، مولوی عبید اللہ ٹونکی پر اگر اطمینان ہو تو ان
کے پاس بھیج دوں یا جو مصلحت ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ سردست اس
قصہ ہی کو خاموش چھوڑ دیا جائے"۔(۱)

شبلی اپنے کام میں منہمک رہے اور ان مخالفتوں اور اعتراضوں کے باوجود وہ پست ہمت نہیں ہوگئے، لیکن ان پر ایک ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی اور ان کے بھائی محمد اسحاق کا انتقال ہوگیا۔اب شبلی مجبور تھے کہ بمبئی کو چھوڑکر پھر اعظم گڑھ چلے جائیں۔محمد اسحاق کی وفات نے ان کی ہمتوں کو پست کردیا۔لکھتے ہیں:

"میں اب بالکل دل شکستہ ہوگیا ہوں، برادرم اسحاق کی وفات
نے دل بٹھا دیا ہے"۔(۲)

آگے لکھتے ہیں:

"سیرت کا کام جاری ہے، گو تاخیر طبع سے طبیعت اچھی طرح آگے
نہیں بڑھتی"

شبلی نے اس حادثہ کے باوجود سیرت کے کام کو روک نہیں دیا لیکن جب دل ودماغ ہی متاثر ہو تو تازہ توانا آدمی بھی مجبور ہوجاتا ہے، شبلی تو پھر بیمار ہی تھے اس پر کمزور بھی اور معذور بھی، اور پھر دنیا بھر کی فکروں اور الجھنوں میں گرفتار۔سیرت کے کام کو تمام کرنے کی تمنا تھی "سیرت پر خاتمہ ہوجائے تو یہ حسن خاتمہ ہے"۔لیکن آخر زمانے میں بالکل ناامید ہوگئے تھے، انھیں یقین ہوگیا تھا کہ سیرت اب مکمل نہ ہوسکے گی غالباً انھیں اپنی مدت قریب نظر آرہی تھی۔مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں:

"افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہوسکی"۔(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۴۸۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۲۔
(۳)مکاتیب شبلی جلددوم:ص ۴۷۔

انتقال سے ایک ماہ قبل شبلی نے یہ لکھا تھا اور اس کے چند روز بعد ہی انھیں مرض الموت نے آگھیرا، سیرت کی نا تمامی کی خلش دل میں رہ گئی، موت سے پہلے بھی انھیں سیرت ہی کی رٹ تھی، انتقال سے تین روز قبل مولوی حمید الدین، مولوی ابو الکلام اور مولوی سید سلیمان کو تار کروایا، مولوی ابو الکلام کو جو تار بھیجا گیا وہ مکاتیب میں شامل ہے :

> "اگر آپ (۱) اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبویؐ کی اسکیم کا
> کچھ انتظام ہوجاتا ورنہ سب کارروائی بیکار ہوجائے گی، سید سلیمان اگر
> موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا"۔(۱)

۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی روح پرواز کرگئی لیکن جس کو سرور کائنات کی ذات پاک سے محبت اور عقیدت ہے وہ علامہ شبلی نعمانی کو بھی ضرور جانتا ہے اور ان کی قدر کرتا ہے۔ شبلی نعمانی کا نام سیرۃ النبیؐ کے ساتھ زندہ جاوید ہوگیا۔حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ کارنامہ ان کی "عمر بھر کا حاصل اور وسیلۂ نجات ہے"۔اس موضوع کی اہمیت پر بحث کرنے کے بعد علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کا ایک بہت ہی اہم باب "دار المصنّفین اور شبلی" بھی ہے، اس موضوع کا بھی شبلی کے مکتوبات کی روشنی میں جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ دارالمصنّفین کے متعلق ان کے عزائم وافکار ایک نظر میں سامنے آجائیں اور اس سے ان کا تعلق واضح ہوجائے۔

دار المصنّفین اور شبلی

علامہ شبلی کو یہ افسوس رہا کہ وہ سیرت نبویؐ کا کام مکمل نہ کرسکے، لیکن انھوں نے اپنے شاگردوں کی ایسی تربیت کی تھی اور کام کرنے کے ایسے ڈھنگ سکھائے تھے کہ انھوں نے خود کو شبلی کا حقیقی جانشین ثابت کیا۔شبلی سیرت کے کام کو وسعت دینا چاہتے تھے، اپنے خیالات کا اظہار مولانا ابو الکلام کے ایک مکتوب میں یوں کرتے ہیں:

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول: ص ۲۷۵۔

"چاہوں تو خود سیرت کو ایک مقصد مستقل قرار دوں یعنی ایک اکاڈیمی قائم ہو، سیرت کے متعلق تمام نادر تصانیف جمع کی جائیں، لوگوں کو وظائف بطور فیلوشپ کے دیئے جائیں کہ سیرت کی اسٹڈی کریں اور خاص اس فن میں ماہر بنیں اور سیرت پر تقریر وتحریر کریں وغیرہ وغیرہ"۔(۱)

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی کے پیش نظر ایک بڑی اسکیم تھی، وہ چاہتے تھے کہ اہلِ قلم اور اہل ذوق کے لیے ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جہاں جمع ہوکر وہ صحیح معنوں میں کچھ ریسرچ کا کام کریں۔وہ اس نوعیت کی انجمن کی ابتداء سیرت ہی کے مبارک کام سے چاہتے تھے، چنانچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں:

"بہرحال یہ طے ہوجائے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں، ان شاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے، ہندوستان میں اور ہر کام کے لیے انجمنیں ہیں لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے اور یہ سب سے بڑا اہم کام ہے، ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے"۔(۲)

شبلی کے ذہن میں جو بھی تجویز آتی اور اسکیم بنتی وہ بڑی ٹھوس اور افادیت کی حامل ہوتی۔ اس دائرۃ التالیف نے انجمن دار المصنفین کی شکل اختیار کی اور تصنیفی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔کسی خیال کو عملی صورت دینے سے قبل وہ اپنے احباب اور مخلص دوستوں کے سامنے اس کا اظہار بھی کردیتے تھے، تاکہ ان کے خیالات اور مفید مشوروں کی مدد سے اپنے کاموں کو آگے بڑھا سکیں۔جب ندوہ کے مخالفوں سے وہ تنگ آگئے تو ان کے ذہن میں ایک اور ادارہ کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی۔مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں:

"ندوہ میں لوگ کام کرنے نہیں دیتے تو اور کوئی دائرۂ عمل بنانا چاہیے،

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۷۴۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۳۶۔

ہم سب کو وہیں بود وباش کرنی چاہیے، ایک معقول کتب خانہ بھی وہاں
جمع ہونا چاہیے اگر تم بہ عزم جزم آمادہ ہو تو میں موجود ہوں"۔(۱)

سید سلیمان ندوی کے نام ایک مکتوب میں بھی اس اسکیم کا ذکر کرتے ہیں اور ان کو متوجہ کرتے ہیں کہ وہ ایک اسکیم تیار کریں اور اس کے مختلف کام آپس میں تقسیم کرلیں، اس سلسلے میں ابو الکلام سے بھی مشورہ کیا گیا تھا۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :

"اصل غرض قابل اشخاص کا تیار کرنا ہے، اس لیے میں خود
دوچار قابل طلبہ اپنے پاس رکھوں اور ان کو کسی کسی فن میں تیار کروں،
اور صحیح مذاق ان میں پیدا کرایا جائے، ان کے مصارف کا تکفل بھی
(جن کو ضرورت ہو) میرے ذمہ ہو گا"۔(۲)

اسی طرح شبلی نئی پود کی تربیت چاہتے تھے ان کے پاس اس کام کی بہت اہمیت تھی اس لیے لکھتے ہیں:

"یہ میرا اخیر کام اور زمرۂ مصنفین کی دائمی خدمت ہے"۔(۳)

انھوں نے اپنی اس تجویز کو "الہلال" کے ذریعہ لوگوں تک پہونچایا، ظاہر ہے کہ ہر علم دوست شخص نے اس تجویز کو پسند کیا ہو گا۔

شبلی کو جن پر بھروسہ تھا یا وہ دیکھتے تھے کہ جن میں اس قسم کے کام کرنے کا ذوق ہے، ان سب کو انھوں نے فرداً فرداً اپنے خیال سے مطلع کیا، تاکہ ایسے سارے لوگ یکجا ہوں۔دیکھا جائے تو یہ اتنی صحت مند اسکیم تھی کہ اگر شبلی کچھ مدت اور زندہ رہ جاتے تو پتہ نہیں وہ دار المصنّفین کوکیا سے کیا بنا دیتے۔وہ دار المصنّفین میں ایک عالیشان کتب خانہ دیکھنا چاہتے تھے جس میں نادر اور بیش بہا تصانیف ہوں اور تمام ہندوستان کے مصنّفین اور اہل قلم اس سے فائدہ اٹھائیں۔الفاروق لکھنے میں شبلی کو بڑی تگ ودو کرنی پڑی

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۴۱۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۹۴۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۶۶۔

تھی، نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر اور ترکی کے کتب خانوں کی بھی چھان بین کرنی پڑی اور زحمتوں کا سامنا رہا۔ شبلی کو اس کا پوری طرح احساس تھا، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ایک عالیشان کتب خانہ ایسا ہو جس سے تصنیفی ذوق رکھنے والے مستفید ہوسکیں اور وہیں بیٹھ کر تصنیفی اور تالیفی کاموں میں مصروف ہوجائیں تاکہ ''زیادہ سے زیادہ ٹھوس اور مستند سے مستند تصنیف منظر عام پر آئے اور قوم فائدہ اٹھائے''۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ایسا مرکز کہاں قائم ہو، شبلی کی تو عین خواہش یہ تھی کہ ندوہ ہی میں یہ تحریک پھلے پھولے لیکن تنگ خیال اور متعصب لوگوں کو یہ بات کیسے پسند آسکتی تھی کہ شبلی کی تحریک ندوہ میں عملی جامہ پہنے۔ شبلی لکھتے ہیں:

''بھائی وہ لوگ دار المصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصلی خواہش یہی ہے، لیکن کیا کیا جائے''۔(۱)

مخالفتوں کے باوجود شبلی یہ چاہتے تھے کہ لکھنؤ ہی میں کہیں دار المصنفین بھی قائم ہوجائے۔ اس لیے مولوی مسعود علی کو لکھتے ہیں:

''ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دار المصنفین کا بندوبست کرو، راجہ صاحب محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے، چاہو تو وہیں تم کو بھی دلادوں کہو تو میں ان کو لکھ دوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں، اگر زمین مل جائے تو ایک مختصر پھوس کا بنگلہ اور چند اور چھپر کے کمرے بنوا لیے جائیں، پھر کام چلتا رہے گا''۔(۲)

حسب عادت وہ مولانا شروانی سے بھی مشورہ کرتے ہیں۔ اور ان کا تعاون چاہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''تسلیم! دار المصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا، آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا کس کو حق ہے، میں اس عمارت کو ان شاء اللہ پورا

---

(۱) مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۰۹۔
(۲) مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۱۰۔

کرکے رہوں گا اور شاید وہی میرا مدفن (۲) ہو" (۱)

علامہ شبلی نعمانی کی یہ آرزو پوری ہوئی اور وہ دار المصنفین اعظم گڑھ کے احاطہ ہی میں دفن کئے گئے۔ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں :

"دار المصنّفین کی تجویز میں قطعاً کرچکا ہوں، کہیں سے بندوبست نہ ہو تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے، میں خود اپنے پاس سے ادا کروں گا، چھوٹے چھوٹے بنگلے اور احباب سے بنوالوں گا۔ بہرحال اس وقت صرف آپ سے یہ مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے؟" (۲)

آگے لکھتے ہیں :

"پر لطف تجویزیں دار المصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں"۔(۳)

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شروانی کے ذہن میں بھی اسی نوعیت کی کوئی اسکیم تھی یا پھر اس تجویز کے پیش ہونے کے بعد انھوں نے یہ خیال کیا ہو کہ حبیب گنج (علی گڑھ) میں خود ان کا عالیشان کتب خانہ موجود ہے۔کیوں نہ دار المصنفین کا قیام وہاں عمل میں آئے۔اس پر شبلی لکھتے ہیں:

"آپ دار المصنّفین کو حبیب گنج (۱) لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کو کیوں نہ پیش کروں، اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور بنگلے پیش کرسکتا ہوں، خیر اس پر مل کر گفتگو ہوگی"۔(۴)

اعظم گڑھ شبلی کا وطن تھا، اس سے دلی لگاؤ ایک فطری بات تھی، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"سب سے بہتر میری زندگی کا خاکہ اعظم گڑھ کا قیام ہے، آب

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۹۰۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۹۹۔

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۰۰۔

(۴)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۲۰۰۔

وہوا بالکل موافق، بنگلہ حسب خواہش، سکون وخاموشی، بنگلہ کو پھر مرتب کرلوں گا، تصنیف کا کام نہایت اطمینان سے ہوگا، اسٹاف ساتھ ہوگا"۔(۱)

بہر حال شبلی حیدر آباد میں بیٹھے ہوئے اس فکر میں تھے کہ دار المصنفین کہاں قائم ہو لکھنؤ یا اعظم گڑھ میں کہ قدرت نے خود اس بات کا فیصلہ کردیا کہ ان کا یہ خواب اعظم گڑھ ہی میں شرمندۂ تعبیر ہو۔ان کے بھائی محمد اسحاق کا انتقال ہوگیا اور اب اعظم گڑھ میں مستقل قیام کرنا ان کے لیے ناگزیر ہوگیا۔سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"میں اب اعظم گڑھ میں ہوں اور ارادہ ہے کہ کہیں مستقل قیام کروں، استقلال کا ہر طرح سامان کر رہا ہوں، دار المصنفین کے لیے بنگلہ اور باغ وقف کرنا چاہتا ہوں، چونکہ خاندان کے اور لوگ شریک ہیں اس لیے ان کو بھی وقف پر آمادہ کر رہاہوں"۔(۲)

اعظم گڑھ میں اپنے مستقل قیام کی اطلاع مسعود علی کو بھی دیتے ہیں۔ایک مکتوب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی اس بات سے بالکل مطمئن تھے کہ دار المصنفین کا کام اعظم گڑھ میں رہ کر بخوبی انجام پا رہا ہے۔لکھتے ہیں:

"میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے، ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے، تعلیمی کام شروع ہوگئے ہیں، کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے، اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کیے۔ باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب دلخواہ کام کرتے ہیں"۔(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۵۱۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۰۔

(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۱۸۔

شبلی نعمانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ اب تک انھوں نے ندوہ کی الجھنوں میں کیوں وقت ضائع کیا اس لیے وہ دار المصنفین کے قیام کی کوششوں میں زیادہ منہمک ہوگئے یہاں تک کہ اپنے بھائی کی وفات کا غم بھی بڑی حد تک بھلا دیا۔ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"دار المصنفین کی تجویز اور اعظم گڑھ میں عام تعلیم کی اشاعت ان دونوں کاموں کو وسیع پیمانہ پر جاری کروں گا، بنگلہ کی درستی ہو رہی ہے اور کتب خانہ وسیع کیا جارہا ہے"۔(۱)

اب علامہ شبلی کتب خانے کی طرف متوجہ تھے تاکہ اس کو وسعت دیں۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

"کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہوگئی ہیں، چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں، وقف نامۂ باغ زیر تحریر ہے، بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دار الضیوف بن گیا ہے"۔(۲)

شبلی نعمانی اپنے دوست نواب علی حسن خاں کو مطلع کرتے ہیں:

"میرا تو یہ حال ہے کہ میں نے اچھا وسیع قطعہ دار المصنفین اور دار التکمیل کے لیے لے لیا ہے اور جو قوت اور افادہ وہاں بیکار جا رہا تھا اس کو موزوں اور مناسب موقع پر صرف کروں گا"۔(۳)

اس خط کے آخر میں ان سے یہ خواہش کرتے ہیں:

"اگر آپ کے یہاں اب بھی کچھ فالتو اور زائد کتابیں ہوں تو دار المصنّفین کے کتب خانہ کو عنایت کیجیے، سات الماریاں تو اب تک ہوچکیں"۔(۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۱۹۔

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۰۱۔

(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۵۴۔

(۴)مکاتیب شبلی جلد دوم،ص ۱۵۴۔

اس طرح علامہ شبلی نے کوشش کرکے کتب خانہ بھی قائم کر لیا اور ساتھ ہی دار المصنفین بھی۔ دار التکمیل کی جماعتوں کا بھی انتظام کردیا اور طلباء کے رہنے کے لیے مکان کا بھی۔ اس کے بعد کے بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ طلباء کا انتخاب بھی خود مولانا شبلی نے فرمایا۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"عبد الرحمن نگرامی بھی قابلِ تربیت ہے"۔(۱)

اس طرح کچھ اور طلباء کو بھی منتخب کر لیا۔ دار المصنفین کے چلانے کے لیے اپنے بعض قابل اعتماد احباب کو متوجہ کرتے ہیں، مولوی حمید الدین کو یوں لکھتے ہیں:

"اور اگر دار المصنّفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا"۔(۲)

دار المصنّفین کے سلسلے میں آخری خط نواب علی حسن خاں کے نام ہے جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ مکتوب انتقال سے صرف سولہ روز قبل لکھا گیا تھا۔ اس میں خواہش کرتے ہیں:

"دو تین مہینہ کے بعد آپ کو تکلیف دوں گا کہ آپ خود بھی دیکھ لیں"۔(۳)

علامہ شبلی نعمانی کی یہ خواہش تھی کہ چند اصحاب کو مدعو کیا جائے کہ وہ دار المصنّفین کے کاموں کو دیکھیں لیکن افسوس کہ شبلی کی یہ خواہش ان کی زندگی میں پوری نہ ہوسکی۔ اس لیے کہ شبلی اپنی خواہش کے مطابق دار المصنّفین ہی کے احاطے میں دفن ہوئے، ان کی روح وہاں آج بھی اہلِ قلم اصحاب اور مصنّفین کی رہنمائی کرتی ہے اور اس طرح مولانا شبلی خود انہی کے الفاظ میں "زمرۂ مصنّفین کی دائمی خدمت" انجام دے رہے ہیں۔ اس موضوع کے اختتام کے بعد مکتوب شبلی کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع جو "شبلی اور ندوہ" سے متعلق ہے اس پر سیر حاصل نظر ڈالی جائے گی۔

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۹۵۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۴۷۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۵۴۔

شبلی اور ندوہ

علامہ شبلی کے ساتھ ندوہ اور ندوہ کے ساتھ شبلی کا ذکر لازم وملزوم ہے۔اس لیے کہ شبلی کی دلچسپی ندوہ کے ساتھ اس کے قیام کے زمانے ہی سے رہی۔۱۹۰۵ئ؁ سے ۱۹۱۳ئ؁ تک انھوں نے اس کی معتمدی کے فرائض بھی انجام دیئے۔وہاں رہ کر انھوں نے جو نمایاں کام کیے ہیں وہ ندوہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

ندوۃ العلماء کا قیام ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی، مذہبی، تعلیمی فلاح و بہبود کے لیے ایک مستحسن قدم تھا اس لیے کہ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ایک گروہ مغربی اثرات میں پرورش پا رہا تھا اور مذہب سے دور ہوتا جا رہا تھا اور دوسرا گروہ زمانے سے مطابقت پیدا نہ کرپانے کی وجہ سے دنیا سے تقریباً بے تعلق ہوگیا تھا، بیشتر علماء نے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی تھی۔مذہب کے یہ نمائندے چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک دوسرے سے دست وگریباں تھے، نہ خیالات میں وسعت تھی نہ مشاہدہ میں ژرف بینی۔ان میں چند علماء نہ صرف ایک دوسرے کی تضحیک اور توہین پر کمر بستہ رہتے بلکہ کفر کا فتویٰ لگانے میں بھی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔روشن خیالی نے بھول کر بھی ان لوگوں کے دماغوں میں جگہ نہ پائی تھی۔ایسے لوگ قوم کی کیا قیادت کرسکتے تھے اور ان سے رہبری کی کیا توقع کی جا سکتی تھی۔ضرورت تھی کہ ان میں جو باشعور علماء تھے وہ آگے آتے اور اس طبقے کی تنظیم کی طرف متوجہ ہوتے، چنانچہ یہی ہوا کہ اپریل ۱۸۹۴ء؁ میں ایک ایسے جلسے کے انعقاد کا انتظام کیا گیا جس میں ہندوستان کے علماء کو دعوت عام دی گئی کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں اور مختلف مسائل پر غور کریں، اس میں مولانا شبلی نے بھی شرکت کی اور ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔یہ اس زمانے میں علی گڑھ سے وابستہ تھے اور پھر حیدر آباد چلے گئے لیکن ندوۃ العلماء کی دلچسپیوں اور اجلاسوں میں برابر شریک رہتے۔ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ علماء میں روشن خیالی پیدا ہو اور قوم کی قیادت علماء کے ہاتھ

میں آجائے۔

علامہ شبلی نعمانی کے خیالات اس دور کے دیگر علماء سے بہت مختلف تھے۔ وہ پرانی روش میں اصلاح کے قائل تھے، بعض علماء تو ذرہ بھر بھی تبدیلی گوارہ نہ کرسکتے تھے، اس لیے شبلی ندوہ میں بھی بہت کم لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی ان کے مخلص دوست تھے اور روشن خیال عالم تھے لیکن شبلی کا خیال تھا کہ وہ موقع اور محل کو مد نظر رکھتے ہوئے کام کرتے تھے۔ ان کے نام شبلی کے خطوط زیادہ بے تکلف ہیں اور شبلی کے خیالات کا صحیح عکس اور آزادانہ اظہار خیال ان خطوط میں ملتا ہے ۱۱/جون ۱۸۹۹ئ کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”دار العلوم کی کل میں نہایت ذلیل پرزے لگائے گئے، کیا قوم
کو اس قدر امیدیں دلاکر دیوبند وغیرہ سے بھی گھٹیا مال دینا چاہیے“۔(۱)

ان کے پاس کوئی لگی لپٹی بات نہیں، صاف صاف اظہار میں انھیں کوئی تامل نہ تھا۔

علامہ شبلی نعمانی کے اخلاق اور کردار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ کا تعلق ندوہ سے کیسا تھا۔ تاہم چند اقتباسات کی مدد سے اس تعلق کو اور واضح کرنا بہتر معلوم ہوتا ہے۔ ارکان ندوہ جس انداز پر کام کر رہے تھے شبلی اس سے مطمئن نہ تھے، وہ اس کو قومی گناہ تصور کرتے تھے۔ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھتے ہیں:

”اس وقت جس طرح کام ہورہا ہے، اس میں شریک ہونا میں
قوی گناہ سمجھتا ہوں اور لطف یہ کہ بڑے بڑے ارکان کے نزدیک وہی
معراج خیال ہے۔ پھر میری کھپت وہاں کیوں کر ہوسکتی ہے“۔(۲)

علامہ شبلی جانتے تھے کہ ندوہ کی نظامت ایسے مخلص اشخاص کے سپرد کی جائے جو حقیقت میں کام کرنا چاہتے تھے۔ ۲۷/جون ۱۹۰۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

”ندوہ کے لیے یہ بڑا نازک موقع ہے، نظامت کے خلا (۱) سے
بہت سے نا مستحق اشخاص امیدوار ہوگئے ہیں، حقانی اور ملا عبد القیوم کی

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۱۴۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۲۲۔

طرف انگلیاں اٹھ رہی ہیں، دونوں میں سے کوئی ہوا تو ندوہ کا خاتمہ ہے،
ارکان سے خط وکتابت کیجیے اور اس موقع کو سنبھالیے، مولوی مسیح الزماں
اوروں سے بہتر ہیں، شاہ سلیمان تک بھی مضائقہ نہیں، بہرحال یہ موقع
سستی اور بے پروائی کا نہیں ہے"۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی کو ندوہ سے عشق تھا۔وہ اس کو ایک آئیڈیل درسگاہ بنانا چاہتے تھے، اس عزم سے انھوں نے ابتداء سے اس ادارہ میں دلچسپی لی اور اسی لیے علی گڑھ بھی چھوڑا جس کا اظہار یوں کیا ہے:

"ندوہ کی نسبت ہمیشہ میرا یہی خیال رہا اور سچ یہ ہے کہ صرف
ندوہ کے لیے میں نے کالج چھوڑا تھا"۔(۲)

شبلی کا مقصد یہ تھا کہ علماء اور دیگر تعلیم یافتہ لوگ سب یکجا ہوکر مشترکہ مسائل پر غور کریں، چنانچہ ۴/مارچ ۱۹۰۷ئ کے مکتوب سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس نوعیت کا ایک جلسہ منعقد ہوا تھا۔

"مجمع نہایت کثرت سے ہوا اور بہت بڑی بات یہ ہوئی کہ
بیرسٹر اور تمام ایجوکیٹڈ (۵) نے کہا کہ ہم لوگوں کو اب عملاً ندوہ میں
شرکت کرنی چاہیے، لہذا آئندہ اتوار کو ایک خاص جلسہ رفاہِ عام میں ہو،
جس میں ہم ایجوکیٹڈ لوگ اور ارباب ندوہ جمع ہوں اور مشورہ وغور کیا
جائے کہ ندوہ کو کیوں کر ترقی دینی چاہیے اور کس طرح ہم لوگ اس کو
اعلیٰ درجہ تک پہنچائیں"۔(۳)

اکثر مکاتیب کے مطالعے سے کچھ یہی اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی کے پیشِ نظر ندوہ کی ترقی اور بہبودی تھی۔حیدر آباد کے ملا عبد القیوم کو ندوہ کی اعانت اور پروپیگنڈہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ کی مجبوریاں مجھ کو معلوم ہیں، لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۲۷۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۴۰۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۵۳۔

آپ کھلم کھلا ندوہ کے لیے وہاں کوشش کریں بلکہ آپ کی خاموش اور مخفی تدابیر ہمارے لیے مفید ہوں گی۔مدار المہام بہادر کے پاس اگر ندوہ کا وفد جائے تو کیا وہ اس کی درخواست کو اعلیٰ حضرت (ا) میں نہ پیش کریں گے"۔(۱)

وہ اس کوشش میں رہتے کہ ندوہ کے لیے جہاں کہیں سے کوئی مدد مل سکے حاصل کریں، اگر ندوہ سے متعلق لوگوں کو بدگمانیاں ہوں تو دور کی جائیں۔ایک مکتوب سے یہ معلوم ہوتاہے کہ شاہ سلیمان ان کے پاس کئی دن مہمان رہے۔لکھتے ہیں:

"اب ان کے خیالات ندوہ کے متعلق صاف ہوگئے"۔(۲)

ان کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ لوگ ندوہ جیسے قومی اور مذہبی ادارے کو محض عہدوں کی لالچ میں جنگ کا میدان بنالیں۔مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

"جلسہ انتظامیہ ہوگا تو بجائے ضروری امور کے لوگ نظامت کے لیے کمریں باندھ باندھ کر آئیں گے اور کل اجلاس میں مہا بھارت کا رنگ رہے گا"۔(۳)

شبلی کے مخالف گروہ میں ایک مولوی خلیل الرحمن تھے، شبلی چاہتے تھے کہ ان دونوں کی آپس کی مخالفت کی وجہ سے ندوہ کو کوئی نقصان نہ پہونچے اور ندوہ کی شہرت متاثر نہ ہو، وہ مولانا شروانی کو مشورہ دیتے ہیں:

"مولوی خلیل الرحمن صاحب کو بلائیے، پہلے آپس میں صلح اورنیک نیتی کے ساتھ تمام مراتب طے ہوجائیں اور ضرور ہوسکتے ہیں پھر تمام امور کو باقاعدہ جلسہ میں طے کرلیجیے، جب ہم لوگ متفق ہوں گے تو کسی کو اختلاف نہ

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۳۰۴۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۵۴۔

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۷۴۔

ہو گا"۔(۱)

اس تحریر سے شبلی کے کردار کی بلندی اور خلوص دل کا پتہ چلتا ہے اور ان کی صلاح پسند طبیعت اور نیک نیتی کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ ندوہ کو ذاتی جھگڑوں کی آماجگاہ بنانا پسند نہ کرتے تھے بلکہ معاملات کو سلجھانے کے لیے پیش قدمی کرتے تھے۔ اس کے باوجود مولوی خلیل الرحمن کی طرف سے مولانا شبلی کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، اور شبلی کو جولائی ۱۹۱۳ئ میں استعفی دینا پڑا۔ ان کے ساتھ بعض اور معززین بھی مستعفی ہوگئے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"لیجیے شبلی، مولوی عبد الحی صاحب، منشی احتشام علی، راجہ تصدق رسول خاں، نواب علی حسن خاں اور اور مستعفی ہوگئے (۱) اور سب کا استعفیٰ نہایت اطمینان کے ساتھ منظور ہوا، اب تنہا مولانا سہارنپوری فرمانروائے مطلق ہیں، ایک زمانہ میں آپ یہ نیت کرکے آئے تھے اور جلسہ کے بعد اظہار بھی کیا گیا تھا کہ مجھ کو الگ کردیجیے تاکہ کام یکسوئی سے ہو، اب تو پوری یکسوئی ہے"۔(۲)

علامہ شبلی نے استعفیٰ اس لیے دیا تھا کہ ایک تو وہ اس مخالف ماحول میں کام نہیں کرسکتے تھے اور دوسرے وہ چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اپنی صلاحیتوں کو آزمائیں، بالخصوص وہ لوگ جو اس بات کے خواہش مند تھے کہ شبلی کو علیحدہ کردیا جائے تاکہ کام ان کی مرضی کے مطابق انجام پائے اور ان میں مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری پیش پیش تھے، شبلی کا خیال تھا کہ مولوی خلیل الرحمن اور بعض علماء محض نظامت کی خاطر شورش برپا کرتے ہیں اور مخالفت پر کمر بستہ ہوتے ہیں۔ اسی مکتوب میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

"آپ پر مجھ کو محبت کا دعویٰ ہے، اس لیے جو چاہتا ہوں کہہ دیتا ہوں، آپ کا احسن الفضائل حسن ظن عام ہے اور یہی کہیں کہیں مضر بن جاتا ہے، مدت سے میں دیکھ رہا تھا کہ یہ سب شورش، در اندازیاں نزاعی امور کا بار بار پیش کرانا سب اسی شوق نظامت کے لیے

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۷۴۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول،ص ۱۹۶۔

ہیں، لیکن آپ کو یقین نہ تھا، اب دیکھ لیجیے"۔(۱)

مولانا شبلی جب یہ دیکھتے کہ ندوہ کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے تو بہت برہم ہوتے لکھتے ہیں کہ:

"در حقیقت اب وہ محض لونڈوں کا مکتب رہ جائے گا"۔(۲)

ندوہ کے قیام کے کچھ اور مقاصد تھے لیکن شبلی کے بعد آنے والوں نے اسے کچھ اور بنا دیا۔ جس کا شبلی کو افسوس تھا، اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:

"چند سازشی آدمی مفت میں ایک بڑے قومی کارخانہ کو دبا بیٹھیں، اس کو قوم کیوں کر دیکھ سکے گی"۔(۳)

جیسا کہ سطور بالامیں گذرچکا ہے ان ساری باتوں کے باوجود شبلی یہ پسند نہ کرتے تھے کہ اس مذہبی ادارے کو آپس کے جھگڑوں کا مرکز بنائیں۔ مولوی مسعود علی ندوی نے ندوہ سے مولانا کے قطع تعلق پر افسوس کا اظہار کیا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میں بخوبی اندازہ کرتا ہوں کہ تم کو میرے قطع تعلق کا کس قدر غم ہوا ہو گا لیکن بھائی چارہ کیا تھا، میرے لیے، دار العلوم کے لیے، قوم کے لیے یہی مفید تھا کہ اس بک بک اور زق زق سے رہائی حاصل کی جائے"۔(۴)

مولانا شبلی نے ندوۃ العلماء کی معتمدی کے زمانے میں ندوہ کو ترقی دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کی اندرونی اصلاح اور نصاب میں تبدیلی کے علاوہ ندوہ کی مالی حالت درست کرنے کے لیے انھوں نے باوجود پیر سے معذوری کے لمبے سفر کیے، تکالیف کا سامنا کیا، ذی ثروت اصحاب اور مختلف حکومتوں سے امداد حاصل کی جو ندوہ کے مالی استحکام کا باعث ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے ندوہ کو بیرونی ممالک میں بھی روشناس کروایا۔ اپریل ۱۹۱۲ء کے

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۱۹۶، ۱۹۷۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۰۳۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص۱۰۳۔
(۴)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۰۲۔

سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے مصر کے ایک مشہور عالم اور المنار کے ایڈیٹر سید رشید رضا کو مدعو کیا جو ترکی میں بھی کافی قدر ومنزلت رکھتے تھے۔مولانا شبلی اس موقع پر مختلف لوگوں کو مدعو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس بنا پر ضرور ہے کہ تمام بہی خواہان قوم اس موقع پر تشریف لائیں اور جو مشکلات اس وقت قوم کو در پیش ہیں ان کو حل فرمائیں"۔(۱)

قومی اور مذہبی کام چاہے کسی اہمیت کے حامل ہوں اس وقت تک نہیں چل سکتے جب تک کہ ذاتی اثرورسوخ اور تعلقات کو کام میں نہ لایا جائے۔مولانا شبلی کے اثر ورسوخ اور تعلقات کی وجہ سے بعض عمائدین اور مشاہیر نے ندوہ میں دلچسپی لی جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں۔خود سید رشید رضا کا ندوہ آنا محض شبلی کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے تھا۔

بہرحال یہ جلسہ بڑا کامیاب رہا اور ندوہ کی شہرت کا باعث ہوا، غالباً یہ ندوہ کا آخری جلسہ تھا جو مولانا شبلی کے زیر اہتمام ہوا اور ان ہی کے بقول ندوہ کی بساط پر یہ آخری بازی تھی۔

ندوہ میں شبلی کے جو اچھے یا برے دن گذرے مخالفتوں کا جو سامنا رہا اور پھر ان کا اپنا جو طرز عمل تھا اس کے تحت اور اس باب کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ شبلی کو ندوہ سے کتنی محبت تھی، اس کی ترقی اور بہبودی کے لیے وہ کس درجہ کوشاں تھے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ندوۃ العلماء سے جاری ہونے والے رسالہ "الندوہ" کے متعلق گفتگو کی جائے۔

الندوہ

ندوہ کی خدمت انجام دینے میں ان کے قلم نے بھی بڑا حصہ لیا، ندوہ کی طرف سے ایک رسالہ نکالنے کی تحریک مولانا شبلی کے ذہن میں سب سے پہلے آئی، ایک ایسا رسالہ نکالنے

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۶۳۔

کی جو ندوہ کے مقاصد کا ترجمان ہو اور جس سے طلبائے ندوہ کی ذہنی تربیت ہوسکے۔ ارکان ندوہ نے الندوہ نکالنے کی منظوری تو دے دی لیکن ابتداء میں مولانا شبلی کو اس کا ایڈیٹر نہ بنایا جو ظاہر ہے کہ ان کے لیے تکلیف دہ بات تھی، حالانکہ یہ ۱۹۰۲ئ سے ایک رسالہ نکالنے کی فکر میں تھے اور اس کی ایڈیٹری ان کے ذمہ کیے جانے کا بھی یقین رکھتے تھے۔ تقریباً ایک سال بعد مولانا اس کے ایڈیٹر بنائے گئے، چنانچہ نواب علی حسن کو لکھتے ہیں:

> ''ندوۃ العلماء کی طرف سے میری ایڈیٹری میں ایک ماہوار علمی رسالہ نکلنے والاہے ان شاء اللہ زور کا پرچہ ہوگا، آپ کبھی کبھی اس میں اظہار خیالات فرمائیں''۔(۱)

الندوہ مولانا کی خاص دلچسپی کی چیز تھی،وہ اس میں تاریخی تحقیقی، علمی اور مذہبی مضامین لکھتے تھے اور دوسروں کو اپنے خیالات سے واقف ہونے کاموقع دیتے۔ رسالہ کسی مقصد کی تشہیر کا ایک اچھا ذریعہ ہوتا ہے، قاری رسالہ کے مواد سے چاہے کتنا ہی اختلاف رکھتا ہو پھر بھی مطالعہ پر مجبور ہوتا ہے۔ الندوہ نے علماء کے خیالات میں تبدیلی پیدا کی اور واقعہ یہ ہے کہ اس عہد کے علماء کے خیالات میں جو بھی انقلاب آیا وہ الندوہ کا بڑی حد تک مرہون منت ہے۔ الندوہ میں تربیت کے مقصد سے طالب علموں کے مضامین کو بھی جگہ دی جانے لگی۔ اور اس طرح اس نے نوجوان علماء کی ذہنی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیا، بلکہ اکثر نوجوان تو الندوہ ہی کی بدولت علمی دنیا میں روشناس ہوئے، مولانا شبلی کے علاوہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا عبد اللہ العمادی، مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد السلام ندوی نے مختلف اوقات میں اس کی ادارت کے فرائض انجام دیئے، لیکن مولانا شبلی نے دوسروں کی ادارت کے زمانے میں بھی الندوہ میں دلچسپی لی اور مفید مشورے دیئے۔ سید سلیمان کے نام بعض خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ الندوہ کو ایک معیاری پرچہ کے مقام پر دیکھنا چاہتے تھے نہ صرف مضامین کے اعتبار سے بلکہ کاغذ اور طباعت کے معاملے میں بھی۔ سید سلیمان ندوی کو وہ سختی سے ہدایت کرتے ہیں کہ کاپیاں وہ خود دیکھا کریں تاکہ پروف

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۴۷۔

کی غلطیاں کم سے کم ہوں۔

مولانا ابو الکلام نے الندوہ کے بعد الہلال وغیرہ کی ادارت کی، لیکن اکثر الندوہ میں ان کے مضامین چھپتے رہے اور ان کی بڑی تعریف ہوتی رہی۔ مہدی افادی نے مولانا آزاد سے متعلق مولانا شبلی سے کچھ استفسار کیا تھا، جواب میں لکھتے ہیں:

"آزاد (۱) کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں ضرور دیکھا ہوگا؟ قلم وہی ہے، معلومات یہاں رہنے سے ترقی کرگئے ہیں"۔(۱)

غرض یہ کہ مولانا آزاد اور مولانا شبلی کے دیگر تربیت یافتہ شاگردوں نے ان کی رہبری میں الندوہ کے ذریعہ ملک قوم اور مذہب کی بڑی خدمات انجام دیں۔

شبلی اسکول

مولانا شبلی نعمانی کے پیشِ نظر مختلف کام تھے یہ انہی کا حق تھا کہ ایک ہی وقت میں کئی ایک کاموں کو جاری رکھیں۔ شبلی کی دلچسپی اعظم گڑھ کے ایک مدرسے سے بھی تھی جس کو انھوں نے ۲۰/ جون ۱۸۸۳ئ میں قائم کیا تھا، یہاں ایک بات واضح کرتا چلوں ، ڈاکٹر الیاس الاعظمی صاحب کی ایک کتاب "نقوش شبلی" میں ایک مضمون "شبلی نیشنل اسکول کی تاریخ کا ایک ورق" میں نیشنل اسکول کے قائم کرنے کی تاریخ ۲۶/ جون ۱۸۸۳ئ بتائی گئی جو انھوں نے ایک نئی تحقیق سے واضح کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء۔۱۹۱۴ئ) فروری ۱۸۸۳ئ میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں وابستہ ہوئے۔ محض چار ماہ بعد ۲۸/ جون ۱۸۸۳ء کو نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی"۔(۲)

اس تحقیق کی پوری روداد اس مضمون میں شامل ہے، علامہ شبلی نعمانی کو اپنے قائم کردہ اسکول

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۷۵ ، ۱۷۶۔
(۲)نقوش شبلی، ص ۱۳۵۔

سے بڑی ہمدردی تھی، لیکن علی گڑھ چھوڑنے کے بعد حیدر آباد اور ندوہ کے کاموں میں اتنا مصروف رہے کہ اس اسکول کی طرف زیادہ توجہ نہ دے سکے، مسٹر محمد اسحاق صاحب کو لکھتے ہیں:

"سب سے بہتر میری زندگی کا خاکہ اعظم گڑھ کا قیام ہے"۔

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"وہاں رہ کر اسکول کا بھی تفریحی مشغلہ ہے، غرض ہر طرح موزوں ہے"۔(۱)

ایک مرتبہ اپنے بھائی محمد اسحاق کو اعظم گڑھ میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کی طرف توجہ دلائی جس سے شبلی کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکول کا بھی پروپیگنڈہ ہوجائے۔ اس اسکول کو وسعت دینے سے متعلق مولانا کے خیالات کااندازہ ایک اور مکتوب سے ہوتا ہے:

"قابل غور (۲) یہ مسئلہ ہے کہ نیشنل اسکول کو ہائی اسکول بنانا چاہیے یا ایک بورڈنگ قائم کرنا چاہیے، اس کو ہر شہر میں سرکاری یا مشن موجود ہوتے ہیں اور ان کے برابر اسٹاف کا اسکول بنانا آسان نہیں اور بہت قوت اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے، اب تجربہ کار لوگ اس کو تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ اسلامی بورڈنگ بنانا زیادہ مفید ہے، جس میں اخلاقی اور مذہبی تربیت ہو، باقی تعلیم تو کسی اسکول میں حاصل کریں گے، اگر یہ رائے صحیح ہو تو نیشنل کی عمارت کے قریب بورڈنگ کی بنیاد ڈالنا چاہیے جس کو رفتہ رفتہ بہت ترقی دی جاسکتی ہے، بورڈنگ کی وجہ سے بہت زیادہ بچے تعلیم حاصل کرسکیں گے اور کفایت شعاری کے ساتھ"۔(۲)

اندازہ کیجیے کہ علامہ شبلی نعمانی نیشنل اسکول کو ہائی اسکول بنانے اور اسلامی بورڈنگ

---

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۵۱ ، ۵۲۔
(۲) مکاتیب شبلی، جلد اول، ص ۵۳ ، ۵۴

قائم کرنے اور ساتھ میں طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت کے بارے میں کسی قدر فکر مند تھے۔ علامہ شبلی نعمانی، شبلی نیشنل اسکول کی بقاء وترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ مکاتیب شبلی کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ شبلی اپنے رشتہ داروں، عزیزوں، اور بھائیوں کو نیشنل اسکول کی ترقی کے لیے ہمیشہ توجہ دلاتے رہے۔ اپنے بھائی محمد اسحاق کو ایک مکتوب لکھتے ہیں:

''مولوی محمد عمر صاحب کا ایک خط، خط کے ساتھ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس کاروے خطاب تم سے بھی اسی قدر ہے جس قدر مجھ سے، تم اپنی پختہ رائے سے جو کامل غور کے بعد قائم کرو مجھ کو مطلع کرو تم کو خاص ان پہلوؤں پر لحاظ رکھنا چاہیے۔

(۱)نیشنل اسکول کا قائم رکھنا کیوں ضروری ہے۔

(۲)کیا بلحاظ حالات موجودہ اور توقعات آئندہ کی وہ مستقل طور پر قائم رہ سکتا ہے۔

(۳)ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان جن میں تم بھی ایک بلند پایہ پر ہونے کا حق رکھتے ہو، اسکول کے کچھ کام آسکیں گے۔

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں:

''اب اس بات پر خیال کرو کہ یہ اسکول ہم لوگوں کے خیالات اور حوصلوں کا ایک عمدہ مشغلہ ہے، ہم توقع کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کی عملی ترقی کے ساتھ اس کو بھی ترقی دیتے جائیں گے، آخر وہ کیا چیز ہے جس کو محسوس صورت میں ہم ایک ترقی کا کام کر سکتے ہیں، ہم میں جو لوگ قومی مذاق پیدا کرتے جائیں گے ان کے لیے اپنی قومی فیاضی کے صرف کرنے کا اس اسکول سے عمدہ تر کیا موقع ہوگا''۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی اپنے وطن سے دور ہوتے ہوئے بھی نیشنل اسکول کی ترقی، احوال وکوائف

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۳۵

نیز طلبہ واساتذہ کے بارے میں فکرمند رہتے ہیں۔ محمد سمیع کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”دیکھو شب وروز مدرسہ کی فکر رہے، ذرا قوم کو ابھارو“۔(۱)

شبلی نعمانی اسکول کے طلبہ کی صلاحیت، نصاب اور مقدار خواندگی سے متعلق ۲۲/ فروری ۱۸۸۴ء کے ایک خط میں رقمطراز ہیں:

”تمام لڑکے خصوصاً پانچویں صف کے بقدر امکان انگریزی بولتے ہیں یا نہیں۔ ٹیچروں نے اس طرف توجہ مبذول کی ہے یا نہیں۔ ۲۔ چھوٹے لڑکے مشق خط کرتے ہیں یا نہیں اور مسودہ لکھایا جاتا ہے یا نہیں۔ ۳۔ ممبران باقی دار نے کچھ بھی زرِ چندہ ادا نہیں کیا یا سہ ماہی وششماہی۔ ۴۔ جمعرات کے دن انگریزی ہوتی ہے یا امتحان۔ ۵۔ میں نے کہا تھا کہ ہر ایک لڑکا کاپی رکھے گا جس پر مدرس فارسی کے بتائے ہوئے نوٹ روزمرہ لکھے گا، آیا ایسا ہوتا بھی ہے اور اگر نہیں ہوتا تو تم مطلع کرو“۔(۲)

نیشنل اسکول کے طلبہ اور اس کی فلاح وبہبود سے شبلی کو حد درجہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ وہ اسکول کی ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں پوچھتے رہتے اور اسکول میں اصلاحات نافذ کرنے نیز اسے صحیح سمت میں لے جانے کے لیے کوشاں رہتے۔ محمد سمیع کے نام ۱۸۸۳ئ میں لکھے گئے خط میں لکھتے ہیں:

”مدرسہ (نیشنل اسکول) کی رپورٹ جو آتی ہے وہ بالکل ناقص، آج تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ لڑکوں نے کس قدر کس علم کو پڑھ لیا، ہاں محمد شریف پر جو جرمانہ ہوا وہ ضرور وصول ہو، ورنہ اس کو مدرسہ میں آنے کی اجازت نہ ہو، یہ مدرسہ ملعبہ نہیں ہے“۔(۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۶۵
(۲) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۴۳
(۳)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۵۸

علامہ شبلی نعمانی نے نیشنل اسکول کی ترقی کے لیے خاص طور سے اپنے بھائی محمد اسحاق کو متوجہ کیا اور ان کو لکھا کہ:

"تم نے کانفرنس (۱) تسلیم تو کرلی، لیکن اس کے لیے ایک عمدہ پرسپکٹس انگریزی اور اردو میں چھپواکر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور رؤسائے دیہات کے پاس بھیجنا ضروری ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلا، منصف، عہدہ دار جو اچھی حالت رکھتے ہیں، وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پرواہ ہے، نیشنل اسکول یا سرائے میر کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں"۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی اور حمید الدین فراہیؒ کے نزدیک استاذ اور شاگرد کا رشتہ تھا اس کے علاوہ خاندانی قرابت داری بھی تھی۔مولانا فراہیؒ نے اپنے جن استاذ کا نام لیا ہے ان میں شبلی نعمانی کا نام سب سے نمایاں ہے، مولانا فراہیؒ اپنے دل میں شبلی کے لیے انتہائی عزت اور احترام کے جذبات رکھتے تھے، اسی طرح استاذ کو شاگرد کے ساتھ جو تعلق خاطر تھا اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔۱۸۹۸ءمیں نیشنل اسکول کی عمارت بن رہی ہے، اس کے چندہ کے لیے شبلی ۳۱/جولائی ۱۸۹۸ءکو فراہیؒ کو لکھتے ہیں کہ:

"میاں حمید! تا تو بمن رسی من بخدا می رسم، نیشنل اسکول کا تم پر کچھ نہ کچھ حق ہے لیکن تم نے تعمیر کی مدد میں ایک حبہ بھی ادا نہیں کیا، جب عمارت تیار ہوچکے گی اس وقت تمہاری کیا حاجت رہے گی، دینے کا وقت یہی ہے کہ تمام کام اٹکا پڑا ہوا ہے، میں علاوہ چندہ سابق کے ۲۵۰/روپئے اور دے چکا لیکن سو دو سو کی رقم کے بغیر تمام کمرے ناتمام پڑے ہیں اور خراب ہوتے ہیں، جو کچھ ہے اس وقت یا باقساط دو ورنہ ع "پس از آنکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد"۔(۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۵۲
(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۵

یہ چندہ تعمیر کی مد میں چاہیے تھا، اسی اسکول کے لیے رکنیت کا ماہانہ چندہ الگ تھا، جو مستقل تھا۔۳/ دسمبر ۱۸۹۸ئ کو شبلی علی گڑھ سے تقاضے کا خط لکھتے ہیں:

"تمہارا چندہ ماہوار نہیں پہنچا، اس کی وجہ سے سخت ہرج ہے،
باقیات وحال فوراً بھیج دو"۔(۱)

شبلی نعمانی کی نظر ہر گوشے پر تھی جہاں جس چیز کی ضرورت ہو وہاں اس تقاضہ کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے جیسے کالج میں کوئی غریب لڑکا جس کو وظیفہ دیا جائے جو اس کا حق دار ہو، میز فرنیچر وغیرہ، اسی تعلق سے ایک مکتوب محمد سمیع کو ۲۸/اپریل ۱۹۰۲ء کو لکھتے ہیں کہ:

"نیشنل میں اس غرض سے بھیج دو کہ اس سے چھوٹا سے چھوٹا
فرنیچر کا سامان لے لیا جائے، وہاں اس کی بڑی کمی ہے یا کسی غریب
طالب علم کو وظیفہ میں دے دو"۔(۲)

علامہ شبلی کے انتقال کے بعد اس اسکول کو ترقی دینے کے لیے بھرپور کوشش کی گئی "شبلی جارج اسکول" نام بھی اس لیے منتخب ہوا کہ اس کو استحکام عطا ہو لیکن ایسا نہ ہوسکا۔خیر مسرت کا مقام ہے کہ آج شبلی کا یہی اسکول شبلی کالج کے درجہ پر پہونچ گیا ہے۔اور شبلی کی ایک اہم یادگار ہے۔اس کالج کی اہمیت کے مطابق کچھ اکابرین کے اقتباسات یہاں درج ہیں :

(ا (۲۰/ فروری ۱۹۶۵ئ میں چودھویں کانوکیشن کے موقع پر پروفیسر مجیب نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں کہا تھا:

"علامہ شبلی نے صرف ایک مدرسہ قائم نہیں کیا بلکہ وہ خود علم
اور تہذیب کی اعلیٰ مثال تھے۔انھوں نے جو ادارہ قائم کیا اسے اپنے
ساتھ نہیں لے گئے، سب ہم لوگوں کے لیے چھوڑ گئے اور اب ہم اور
آپ یعنی پوری قوم اس کی وارث ہے۔وہ چھوٹا مدرسہ جو انھوں نے

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۶

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۷

قائم کیا تھا، بڑھتے بڑھتے بہت بڑا کالج ہو گیا ہے اور کالجوں میں بہت ممتاز ہے“۔

انھوں نے دوران خطبہ یہ بھی کہا تھا:

”سب سے زیادہ معنی خیز بات یہ ہے کہ شبلی کا قائم کیا ہوا ادارہ نیشنل کہلاتا تھا، سوچیے کہ اس سے کیا کیا نتیجے نکلتے ہیں۔ ہماری قوم کی تعلیم اور قومی تہذیب کی بنیاد اسی پر رکھی گئی کہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ایک دوسرے کی تہذیب صحیح معنوں میں قومی اسی وقت ہوگی جب شبلی نیشنل کالج جیسے اداروں کا تعلیمی وتہذیبی مقصد اور منصب ہماری نظروں میں اور ہم سب لوگوں کے ذریعہ دوسروں کی آنکھوں کو روشن اور دلوں کو پاک کرتا رہے گا“ (۱)

ڈاکٹر علاؤ الدین خاں شبلی کالج کی معنویت پر رقم طراز ہیں:

”اس کالج کی معنویت کی بات کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۷۰ئ تک تو یہ ادارہ زمانے کے تقاضے کو پورا کرتا رہا لیکن آج کے دور میں یہ زمانے کے ساتھ چلنے سے قاصر ہے۔ اپنی ۱۳۱/ سالہ تاریخ میں یہ ادارہ آج کے لحاظ سے تقریباً ۶۰/ سال پیچھے ہے۔ یہاں ایک بھی JOB- ORIENTED کورس نہیں۔ ادارہ کی توسیع کی ضرورت ہے۔ بزنس منیجمنٹ، انجینئرنگ اور میڈیکل سائنس جیسے کورسز کی ضرورت ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اب اسے یونیورسٹی ہو جانا چاہیے“۔(۲)

علامہ شبلی نعمانی کا وہ خواب اس وقت پورا ہوگا جب یہ کالج یونیورسٹی کی شکل میں ہوگا کیوں کہ مکتوب کے مطالعے سے یہ تمام باتیں واضح ہوجاتی ہیں جو اس موضوع میں پیش کی گئی ہیں۔

---

(۱)بزم شبلی، ایڈیٹر ڈاکٹر شباب الدین، مضمون نگار علاؤ دین خاں، سن اشاعت ۲۰۱۴۔۲۰۱۵ء، ص ۹۴

(۲)بزم شبلی، ایڈیٹر ڈاکٹر شباب الدین، مضمون نگار علاؤ دین خاں، سن اشاعت ۲۰۱۴۔۲۰۱۵ء، ص ۹۸

مدرسہ سرائے میر

شبلی اسکول کے ساتھ ساتھ شبلی کی دلچسپی ایک اور مدرسہ میں تھی، وہ مدرسہ سرائے میں تھا جو اعظم گڑھ کے قریب ہی واقع ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کا ارادہ تھا کہ اس اسکول کو گروکل طور پر چلایا جائے اور یہاں عربی کی تعلیم جدید طریقے پر دی جائے۔ مولوی حمید الدین کو لکھتے ہیں:

"کیا تم چند روز سرائے میر کے مدرسے میں قیام کرسکتے ہو، میں بھی شاید آؤں اور اس کا نظم ونسق درست کردیا جائے۔ اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمح زندگی ہو"۔(۱)

شبلی کوئی معمولی دل ودماغ کے آدمی نہ تھے، جو بات بھی سوچتے اعلیٰ پیمانے پر سوچتے سرائمیر یا اعظم گڑھ کے مدارس میں مولانا کے دلچسپی لینے کا مقصد کچھ اونچا تھا، ان دونوں مدارس کے متعلق ذکر کرتے ہوئے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو مرکز بناکر اسی کو دین ودنیا دونوں تعلیم کا مرکز بنایا جائے، یہیں خدام دین بھی تیار ہوں، مذہبی اعلی تعلیم بھی دلائی جائے، گویا گروکل ہو"۔(۲)

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے کہ شبلی کے پیش نظر ضرور کوئی بڑی اسکیم تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان مختلف علمی اور تعلیمی کاموں کو ملاکر ایک جامعہ کی شکل دی جائے جس کا اظہار ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۳۰

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۴۱

"دار المصنّفین، درجہ تکمیل، سرائے میر درجہ ابتدائی پورا جامعہ اسلامیہ کا مصالحہ ہے"۔(۱)

اس کے بعد ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں ایک مفصل اسکیم لکھ چکا ہوں، اب جو آنے والے ہوں فوراً آجائیں تاکہ ایک صحیح اسکیم قائم ہوجائے"۔(۲)

شبلی کا خیال تھا کہ اپنی زندگی ہی میں جو جس کام کے لیے موزوں ہو اس کے حوالے وہ کام کردیئے جائیں۔انھوں نے اپنے آخری زمانے میں اکثر لوگوں کو آنے کے لیے لکھا انتقال سے تیرہ روز قبل ایک مکتوب میں لکھتے ہیں جو مسعود علی ندوی کے نام ہے:

"سخت افسوس ہے کہ آنے والے اب تک نہیں آئے"

آگے لکھتے ہیں:

"تمہاری نسبت یقینا سرائے میں رہنا بہتر ہے اور چھ مہینہ کی رائے ٹھیک ہے، تم کو ہر بات کا تجربہ ہوجائے گا۔اختیارات جس قدر چاہو مل جائیں گے"۔(۳)

خدام الدین

مولانا شبلی نعمانی نے یہ دیکھا کہ بعض مذاہب میں تبلیغ کی غرض سے چند جماعتیں کام کرتی ہیں اور یہ طریقہ دیہاتوں میں بڑا مفید ثابت ہوتا ہے ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ایک جماعت ایسی بنائی جائے جس کا مقصد مذہب کی خدمت ہو، اس کے ارکان اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں اور وہ دیہاتوں میں اشاعت اسلام کا کام انجام دیں ایسی جماعت کا نام انھوں نے خدام دین تجویز کیا۔اس کا اظہار ایک مکتوب مورخہ ۸/فروری ۱۹۱۲ء میں یوں کرتے ہیں:

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم،ص ۱۱۶

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۲۰

(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۲۱

> ”میں نے خدا کا نام لے کر خدام الدین کی جماعت قائم کردی، الگ مکان لے دیا ہے اور الگ تربیت ہے، قریباً ایک مہینہ ہوا، اب تک امید افزا آثار ہیں، احکام اسلامی کی پابندی میں شغف اور مستعدی پائی جاتی ہے، ابھی تک سات لڑکے عہد وپیمان کے ساتھ خود اپنی مرضی سے داخل ہوئے ہیں، یہ دیہات وغیرہ میں اشاعت اسلام کے کام بھی آئیں گے اور جو کام ان کو بتایا جائے“۔(۱)

اسی مقصد سے انھوں نے ایک اور انجمن ”مجلس اشاعت اسلام“ قائم کی تاکہ مخالف اسلامی سرگرمیوں کو روکا جاسکے۔

وقف علی الاولاد

بعض اہم اورمذہبی مسائل جن کی طرف مولانا شبلی نے توجہ فرمائی وقف علی الاولاد کا مسئلہ بھی تھا۔ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے بعد وقف علی الاولاد کے متعلق جو بھی مقدمے فیصل ہوتے ان میں اس اسلامی قانون کو بالکل نظر انداز کردیا جاتا جس کی رو سے جائداد کو اولاد پروقف کرنا جائز تھا۔مختلف اکابر نے مختلف وقتوں میں اس قانون کو منوانے کی کوشش کی۔ سرسید نے بھی اس غرض سے ایک مسودہ پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ اپنے اس ارادے کو پورا نہ کرسکے۔ سید امیر علی اور نواب عمادالملک وغیرہ نے بھی ایسی کوششیں کیں لیکن ان کی آواز انفرادی تھی اس لئے صدا بہ صحرا ہوکر رہ گئی۔مولانا شبلی کام کرنے کا اچھا ڈھنگ رکھتے تھے اور کام شروع کرنے سے قبل وہ خوب غور وخوض اور صلاح ومشورہ بھی کرلیا کرتے تھے۔مولانا شبلی کا یہ خیال تھا کہ حکومت پر یہ بات واضح کی جائے کہ یہ مطالبہ کسی ایک شخص واحد کا نہیں بلکہ یہ قوم کی آواز اور مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے، مولانا شروانی کے خط میں ۶/فروری ۱۹۰۸ء کو تحریر فرماتے ہیں:

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۳۲

"خط پہنچا، حیرت ہوئی کہ آپ نے علماء کا ہم آہنگ ہونا مشکل خیال کیا؟ یہ مسئلہ تو تمام مذاہب کا متفقہ مسئلہ ہے، فقہ میں عموماً وقفِ اولاد کا مستقل باب ہے، پریوی کونسل نے اس کو اڑا دیا ہے، ہم اس کا اعادہ چاہتے ہیں"۔

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"وقف کے متعلق خود علماء کے خطوط آئے ہیں کہ ہم مستقل رسالہ میں شریک ہیں اور کہو تو ہم خود لکھیں"۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی چاہتے تھے کہ اس مسئلہ میں علماء کو ہم خیال بنائیں اور انھیں توقع تھی کہ اس معاملے میں جو مذہبی اہمیت رکھتا ہے علماء کبھی مخالفت نہ کریں گے، چنانچہ انھوں نے مختلف علماء کے پاس اس خصوص میں فتاوے بھی منگوائے، ندوۃ العلماء کے ۱۹۱۰ء کے ایک اجلاس میں بھی یہ مسئلہ پیش ہوا، سب ہی نے تائید کی لیکن وقف کے سلسلے میں ایک یاد داشت لکھنے کا مسئلہ در پیش تھا، مسلمانوں میں کوئی مناسب آدمی نہ مل سکا اس لئے سر تیج بہادر سپرو نے یہ کام انجام دیا جس کا علم شبلی کے مکتوب مورخہ ۵/مئی ۱۹۱۰ء سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

"وقف کی میموریل لکھنے کو کوئی مسلمان نہیں ملتا، مجبوراً الہ آباد میں تیج بہادر سپرو جو ہندوستان ریویو نکالتے ہیں، ان سے خواہش ظاہر کی، وہ فارسی سے آشنا ہیں اور شعر العجم کے معترف، اس لئے خود ملنے آئے اور مجھ سے تمام کاغذات لے لئے اور کہا کہ یہ سب پڑھ کر جواب دوں گا"۔(۲)

معلوم ہوتا ہے کہ سپرو نے جو مسودہ مرتب کیا وہ شبلی کو زیادہ پسند نہ آیا اور دوبارہ مسودہ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کا علم ایک اور مکتوب سے ہوتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی نے بھی مسودہ لکھنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۶۲، ۱۶۳
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۱۷۲

شبلی لکھتے ہیں:

”دوسری طرف مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کا خط آیا ہے
کہ تم خود آؤ میں مسودۂ وقف لکھ دوں“۔(۱)

لیکن شبلی اپنی گوناگوں مصروفیات کے سبب نواب عماد الملک کے پاس حیدر آباد نہ جاسکے۔مولوی سید سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق تمام کاغذات جنوری ۱۹۱۱ئ کو لندن بھیجے گئے تاکہ مولوی سید امیر علی اس کام کو انجام دیں۔ محمد علی جناح سے بھی مشورے رہے، مختلف اجتماعی جلسوں میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث رہا۔غرض یہ کہ مولانا شبلی نے اس خصوص میں اتنا کام اور پروپیگنڈہ کیا کہ اس مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔مولوی حمید الدین کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”وقف اولاد کے متعلق خدا کے فضل سے بہت کچھ کامیابی کی
امید پیدا ہوئی اور کوشش رائیگاں نہ گئی“۔(۲)

مولانا شبلی اس معاملے میں مسلسل کوشاں رہے، مختلف علماء کی رائے حاصل کی جس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وقف کا معاملہ طول پکڑ رہا ہے اور زیادہ قوت کے صرف کرنے کی
ضرورت ہے“۔(۳)

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

”علماء نے کہیں اختلاف نہیں کیا، پشاور اور رامپور کی رائیں
قانون کے متعلق آگئیں“۔

اس کے بعد ایک اور خط میں اس طرح رقمطراز ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۸۰

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۳۰

(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ٦۷

"وقف کا معاملہ اب قریب الحصول ہے، اب عمدہ کاغذ پر میموریل مع اصلاحات قانون وقف چھپوانا اور ملک کے اعیان سے دستخط کرانا اور وائسرائے کی خدمت میں بھیجنا ہے"۔(۱)

بہرحال مختلف لوگوں کو ہم خیال بنانے اور کام کرنے کے یہی طریقے ہوتے ہیں، اگر شبلی صرف اپنی انفرادی رائے حکومت تک پہنچاتے تو وہ اثر نہ ہوتا جو اس طرح اجتماعی حیثیت میں ملک کے مختلف اکابر کے دستخط سے میموریل کے پیش کرنے سے ہوسکا۔ایک عام خط جو اکثر ارباب رائے کی خدمت میں مولانا شبلی نے روانہ فرمایا ذیل میں نقل ہے:

"مسودۂ قانون وقفِ اولاد اب بہت جلد کونسل میں پیش ہوگا اور گورنمنٹ کے لا ممبر نے اپنی تقریر میں کہا تھاکہ گورنمنٹ اس بڑے میموریل کا انتظار کرے گی جو مسلمانوں کی طرف سے آنے والا ہے (یعنی انجمن وقف کی طرف سے) اس لئے میں نے الہ آباد اور بمبئ وغیرہ کا دورہ کرکے تمام مقننین کی رائیں حاصل کیں اور جو جو نقص مسودہ میں ہیں ان کو ایک الگ یاد داشت میں شائع کیا، آج وہ اور مسودہ انگریزی ارسال خدمت کرتا ہوں کہ آپ غور فرمالیں"۔

اسی خط میں علامہ شبلی نعمانی آگے لکھتے ہیں:

"اس کے ساتھ اب میموریل بہت جلد تیار ہوکر خدمت والا میں دستخط ثبت کرنے کیلئے حاضر کیا جائے گا تاکہ وہ ڈیپوٹیشن یا صوبہ کی گورنمنٹ کے ذریعہ سے حضور وائسرائے کی خدمت میں ارسال ہو۔ فقط۔(۲)

مولانا شبلی ایک طرف اکابر کو ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو دوسری طرف ارباب حکومت کی رائے بھی ہموار کرنا چاہتے ہیں، مختلف افسران متعلقہ سے ملتے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت بتاتے ہیں۔۲۴/دسمبر ۱۹۱۱ء کو لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۸۳ ، ۱۸۴
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۸۵

> ”وقف اولاد کے متعلق میں نے ہوم ممبر کو جن سے تمام قوانین کا تعلق ہے لکھا تھا کہ وہ ایک ڈیپوٹیشن منظور کرلیں۔ان کو تمام کاغذات سمجھائے، انھوں نے نہایت خوشی سے منظور کیا، ۲۷/ تاریخ مقرر کی ہے، لیکن شاید کچھ ٹل جائے، یہ کام ہوجائے تو ایک بڑا بار اتر جائے“۔(۱)

حقیقت میں یہ ایک بڑا اہم ملّی کام تھا جس کی تکمیل مسلسل چار سال کی جد وجہد کے بعد ۱۹۱۲ءکے اوائل ہوئی اور حقیقتاً اس میں مسلمانوں کا بڑا فائدہ مضمر تھا، ۱۰/مارچ ۱۹۱۲ءکے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ”الہ آباد سے کلکتہ گیا اور تمام وائسرائے کونسل کے ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کرکے تمام مراتب طے کر لئے، ان شاء اللہ اسی مہینہ میں بل حسب مراد پاس ہوجائے گا اور سب کمیٹی بیٹھ جائے گی“۔(۲)

تعطیل جمعہ

حکومت کا وقف علی الاولاد کو اصولاً تسلیم کرلینا نہ صرف مولانا شبلی کی بلکہ مسلمانوں کی ایک بڑی کامیابی تھی۔

وقف علی الاولاد کے مسئلہ کے بعد شبلی جمعہ کی تعطیل کی طرف متوجہ ہوئے، حکومت سے مطالبہ کرنے اور مذہبی معاملات کو اٹھانے کیلئے ہمت اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے، وقف کے سلسلے میں شبلی کی کامیابی نے حوصلے بلند کردیئے، مولانا نے محسوس کیا کہ جمعہ کے روز بوقت نماز دفاتر اور مدارس جاری رہتے

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۳۲

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۸۸

ہیں اور مسلمان رفتہ رفتہ نماز جمعہ کو ترک کرتے جارہے ہیں جو ان پر واجب ہے، انھوں نے وقف کے مسئلہ کی طرح اس مسئلہ کو بھی اٹھایا، مسلمانوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا، اخباروں میں مضامین لکھے تاکہ یہ مسئلہ بھی متحدہ اور مشترکہ کوششوں سے حکومت کے سامنے آئے، ۱۵/اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ایک مکتوب مولانا شروانی کے نام لکھا:

"تعطیل جمعہ کے جابجا جو کچھ کارروائیاں ہورہی ہیں، آپ اخباروں میں پڑھتے ہوں گے، لیکن جب تک وقف اولاد کی طرح متحدہ اور پرزور اور وسیع طریقہ سے باضابطہ کارروائی نہ کی جائے گی کامیابی نہ ہوگی، میں نے انگریزوں میں میموریل لکھوا لیا ہے اور اس کو چھپواکر دستخطوں کے بہم پہنچانے کی کارروائی شروع کرنا چاہتا ہوں"۔(۱)

شبلی کا یہ مطالبہ بالکل جائز تھا، دفاتر اور مدارس کو ہفتے کے روز نصف یوم کی تعطیل ہوا کرتی تھی جو بالکل بے ضرورت تھی، ان کا یہ خیال تھا کہ بجائے ہفتے کے جمعہ کو آدھے دن کی چھٹی دینا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ مسلمان ایک مذہبی فریضہ سے محروم نہ رہ جائیں، لیکن انھیں اس بات کی بھی فکر تھی کہ اس مسئلہ کو کس طرح اٹھایا جائے اور اس کی کیا وجہ بتائی جائے کہ مسلمانوں نے اب تک کیوں خاموشی اختیار کر رکھی تھی، لکھتے ہیں:

"ضرورت قدیم ہے، لیکن اب جدت درخواست کی وجہ کیا بیان کی جائے؟ وجہ اصلی تو یہ ہے کہ پہلے لوگوں کو گورنمنٹ سے مطالبات کا حوصلہ ہی نہ تھا، لیکن یہ لکھنے کی بات نہیں، پھر کیا وجہ بتائی جائے کہ مسلمان اب تک کیوں چپ رہے، کوئی معقول بات خیال میں آئے تو لکھئے، غلام الثقلین صاحب لکھتے ہیں کہ کامیابی ناممکن ہے"۔(۲)

حسب عادت اس خصوص میں انھوں نے مختلف لوگوں سے مشورہ بھی کیا، مولانا شروانی سے بھی دریافت فرمایا۔ادھر غلام الثقلین صاحب سے بھی رجوع کیا، ایک مکتوب سے

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۹۴

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول،ص ۱۹۵

پتہ چلتا ہے کہ بیرسٹر شفیع کی رائے تھی کہ اب اس مسئلہ کو نہ اٹھایا جائے اس لئے کہ "گورنمنٹ نے جو غزنوی کا جواب دیا وہ کافی ہے" سیرۃ شبلی (مصنفہ مولانا سید سلیمان ندوی صفحہ ۵۴۸) سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مسٹر غزنوی نے بنگال کونسل میں اس سے متعلق سوال کیا تھا جس کے جواب میں حکومت بنگال نے نماز جمعہ کے لئے دو گھنٹے کی چھٹی منظور کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، بہرحال مولانا شبلی جمعہ کی تعطیل کیلئے کوشاں رہے لیکن کارروائی ان کی زندگی میں تکمیل نہ پاسکی۔

ترجمۂ قرآن مجید

مولانا شبلی کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا انگریزی میں کوئی مستند ترجمہ کرایا جائے، اس جانب انھوں نے مختلف لوگوں کو توجہ دلائی اور خط لکھے، لیکن کسی نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا بجز عماد الملک سید حسین بلگرامی کے جنھوں نے مولانا کو مطلع کیا کہ وہ نہایت مستعدی سے اس کام کو کر رہے ہیں۔

انگریزی میں‌ترجمۂ قرآن سے مولانا کا مقصد یہ تھا کہ غیر مسلموں کو بھی اس ذریعہ سے دعوت اسلام دی جائے، مولانا کے مذکورہ بالا بعض مکتوبات سے پتہ چلتا ہے کہ نواب عماد الملک نے تقریباً نصف قر آن مجید کا ترجمہ کرلیا تھا اور وہ وقتاً فوقتاً مولانا شبلی سے بھی مشورہ کرلیا کرتے تھے، مولانا نے کئی کئی دن حیدر آباد جاکر اس غرض سے قیام فرمایا، آخر میں جب مولوی حمید الدین، مولانا شبلی ہی کی کوششوں سے دار العلوم حیدر آباد کے پرنسپل مقرر ہوگئے تو نواب صاحب اور مولوی صاحب موصوف نے مل کر باہم ترجمے پر نظر ثانی شروع کی لیکن یہ کام نامکمل رہ گیا۔اس کام کو آگے بڑھانے اور اس کی ضرورت محسوس کرانے میں مولانا شبلی نے بہت کام کیا، چنانچہ مولانا کی اس تحریک کے بعد کئی مستند انگریزی تراجم شائع ہوکر سامنے آئے۔

ورنیکیولر اسکیم

علامہ شبلی نعمانی نہ صرف مذہبی اور قومی کاموں میں ہمہ تن مصروف رہتے تھے بلکہ وہ اردو زبان و ادب کے مسائل میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتے تھے، وہ مختلف کمیٹیوں کے رکن بھی تھے، ۱۹۱۱ئ میں الہ آباد میں حکومت نے ایک کمیٹی ورنیکیولر اسکیم قائم کی تھی (ا(
جس کا ایک رکن مولانا شبلی کو بھی نامزد کیا گیا تھا، اس میں اردو نصاب کا مسئلہ زیر بحث تھا، دیگر ارکان کمیٹی کی غالباً یہ کوشش تھی کہ اردو کی جڑیں کھوکھلی کردی جائیں، ابو الکلام آزاد کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"۲۰/نومبر کو الہ آباد میں اردو نصاب یونیورسٹی کی کمیٹی ہے،
اردو کے مٹائے جانے کے سامان ہیں، میں بھی ممبروں میں سے ہوں،
اس لئے جانا پڑے گا"۔(۲)

وہاں مولانا شبلی نے جب یہ دیکھا کہ کمیٹی والے اردو کو ختم کرنے کے درپے ہیں تو انھوں نے اردو کے تحفظ اور بقا کیلئے ایک یادداشت مرتب کی اور کمیٹی کے سامنے پیش کی، ۱۶/جنوری ۱۹۱۲ئ کو تحریر فرماتے ہیں:

"اردو کی قسمت کا فیصلہ فروری میں ہوگا، پنڈت سندر لال وغیرہ
سے مقابلہ ہے، مسٹر برن بھی ادھر ہی ہیں، میری یادداشت پر جلسہ
ملتوی ہوگیا تھا، اب لکھ کر بھیج دی، اردو کو ہندی کرنا چاہتے ہیں یعنی
آدمی کو بندر علی زعم ڈارون"۔(۳)

شبلی نے یادداشت مرتب کرکے ارکان کے پاس بھیجی لکھتے ہیں:

(ا)مولوی سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں ۱۹۱۲ء لکھا ہے لیکن مکاتیب سے ۱۹۱۱ء میں اس کمیٹی کا وجود ظاہر ہوتا ہے۔
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۶۸
(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۹۶

"میں نے جو یادداشت لکھی تھی، انگریز اور ہندو ممبر دونوں نے حرف بحرف اس سے اتفاق کیا اور اردو ناگری کی حالت میں آنے سے رک گئی"۔(۱)

اس طرح مولانا شبلی کو اس کمیٹی میں بھی کامیابی رہی اور ان کی موجودگی کی وجہ سے اردو کو اپنے دشمنوں کے ہاتھوں نقصان نہ پہنچ سکا، اس کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں:

"تسلیم۔ میں اردو ورناکیولر (۲) اسکیم کی شرکت کی غرض سے الہ آباد گیا تھا، مسٹر برن نے چند نہایت مضر تجویزیں اردو کے حق میں پیش کی تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ رمائن بھاشا انٹرنس کے امتحانات میں لازمی کردی جائے اور اردو جو مدارس میں ہے وہ ایسی کردی جائے کہ ہندی بن جائے، عجیب منطقی دلائل گھڑے تھے"۔(۲)

اس مخالفت کے باوجود مولانا نے اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور اپنی بات منواکر رہے، کچھ عرصہ کے بعد مولانا کو ایک اور کمیٹی کا بھی ممبر بنایا گیا جس کو حکومت نے اس غرض سے قائم کیا تھا کہ سرکاری اسکولوں میں مذہبی تعلیم جاری کی جائے، لیکن مولانا کے پھر کسی مکتوب سے اس کمیٹی سے متعلق کسی اور بات کا علم نہیں ہوتا۔

انجمن ترقی اردو

مولانا کو اردو سے جو محبت تھی اور انھوں نے اس کی حفاظت اور بقا کیلئے الہ آباد کی نصاب کمیٹی میں جو کام کیا وہ اوپر کے بیان سے واضح ہے، انگریز حکومت کی پالیسی ہمیشہ سے یہ رہی کہ ہندوستانیوں کے سامنے ایسے مسائل لائے جائیں جس سے آپس میں اختلاف پیدا ہوں، زبان کے مسئلہ کو بھی ایسا ہی رنگ دیا جانے لگا، کبھی ناگری رسم الخط لکھنے کی اجازت دے کر اردو کے حامیوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کی جاتی اور کبھی ہندی کی اس

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۷۰

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۸۷ ، ۱۸۸

طرح پشت پناہی کی جاتی کہ محبان اردو کے جذبات مجروح ہوتے، ان حالات کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ حامیان اردو، اردو کی بقا اور ترقی کے منصوبے سوچتے، چنانچہ دسمبر ۱۹۰۲ئ میں دہلی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اس میں متعدد شعبے قائم ہوئے جس میں سے ایک شعبۂ اردو بھی تھا جس کو بعد میں انجمن ترقی اردو کا نام دیا گیا اور مولانا شبلی اس کے پہلے معتمد (سکریٹری) بنائے گئے، مکاتیب شبلی میں انجمن ترقی اردو کے متعلق سب سے پہلا مکتوب ۱۱/ اپریل ۱۹۰۳ء کا ہے اور مولوی حمید الدین کے نام ہے، لکھتے ہیں:

"اردو سکشن کی کارروائی زور وشور کے ساتھ شروع کرتا ہوں"۔(۱)

حقیقت میں انھوں نے انجمن کے لئے کافی زور وشور سے کام شروع کردیا، ایک ماہ بعد جو خط لکھا اس میں لکھتے ہیں:

"انجمن ترقی اردو کی کاپی بھیجتا ہوں، ارکان اعانت اور خریداروں کے نام بھیجنے چاہئیں"۔(۲)

اپنے احباب کو بھی اس طرف متوجہ کرتے ہیں تاکہ وہ بھی ان کا ہاتھ بٹائیں اور اردو کو ترقی دینے میں حصہ لیں، مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

"اردو کے ساتھ آپ کو جو عشق ہے، اب اس کے اظہار کا موقع ہے، دستور العمل ارسال ہے، جو کچھ ہوسکے کیجئے"۔(۳)

بہرحال وہ چاہتے تھے کہ اردو سے محبت رکھنے والے دامے، درمے، سخنے جس طرح بھی ہوسکے اردو کی خدمت کریں نواب علی حسن سے دریافت کرتے ہیں:

"کیا قواعد انجمن آپ کے پاس نہیں بھیجے گئے ارشاد ہو تو اب بھیج دوں"۔(۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۳

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۴

(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۷۲

(۴)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۴۷

ایک طرف تو مولانا کو رکنیت اور لوگوں سے امداد حاصل کرنے کی فکر تھی تو دوسری طرف اشاعتی کام بھی پیشِ نظر تھے، اوپر کے مکتوب میں ہی لکھتے ہیں:

"انجمن کی طرف سے میں مصحفی اور میر تقی وغیرہ کی مصنفہ تذکرۃ الشعرا چھپوانا چاہتا ہوں، کیا آپ کے کتب خانہ میں ان تذکروں میں سے کوئی ہے"۔

انجمن کی طرف سے جو کتابیں مولانا چھپوانا چاہتے تھے پہلے ان کی ایک فہرست تیار کرلی اور پھر تیزی سے کتابت اور طباعت کا کام شروع کردیا، انجمن ترقی اردو جو بھی کام انجام دیتی اس کی رپورٹ علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوتی رہتی جس سے اس کی ترقی کی رفتار کا اندازہ کیا جاسکتا تھا، ایک اور صاحب ذوق مولوی ریاض حسن خاں خیال کو تحریر فرماتے ہیں:

"آپ کا نام ارکان اعانت کی فہرست میں درج کیا گیا اور مستقل خریداروں کے رجسٹر میں بھی درج کیا گیا، آپ کے خط آنے سے پہلے دو جگہ سے اطلاع آئی، ایک اور صاحب نے عامۂ دانشوراں کا ترجمہ شروع کر دیا ہے، لیکن ابھی دفتر میں نمونہ نہیں آیا"۔(۲)

غالباً خیال تھا کہ نامۂ دانشوراں کا ترجمہ کریں، مولانا شبلی ان کو اس خصوص میں مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نامۂ دانشوراں کے ترجمہ میں بعض بعض جگہ ابہام وتفصیل کیلئے اور کتابوں کی طرف بھی رجوع کرنا پڑے گا، غالباً آپ نے خود اس کا اندازہ کیاہوگا"۔(۳)

انجمن کے کاموں کی تفصیل نہ صرف گزٹ میں شائع ہوتی رہتی بلکہ وہ بعض احباب کو فرداً فرداً بھی کتابوں کی طباعت سے متعلق مطلع کرتے رہتے تھے، محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

"انجمن کی تیار کردہ کتابیں زیر طبع ہیں میں نے میر انیس کے

---

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۵۵

(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۵۵

کلام پر ایک مفصل ریویو لکھا ہے جو ایک کتاب کی صورت میں
شائع ہوگا"۔(۱)

عبد الحکیم دسنوی کو اطلاع دیتے ہیں:

"کتب مشتہرہ میں سے ہربرٹ اسپنر کتاب چھپ گئی اور
عنقریب شائع ہوگی، باقی زیر طبع ہیں"۔(۲)

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا شبلی انجمن کے کاموں میں کس قدر مصروف رہتے تھے، بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انجمن کے دفتر میں اسٹاف بھی بہت کم تھا اس لئے خط وکتابت بھی انھیں کو کرنی پڑتی تھی، ان کی مصروفیت ایک مکتوب کے ذریعہ اس طرح ظاہر ہوتی ہے:

"میں اردو کے قصہ میں بہت عدیم الفرصت ہوگیا ہوں، جو
وقت بچتا ہے بالکل خط وکتابت میں مصروف ہوجاتا ہے ، جواب سے
مطمئن کرو"۔(۳)

۱۹۰۴ء کے بعد انجمن ترقی اردو کے سلسلے میں شبلی کا کوئی مکتوب نظر نہیں آتا، غالباً ۱۹۰۴ء کے آخر میں مختلف مصروفیات کے سبب وہ انجمن کی معتمدی (سکریٹری شپ) سے مستعفی ہوگئے تھے۔

شبلی کی شاعری

علامہ شبلی کی تصنیفی اور ادبی دلچسپیوں کے ساتھ ان کی شاعری کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ شبلی کی شاعری پر ایک علاحدہ مقالہ لکھا جاسکتا ہے لیکن اس پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں، شبلی بحیثیت شاعر اتنے مشہور نہ ہوئے جتنے خود ان کے ہم عصر مولانا حالی تھے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شبلی نے زیادہ تر فارسی میں شعر کہے ہیں، یہاں ہم مختصر طور پر ان کی شاعری کو صرف مکاتیب کی روشنی میں پیش کریں گے اس طریقے سے خود شبلی کا خیال

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۷
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۹۰
(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۵

اور ان کی رائے اپنی شاعری سے متعلق معلوم ہوجائے گی اس لئے کہ وہ اکثر جگہ خود اپنے کلام پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں اس کے علاوہ خود شاعری کے بارے میں ان کے بیش بہا خیالات کا اظہار بھی ان مکتوبات میں ملتا ہے، علی گڑھ جانے سے قبل بھی شبلی شاعر تھے لیکن علی گڑھ کے ماحول نے اس ذوق کو نکھارا، وہاں کے دوران قیام میں جو غزلیں، نظمیں اور اشعار موزوں ہوئے ان کا کچھ حال خطوں میں پایا جاتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکثر تنہائی میں شبلی شعر موزوں کیا کرتے تھے لکھتے ہیں:

> ''آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کرلیتا ہوں، رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی دو تین شعر مزے کے ہیں، تمہیں بھیجتا ہوں، نظام کا قصیدۂ تہنیت لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر لکھتا نہیں''۔(۱)

شبلی کی طبیعت میں خوشامد اور دوسروں کی بیجا تعریف کرنے کا جذبہ نہ تھا لیکن اس کے باوجود مکتوبات میں ان کی مدحیہ نظمیں بھی ملتی ہیں خصوصاً جب کوئی مہمان خاص علی گڑھ آتا تو اس کی شان میں یہ اپنے اشعار پڑھتے اور داد تحسین حاصل کرتے۔

علامہ شبلی کے بارے میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ان کو اپنی عظمت کا احساس تھا، خود اپنی شاعری کے سلسلے میں ان کا کچھ ایسا ہی تاثر ہے، ایک مکتوب میں اپنی تعریف دوسروں کی زبان سے کرواتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی اور ایک صاحب علی حزیں کی غزلیں بغرض محاکمہ دو صاحبوں کے پاس بھیجی گئیں ان میں ایک تو تھے خواجہ عزیز الدین مصنف قیصرنامہ اور دوسرے نیر تھے جو غالب کے عزیز شاگرد تھے، شبلی کی غزل دیکھنے کے بعد دونوں نے تسلیم کیا کہ:

> ''اہل زبان کا کلام ہے، نیر نے تو بہت تعریف لکھی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے، دونوں صاحبوں کا خط میں نے رکھ چھوڑا ہے، خط میں یہ نہیں ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ غزلیں کس کی تصنیف ہیں بلکہ

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۶۵

اسی لئے دونوں کے مقطع اڑا دیے تھے"۔(۱)

شبلی خود کو غالب سے کسی طرح بھی کم نہ سمجھتے تھے، لکھتے ہیں:

"سنئے ایک باریہ قصیدہ لکھنا شروع کیا تھا، اگرچہ ابھی صرف ۲۷/ شعر ہوئے مگر امید ہے کہ امید سے بڑھ کر ہوئے، غالباً غالب سے کم رتبہ کا نہ ہو"۔(۲)

علامہ شبلی نعمانی کا خیال تھا کہ شعر بغیر کسی تاثر کے نہیں کہا جا سکتا بالخصوص نظم ہزار کوشش کے باوجود بغیر کسی خاص فوری تاثر کے نہیں لکھی جا سکتی، بارہا ان کے احباب نے فرمائشیں کیں لیکن مولانا کا کہنا ہے کہ کئی کئی دن طبیعت پر زور ڈالنے کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکے، جب بھی شبلی سے ان کے احباب نے شعر لکھ کر بھیجنے کی فرمائش کی شبلی نے اکثر ٹال دیا، وہ جانتے تھے کہ شعر بغیر چند خاص کیفیات اور تاثرات کے وجود میں نہیں آسکتے، ایک صاحب (ماسٹر محمد شفیع کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میاں عثمان کے صاحبزادے کیلئے نظم کیا لکھوں؟ اب وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی"۔

اسی مکتوب میں علامہ شبلی نعمانی آگے لکھتے ہیں:

"شعر کہنا اب ایسا پہاڑ ہوگیا ہے کہ سابق کے اشعار دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کیا میں نے ہی لکھے ہیں"۔(۳)

یہ مکتوب مارچ ۱۸۹۸ء کا ہے حالانکہ اس کے بعد شبلی نے بے شمار شعر کہے بلکہ کہنا چاہئے کہ اس کے بعد ان کی شاعری شباب پر تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ شبلی فرمائشی شعر نہ کہہ سکتے تھے کیوں کہ یہ ان سے ممکن نہ تھا کہ کوئی ان سے کہہ دے اور وہ فوراً لکھ دیں۔

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۷۶
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۸۷
(۳)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۳۳۶

شبلی نہ صرف شاعر تھے بلکہ ایک اعتبار سے ان کو استاد بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے، انھوں نے مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی جیسے عالم کو شاعری کے سلسلے میں مشورے دیے اور ان کے کلام میں اصلاح فرمائی، شبلی اور شروانی کے متعدد خطوط میں شاعری ہی زیر بحث ہے، مولانا شروانی بھی رفتہ رفتہ خوب کہنے لگے تھے، شبلی کو نکتہ چینیوں کا کم موقع ملنے لگا، لکھتے ہیں:

"غزل دیکھی ماشاء اللہ اب تو آپ بہت پختہ کہنے لگے، اب کے بھی نکتہ چینیاں کرتا ہوں لیکن زبردستی ڈھونڈھ کر نکالی ہیں"۔(۱)

ایک اور موقع پر جب کہ شروانی نے ایک نعت لکھ کر بھیجی تھی تو حسان (جو جاہلیت کا نامور شاعر تھا) کا ذکر کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:

"لیکن اسلام آیا اور نعت کہنی شروع کی تو ان کا کلام رتبہ سے گر گیا"۔

آگے لکھتے ہیں:

"مقصود اس دراز نفسی سے یہ ہے کہ آپ بھی اس میدان میں نہ آیئے، ثواب مقصود ہے تو درود پڑھ لیا کیجئے، معاف فرمایئے، نعت کی غزل صرف پھیکی نہیں بلکہ غلطیوں سے مملو ہے"۔(۲)

اس سے زیادہ صاف اور کھلے الفاظ میں کیا تنقید ہوسکتی ہے، شبلی کو جب اشعار پسند آتے تو وہ ضرور تعریف کرتے اور دل کھول کر تعریف کرتے، ایک مکتوب میں مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

"خط پہنچا، خدا کی قسم غزل کی غزل مرصع ہے اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے" ع اگر برافگند از رخ نقاب راچہ کنم" لیکن داد دینے کا مزہ رو در رو ہے"۔(۳)

اکثر اوقات وہ اپنے تازہ اشعار خطوں میں نوٹ کرکے اپنے مختلف احباب کو بھیجوایا

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۳۰
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۳۲
(۳)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۴۵

کرتے تھے، بالخصوص مولانا شروانی کے نام مکاتیب ان کے چیدہ چیدہ اشعار کا اچھا مجموعہ ہیں، بمبئی کے دلچسپ ماحول میں شبلی نے جو اشعار کہے ہیں اس کا بھی کافی ذخیرہ شروانی کے خطوط میں موجود ہے، لکھتے ہیں:

”غزلیں چھپنے کو دیتا ہوں، ایک غزل کا ایک شعر مجھ کو مختلف وجوہ سے بہت پسند آیا آپ کو لکھتا ہوں، واقعیت اور اظہارِ قدرت پر نظر کیجئے، نہاں کردہ ایم ، عیاں کردہ ایم ما طرح ہے“۔(مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۶۴)

ایک مکتوب میں علامہ شبلی اپنی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

”میری شاعری محض عطائی ہے، نہ کبھی اس میں اشتغال رہا نہ برسوں کچھ کہنے کا اتفاق ہوتا“۔(۱)

لیکن اس کے باوجود شبلی جب بھی کہتے لاجواب کہتے تھے، ایک طرف اگر عشقیہ شاعری کے میدان میں یہ پیش پیش تھے تو دوسری طرف قومی شاعری میں بھی کچھ کم نہ تھے، ان کی مدحیہ شاعری کے نمونے بھی موجود ہیں ان کے کلام میں مزاح اور لطافت کی چاشنی بھی ہے، پیر کی معذوری کے زمانے میں ایک دعوت کا رقعہ آیا تھا اس کا جو دلچسپ جواب لکھا اس کا تذکرہ ایک مکتوب میں یوں کرتے ہیں:

”آج میر اکبر حسین صاحب کے یہاں سے دعوت کا رقعہ آیا تھا، میں نے جواب میں لکھا:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف وکرم کا مجھے انکار نہیں
حلقۂ درگوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۵۷

لیکن اب میں وہ نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا

اب تو اللہ کے اقبال (۱) سے تیمور ہوں میں

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلیؔ ورنہ

جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں"(۲)

ممبئ میں مولانا کا وقت جس پرلطف انداز میں گزرتا تھا اس کا ذکر ہم ایک علاحدہ باب میں کریں گے یہاں صرف اس قدر اشارہ کردوں کہ شبلی کی غزلوں کیلیۓ ممبئ کی سرزمین بڑی زرخیز تھی، لکھتے ہیں:

"غزل کدہ بمبئ میں آگیا ہوں، لیکن افسوس ہے کہ ابھی آب وہوا میں وہ زور نہیں آیا"۔(۳)

ممبئ کے قیام اور پھر وہاں کی یادوں میں مولانا شبلی کے قلم سے اشعار موزوں ہوکر اس روانی کے ساتھ نکلے تھے کہ دو مجموعے تیار ہوگئے یعنی بوۓ گل اور دستۂ گل۔ان دونوں مجموعوں سے متعلق شبلی ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"بوۓ گل کی نسبت تمام اہل نظر کی رائے ہے کہ دستۂ گل اور اس میں جذب وسلوک کا فرق ہے، واقعی دونوں کے شان نزول اسی قدر مختلف ہیں جس قدر دونوں کے جوش وسرمستی میں فرق ہے، ایک شعر میں خود یہ راز کھل پڑا ہے:

یا جگر کاوی آں نشتر مژگان کم شد ☆ یا کہ خود زخم مرا لذت آزار نماند

لیکن مولانا حالی سب سے مختلف الرائے ہیں، وہ بوۓ گل کو حال بتاتے ہیں اور دستۂ گل کو قال ع: بہ بیں تفاوت الخ"۔(۴)

---

(۱)مکتوب ۳۰۵ر میں اقبال کے بجائے افضال ہے، اور وہی صحیح ہے، دکن ریویو میں یہ نظم اس زمانے میں چھپی تھی

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۸۳

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۹۵

(۴)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۸۹ ، ۱۹۰

علامہ شبلی کے ذوق شاعری اور بالخصوص فارسی شاعری سے لگاؤ نے انھیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ فارسی شاعری کی ایک تاریخ لکھ ڈالیں، چونکہ بچپن سے ان کا ذوق اور رجحان اس طرف تھا اس لئے شعر العجم جیسی تصنیف وجود میں آئی۔ آخری عمر تک بھی وہ غزلیں کہتے رہے لیکن رنگ بدلتا رہا اور عمر کے ساتھ اس میں فرق آتا گیا، ۱۹۱۱ئہ کے ایک مکتوب میں خود لکھتے ہیں:

"غزلیں ہو رہی ہیں لیکن پھیکی، کہاں تک؟ آخر عمر اور سنہ کا بھی کچھ تقاضا ہے"۔(۱)

بہرحال شبلی بحیثیت شاعر کم مرتبہ نہیں، اردو اور فارسی شاعری میں ان کا درجہ متعین کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن یہاں بھی ان کی عظمت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے ، ان کی شاعری سے متعلق مولانا حالی جیسے سنجیدہ اور غیر جانبدار بزرگ نے دستۂ گل ملنے پر ان الفاظ میں اظہار فرمایا تھا:

"غزلیں کاہے کوہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے، غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی وبے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں"۔

حالی آگے لکھتے ہیں:

"میرا ارادہ تھا کہ اپنا فارسی کلام نظم ونثر جو کچھ ہے اس کو بھی چھپواکر شائع کردوں مگر دستۂ گل دیکھنے کے بعد میری غزلیں خود میری نظم سے گر گئیں"۔(۲)

شبلی کے بعض اشعار خطوط شبلی میں بھی شامل ہیں جن پر آگے کے باب میں بحث ہوگی، چونکہ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، اس لئے شبلی کی شاعری کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیاتاکہ سرسری طور پر پتہ چل جائے کہ ان کی شاعری سے متعلق دوسروں کی کیا رائے تھی اور خود ان کا اپنا کیا خیال تھا۔

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۶۷

(۲)مکتوب مولانا حالی ۱۹۰۸ئہ

علامہ شبلی اور حیدر آباد

فکر روزگار بھی بری بلا ہے جو اکثر اوقات انسان کو دربدر کی خاک چھاننے پر مجبور کردیتی ہے، کوئی اس سے بچ نہیں سکتا، یہ ضرور ہے کہ حالات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے، مولانا شبلی پر ان کے والد کے انتقال کے بعد ذمہ داری اور تفکرات کا ایک بھاری بوجھ پڑگیا، کیونکہ متعدد خطوط کے مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ ان کے والد مقروض ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے، قرض خواہوں کے تقاضوں نے شبلی کو بہت پریشان کردیا، وہ ملازمت کیلئے نکل کھڑے ہوئے، بعض احباب کے مشورے پر حیدر آباد کا رخ کیا جو ہر دور میں علم وادب کا گہوارہ رہا ہے اور اس وقت بھی وہ علم دوست اصحاب کا مرکز تھا، حیدر آباد سے مولانا نے جو خطوط لکھے ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ فروری ۱۹۰۱ئ میں حیدر آباد پہونچے، حیدر آباد جاتے ہوئے ان کا ارادہ تھا کہ بھوپال بھی ٹھہریں لیکن وہ ایسا نہ کرسکے جس کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ”میں ایک مہینہ سے حیدر آباد میں ہوں، آتے ہوئے خیال تھا کہ آپ سے ملتا آؤں گا لیکن سرکار عالیہ کی علالت سے خیال ہوا کہ آپ پریشانی کی حالت میں ہوں گے، بہرحال یہاں آیا تو نواب مدار المہام بہادر نے مجھ کو روکنا چاہا، یہاں ایک خدمت امور مذہبی کی ہے جس کا بجٹ کئی لاکھ کا ہے، یہ خدمت مجھے دی جانے کی تجویز ہوئی لیکن اب تک میں نے منظور نہیں کی“۔(۱)

یہ مکتوب مورخہ ۲۷/مارچ ۱۹۰۱ء صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں صاحب کے نام ہے جو اس زمانے میں بھوپال میں مقیم تھے اور والیۂ بھوپال سے قربت رکھتے تھے، اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت حیدر آباد محکمۂ امور مذہبی کے کسی مناسب عہدے پر مولانا کا تقرر کرنا چاہتی تھی اور انھوں نے اس وقت تک اپنی رضامندی کا اظہار

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۴۶

نہیں کیا تھا، وہ کافی مدت تک اس پیشکش پر غور کرتے رہے، چنانچہ ۷/اپریل کے ایک خط سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ان کا ۴۲۵/روپئے ماہوار کی یافت دیے جانے کا تصفیہ ہوا تھا لیکن:

"میں نے اس سے انکار کیا، چونکہ نواب مدار المہام اس سے زیادہ کے مجاز نہیں، اس لئے حضور میں بڑے زور کے ساتھ تحریری سفارش بھیجی ہے، اس کا جواب نہیں آیا"۔(۱)

مولانا شبلی کی شہرت حیدر آباد میں بھی تھی، جب وہ حیدر آباد گئے تو وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، جلسے ہوئے، تقریریں ہوئیں، جس کا تذکرہ بعض خطوط میں ملتا ہے:

"بے شبہہ یہاں بڑی آؤ بھگت ہوئی، میرے لکچر میں جو لوگوں کے اصرار سے دیا گیا بہت بڑا مجمع ہوا، خود وزیر عدالت صدر انجمن ہوئے، نواب مدار المہام بہادر یعنی وزیر اعظم نے نہایت احترام سے شرفِ نیاز دیا اور مجھ کو یہاں کے قیام کی ترغیب دی"۔(۲)

ایک اور مکتوب میں بھی اس جلسے کا ذکر ہے:

"یہاں ایک بڑا جلسہ میرے لکچر کے لئے ہوا جس میں تقریباً ڈیڑھ ہزار بزرگوں کا مجمع تھا، لکچر کا سبجکٹ علم کلام تھا، ایک صاحب قلم بند کرتے گئے تھے، چنانچہ جس قدر قلم بند ہوا وہ چھپ کر شائع ہوگا"۔(۳)

بہرحال مولانا کا حیدر آباد میں شایان شان خیر مقدم ہوا اکثر عمائدین سے یہ پہلے ہی سے متعارف تھے، چنانچہ قیام بھی ایسی علم دوست ہستی کے پاس تھا جن کا حکومت میں بھی کافی اثر ورسوخ تھا وہ مولوی سید علی بلگرامی کے دولت خانے پر مقیم تھے، غالباً مولوی سید علی بلگرامی ہی کے توسط سے وہ مدار المہام

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۴۸
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۳
(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۴۶

سر وقار الامراء تک پہونچ سکے جنھوں نے امور مذہبی کی کسی خدمت پر ان کے تقرر کا ارادہ کیا تھا لیکن اس یافت پر مولانا رضامند نہ تھے جو ان کو پیش کی گئی تھی۔اوپر کے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور نظام کی خدمت میں زیادہ تنخواہ کے لئے سفارش کی گئی تھی لیکن مولانا زیادہ پر امید نہ تھے کہ حسب خواہ شرف منظوری حاصل ہوگی، اس لئے کہ اس زمانے میں مدار المہام اور حضور نظام کے آپس میں تعلقات خوشگوار نہ تھے جس کا علم مولانا کے بعض مکتوبات سے ہوتا ہے:

''بہت بڑی کامیابی ہوتی لیکن بدقسمتی سے وزیر اعظم اور حضور کے تعلقات کشیدہ ہیں، وزیر اعظم کے اختیارات حسب قانون حضور نے بالکل گھٹا دیے ہیں اور اس وجہ سے ہر کام میں حضور سے اجازت لینی پڑتی ہے، یہ صرف چند روز سے ہوا ہے''۔(۱)

اسی زمانے کے ایک اور مکتوب میں اس طرح لکھتے ہیں:

''حضور اور مدار المہام کی ناچاقی بڑھتی جاتی ہے، آج کل سخت واقعہ یہ پیش آیا کہ سید علی حسن (مولوی مہدی کے بھائی) جو مدار المہام بہادر کے سب سے بڑے رکن تھے، ان کو دفعتہً حضور نے موقوف کردیا، ان کے ساتھ ایک انگریز کو بھی، حیدر آباد میں اس وقت ایک زلزلہ پیدا ہوگیا، تمام لوگ کانپ اٹھے ہیں، خصوصاً ہندوستانی خاص موردِ عتاب ہیں''۔(۲)

اس مکتوب سے نہ صرف حضور نظام اور مدار المہام کی ناچاقی کا علم ہوتا ہے بلکہ ہندوستانیوں کے مورد عتاب ہونے کا بھی، حیدر آباد میں غیر حیدر آبادی بالخصوص یوپی اور شمال کے رہنے والوں کو ہندوستانی کہتے تھے اس لئے کہ حیدر آباد کی حیثیت برٹش انڈیا میں ہمیشہ جداگانہ رہی۔

علامہ شبلی جس زمانے میں حیدر آباد پہونچے، ملکی یا غیر ملکی حیدر آباد آنے پر خوش

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۳

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۴۸

نہ تھا اسی وجہ سے شبلی لکھتے ہیں کہ حیدر آباد میں اس وقت زلزلہ پیدا ہوگیا تھا اور ہندوستانی خاص موردِ عتاب تھے۔ بعض اور خطوں میں بھی اس کا ذکر ہے۔ مولانا شبلی ان حالات کی وجہ سے بڑے پریشان تھے اور انھیں ڈر تھا کہ شاید خود ان کا بھی وہاں زیادہ عرصے رہنا ممکن نہ ہو، لیکن مولانا نے ان حالات کے باوجود حیدر آباد میں چار سال گزار دیے، لکھتے ہیں:

"یہاں کے حالات غالباً تم نے اخباروں میں پڑھے ہوں گے، مختصر یہ کہ دنیا ادھر کی ادھر ہوگئی، مولوی سید علی صاحب وغیرہ نکلے اور بقیہ نکلتے جاتے ہیں، میں بھی دو چار روز کا مہمان ہوں"۔(۱)

مولانا شبلی نے امور مذہبی کی ملازمت قبول نہ کی لیکن ان کے مخلص احباب اس بات کے لئے کوشاں رہے کہ کسی اور مناسب خدمت پر مولانا کا تقرر ہوجائے، اسی اثناء میں حیدر آباد کے حالات بدل گئے، وقار الامراء کے بجائے مہاراجہ کشن پرشاد مدار المہام ہوئے جس کا ذکر مولانا شبلی ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"حیدر آباد کی پولٹیکل زمین میں سخت بھونچال آیا، وزارت کا قبلہ مغرب سے مشرق کی طرف بدل گیا"۔(۲)

۲۷/اگست ۱۹۰۱ءکے اس مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"ہاں میں نے نظامتِ علوم وفنون کی خدمت قبول تو کرلی ہے لیکن اس انقلاب میں دیکھئے یہ خدمت بھی مجھ کو قبول کرتی ہے یا نہیں"۔

حیدر آباد میں اس زمانے میں اکثر مشاہیر اور اہل قلم جمع تھے، خود شبلی کے ایک مکتوب میں یہ تحریر ہے کہ:

"داغ، شرر، سید علی بلگرامی، سید حسین، یادگارانِ زمانہ کو دیکھنا

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۵

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۲۷

چاہوگے تو سب ہی موجود ہیں"۔(۱)

حیدر آباد میں شبلی کو ہم ذوق احباب کی صحبت ملی اور نظامت علوم وفنون کی خدمت۔اس زمانے میں وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بھی تھے، بڑی بات یہ کہ شبلی کو حیدر آباد میں رہ کر تصنیف وتالیف کیلئے بھی کافی وقت ملا اسی لئے ان کی متعدد تصانیف حیدر آباد کے دوران قیام میں ترتیب پائیں اور شائع ہوئیں، نایاب اور نادر کتابیں وہاں ان کے مطالعے میں آئیں لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ حیدر آباد کے ماحول سے زیادہ خوش نہ تھے اس لئے اکثر خطوط میں وہاں کے حالات کی شکایت کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

"حیدر آباد رہ کر انسان خدا کو بھول جاتا ہے"۔(۲)

اسی طرح ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں یہاں آکر پھنس گیا کہ ؎
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے"۔(۳)

۱۹۰۲ء کے وسط میں شبلی کچھ بیمار ہوگئے تھے، تبدیل آب وہوا کی خاطر وقار آباد جاکر چند روز قیام کیا جو حیدر آباد سے صرف چالیس میل پر ایک نہایت پر فضا اور صحت افزا مقام ہے، مولانا شبلی کو وقار آباد بہت پسند آیا، لکھتے ہیں:

"علالت بڑھتے بڑھتے یہ نوبت پہنچی کہ بدن میں خون نہیں رہا، بالکل سفید ہوگیا ہوں، گھر کا ارادہ تھا کہ تمہارا تار پہنچا، مجبوراً وقار آباد چلا آیا، یہ مقام حیدر آباد کا گویا شملہ ہے"۔(۴)

علامہ شبلی نعمانی نے جو خطوط حیدر آباد سے لکھے ان میں ان پریشانیوں کے ساتھ

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۶

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۰

(۳)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۴

(۴)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۴۹

علمی اور ادبی باتیں بھی ہیں، تصانیف کا تذکرہ بھی ہے، لکھتے ہیں:

"یہاں ایک عجیب کتاب دیکھی جو بہت ہی قدر کے قابل ہے، مرزا صاحب نے اپنے انتخاب سے تمام شعراء کے کلام کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا، اس کا بہت عمدہ نسخہ ہے، ایسے بے مثل اشعار انتخاب کئے ہیں کہ اس سے بہتر ہو نہیں سکتا"۔(۱)

اس نادر کتاب کا تذکرہ دوسرے خطوں میں بھی موجود ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"مولوی سید علی صاحب کے کتب خانہ میں عربی مطبوعات یورپ دیکھ کر میں سخت حیرت زدہ ہوگیا ہوں، علمی زمین نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں، کیا کہوں اپنے علما کی بدقسمتی اور اپنی مفلسی پر افسوس آتا ہے"۔(۲)

بعض خطوط میں خود اپنی ہی تصانیف کا ذکر کیا ہے اور اپنے احباب کو وہ اپنے مختلف علمی مشاغل سے بھی وقتاً فوقتاً مطلع کرتے رہتے تھے، مولانا شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے دکن پر ایک نظم لکھنی شروع کی ہے جس کا پہلا مصرع ہے:

"اے دکن! ایکہ بہار چمن جان از تست"

ایک شعر میں وہاں کے اس وقت کے حالات کی طرف اشارہ کیا ہے:

"چوں تو اند کہ زہر پردہ بر آرد صد نقش"
"گرنہ نیرنگی ایں گنبد گرداں از تست"

آگے لکھتے ہیں:

"اور سنئے حیدر آباد کی جامعیت جہاں بیان کی ہے اس انداز سے بیان کی ہے:

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۶

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۳۱

”ہندیاں نیر چو از حلقہ بگوشانِ تواند
ہر چہ زیشاں بود آں نیز کنوں ہاں از تست“
”ہاں تو دعویٰ کن وما نیز مسلم داریم
شبلیِ سحر فن وداغ غزل خواں از تست“ (۱)

حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں مولانا شروانی سے جو مراسلت رہی اس میں شاعری اکثر موضوع بحث رہی، ان کی ایک غزل کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”لیکن داد دینے کا مزہ رو در رو ہے، خدا کے لئے مدراس ضرور آیئے، حیدر آباد اگرچہ دیکھنے کے قابل نہیں رہا، سید حسن، سید علی میں سے کوئی نہیں، عزیز مرزا باہر ہیں، تاہم ع خزاں کشمیر ہم بہارے دارد“۔(۲)

مولانا شبلی وقت کو بہتر سے بہتر گزارنے کی فکر کرتے تھے اور حقیقت میں ملازمت کی جکڑ بندیوں اور ان کی آزاد فطرت میں کوئی مناسبت نہ تھی، وہ ندوہ جانا چاہتے تھے اور اس کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:

”اور سچ یہ ہے کہ صرف ندوہ کے لئے میں نے کالج چھوڑا تھا، گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے اس کا موقع نصیب نہ ہوا“۔(۳)

علامہ شبلی حیدر آباد کے ماحول سے خوش نہ تھے اور قرض بھی آہستہ آہستہ بہت کافی ادا ہوچکا تھا اس لئے وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اس قید سے آزادی ملے، جون ۱۹۰۳ئ کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

”خدا کا شکر ہے کہ قرضہ ہائے کثیر میں سے اب صرف ایک ہزار اور رہ گیا ہے جس کو میں ماہوار ادا کر رہاہوں، باقی سب ادا ہوگئے“۔(۱)

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۳۱
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۴۵
(۳)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۴۰
(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۴۷

جس مقصد سے مولانا نے اتنی زحمتوں کا مقابلہ کیا تھا اور حیدر آباد کی ملازمت اختیار کی تھی وہ مقصد حل ہوگیا، اپنے والد کا چھوڑا ہوا ۲۳ ہزار کا قرضہ انھوں نے ادا کردیا، اب انھیں اطمینان تھا اس لئے انھوں نے اپنی خدمت سے استعفیٰ دے دیا، فروری ۱۹۰۱ئ میں حیدر آباد گئے تھے اور فروری ۱۹۰۵ء میں وہاں سے مستعفی ہوگئے جس کا علم ایک مکتوب سے ہوتا ہے، جس میں مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں:

''میں مستعفی ہوکر وطن آگیا، اگرچہ مدار المہام کو میرے قیام پر اصرار تھا لیکن میں نے آخر ملازمت کے جوئے کو اتارنا ہی مناسب سمجھا''۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی اور علی گڑھ

علامہ شبلی نعمانی کا تعلق علی گڑھ سے کم وبیش پندرہ سال رہا اور یہ ایک ایسا دور ہے جبکہ شبلی کو اپنے مذاق کی صحبتیں اور درس تدریس کا موقع ملا، جو ان کی فطرت اور طبیعت کے عین مطابق تھا۔

علی گڑھ جانے سے قبل شبلی اکثر فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے، ان کے بعض فارسی خطوط ''مکاتیب شبلی'' کے حصہ دوم کے آخر میں شامل ہیں جن کے مطالعہ سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ ان کے والد جو ایک کامیاب وکیل تھے یہ چاہتے تھے کہ شبلی بھی ان کی طرح وکالت کا پیشہ اختیار کریں لیکن شبلی کی طبیعت اس طرف مائل نہ تھی، علی گڑھ سے ایک مکتوب میں جو اپنے چچا کے نام لکھا، رقمطراز ہیں:

''مگر چہ کنم والد قبلہ را جز بوکالت روئے وراہے نیست وبایں آزارہ دلی اگر بوکالت نساختہ باشم، در نظر انصاف مرا دریں میانہ گناہے نخواہد بود''۔(۲)

یہ حقیقت ہے کہ شبلی وکالت میں وہ نام پیدا نہ کرسکتے تھے جو علمی دنیا سے وابستگی میں انھوں نے پیدا کیا مہدی حسن کو علی گڑھ سے ایک خط لکھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یکم فروری ۱۸۸۲ئ کو علی گڑھ کالج کی ملازمت اختیار کی اور وہ فارسی اور عربی کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۰۸
(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۲۰۳

"از یکم فروری بہ کالج ہمی روم، الف، اے وبی، اے فارسی وانٹرس وسکنڈ عربی بمن تعلق دارد"۔(۱)

علامہ شبلی ۱۸۸۱ئ میں ایک مرتبہ علی گڑھ جاچکے تھے جبکہ ان کے بھائی محمد مہدی وہاں زیر تعلیم تھے، سرسید سے بھی اس وقت پہلی مرتبہ شرف نیاز حاصل ہوا تھا مولانا شبلی نے سرسید کی شان میں ایک قصیدہ بھی عربی زبان میں لکھا تھا جو علی گڑھ گزٹ مورخہ ۱۵/ اکتوبر ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا اور حیات شبلی کے صفحات (۱۱۸ تا ۱۲۰) پر بھی درج ہے، اس ملاقات سے سرسید کو مولانا شبلی کی علمیت کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا اس لئے انھوں نے ۱۸۸۳ء (۲) میں مولانا تقرر فارسی اور عربی کی اسسٹنٹ پروفیسری پر کردیا۔

مکاتیب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ابتداءً ڈپٹی محمد کریم کے مکان میں اقامت گزیں تھے، وہاں سے انھوں نے اپنے بعض اعزاء اور احباب کو جو خطوط لکھے اس میں ہر بات کچھ تفصیل سے لکھی ہے، محمد سمیع کے نام ایک خط میں علی گڑھ کی اپنی ابتدائی زندگی کاخاکہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عام قاعدہ کی بات ہے کہ جب کوئی اپنا عزیز کہیں باہر ہوتا ہے تو احباب کی اس عزیز کے یاد آنے کے ساتھ ضرور یہ خیال ہوتا ہے کہ کس مکان میں ہوگا، کیسے بسر ہوتی ہوگی، کیا شغل ہوگا، دوست احباب کیسے ہوں گے، بھائی یہ خیال تمہیں ہو یا نہ ہو مگر میں تمہاری طرف سے فرض کرکے اپنے طریقِ معاشرت کا خاکہ کھینچتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم عبارت کی رنگینی اور شان و شوکت کی تلاش تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دوگے اور سادے فقروں پر قناعت کروگے، میں جس مکان میں رہتا ہوں، شہر کے کنارے پر ہے، یہ مکان ایک مختصر سا مگر خوش قطع مکان ہے، دکھن کی طرف ایک خوش نما محراب دار چھوٹا سا دالان ہے، اس میں خاص میں رہتا ہوں، ایک جانب پلنگ ہے اور زمین پر صاف اور پاکیزہ چاندنی کا فرش کھینچا ہوا ہے،

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۲۰۶

(۲)مکتوب میں ۱۸۸۲ء چھپا ہے

صدر مقام کے دائیں جانب ٹرکی جانماز اور سامنے ایک رنگین اور ہلکا سا ڈسک رکھا ہوا ہے، دیوار میں لیمپ جڑا گیا ہے، جو شب کو دیر تک روشن رہتا ہے، اسی دالان کے متصل ایک جانب ایک حجرہ ہے، جس میں مولوی عبدالغفور صاحب تشریف رکھتے ہیں، اسی دالان کے مقابل دوسری جانب ایک گول کمرہ ہے، جو عزیزی اسحاق کی سکونت کی جگہ ہے اور جو کرسیوں اور میز سے آراستہ ہے، کمرے کے متصل جو حجرہ ہے وہ عزیزی محمد عثمان کے رہنے کی جگہ ہے۔

میرے مکان سے متصل خواجہ محمد یوسف کا مکان ہے اور وہیں ایک شاعر مشہور جو سارے شہر کے استاد اور واقعی سخن سنج اور وہیں رہتے ہیں، مجھ سے اکثر ملتے ہیں اور قیس تخلص کرتے ہیں، خواجہ محمد یوسف سے لطف کی ملاقات ہوتی ہے۔ مولوی سمیع اللہ خان سے بھی ملتا رہتا ہوں بفضلہ عمدہ طور سے ملتے ہیں، میر اکبر حسین صاحب منصف سے تو خوب چھنتی ہے، میرے فارسی اشعار بھی انھوں نے سنے اور داد دی، مدرسہ کے لڑکے بھی میری جماعت کے مہذب اور سخن فہم ہیں۔(۱)

اس مکتوب سے نہ صرف طرز معاشرت کا بلکہ شبلی کے بعض علمی وادبی مشاغل کا بھی علم ہوتا ہے، درس و تدریس کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کا شغل بھی جاری تھا، وہ اپنے اشعار اکثر خطوط میں بعض احباب کے پاس لکھ بھیجتے تھے۔ان کی شاعری کا شہرہ شہر میں بھی تھا اور کالج میں بھی، جہاں ہم نے ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے وہاں اس کا تذکرہ آ چکا ہے، بہرحال علی گڑھ کی فضا میں مولانا شبلی کی عشقیہ شاعری کچھ ماند پڑ گئی تھی اور قومی جذبات نے اس کی جگہ لے لی تھی، اس لیے قومی نظمیں موزوں ہونے لگیں۔

علی گڑھ کے دوران قیام میں بڑی نادر اور نایاب کتابیں شبلی کے زیر مطالعہ آئیں بالخصوص سرسید کے کتب خانے سے انھوں نے بڑا استفادہ کیا، اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۶۰،۶۱

> ''سید صاحب نے اپنے کتب خانہ کی نسبت عام اجازت مجھ کو دی ہے اور اس وجہ سے مجھ کو کتب بینی کا بہت عمدہ موقع حاصل ہے۔'' (۱)

علامہ شبلی کے مطالعے میں زیادہ تر تاریخی کتابیں آئیں۔ اسلام سے محبت تو پہلے ہی سے تھی، تاریخ اسلام کی کتابوں کے مطالعہ نے ان کے ذہن میں یہ تحریک پیدا کی کہ تاریخ اسلام کے موضوعات پر قلم اٹھائیں، ۱۸۸۵ء میں انھوں نے ''مثنوی صبح امید'' شروع کی جس میں مسلمانوں کے تنزل کے اسباب پیش کئے اور علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کو سراہا۔ شبلی کا علی گڑھ کی ملازمت قبول کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو علی گڑھ تحریک سے دلچسپی تھی، سرسید اور ان کی سرگرمیوں سے وہ پہلے سے ناواقف نہ تھے۔ علی گڑھ آکر ان کو سرسید کے قریب رہنے اور ان کی شخصیت کے مطالعہ کا زیادہ موقع ملا، اس لیے کہ ان سے زیادہ وقت سرسید کے کتب خانے ہی میں گزرتا تھا، اس قربت کی وجہ سے سرسید کے خیالات سے متاثر ہونے کا بھی انھیں زیادہ موقع ملا۔ ان میں مذہبی رجحانات تو پہلے ہی سے تھے اس لیے علی گڑھ پہنچ کر وہاں کی فضا میں انھوں نے وہی رنگ گھولنے کی کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعہ، آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سنائوں، یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے، لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے، جس کو وہ لجنۃ الصلوٰۃ کہتے ہیں، ایک بی، اے، سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خواں لوگوں کو پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے، الصلوٰۃ خیر من النوم، پانچوں وقت کی نمازیں بجماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے، بیرونی دبائو کا نام بھی

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۶۳۔

نہیں۔ مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان و شوکت ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چونکہ وہ عامل بالحدیث ہیں آمین زور سے کہتے ہیں، ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رگ میں خون بڑھا دیتی ہے، میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں، مسجد بننے کی تیاری ہے۔"

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا برانگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا۔" (۱)

اس طویل اقتباس کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس دور میں علی گڑھ میں کیسی فضا تھی اور کیا ماحول تھا اس کا اندازہ ہوسکے، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ کے طالب علموں میں نماز کی پابندی اور مذہبی رنگ پیدا کرنے کے شبلی بھی بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔

علامہ شبلی قدیم تہذیب کے نمائندے تھے، لیکن علی گڑھ کے ماحول میں یہ ایسے نہ رہے کہ اجنبی محسوس ہوتے بلکہ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ دیں، انھیں سرسید کی تائید حاصل تھی اور اس زمانے میں سید محمود بھی ان کے ہم خیال تھے، سید محمود کی تعریف کرتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:

"سید محمود صاحب یہیں ہیں اور کالج میں روزانہ جاکر دو صفوں کو دو گھنٹہ تک پڑھاتے ہیں، ایف اے اور بی اے کے لڑکے پڑھتے ہیں اور ان کا بیان ہے کہ ہم نے آج تک ایسی تعلیم نہیں دیکھی تھی اور نہ آئندہ توقع ہے، ان کی کثرتِ معلومات، طرز ادائے مطلب، وسعتِ تحقیقات پر عجیب حیرت سب لوگوں کو ہے۔(۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۵۴، ۵۵۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۸۱۔

مولانا کے خطوط سے علی گڑھ کی مختلف سرگرمیوں اور تقریبوں کا بھی پتہ چلتا ہے، ایک مکتوب میں یہ لکھا ہے کہ جن طالب علموں نے ولایت میں کامیابی حاصل کی ہے ان کا خیر مقدم ہوگا:

> "سید محمود صاحب وغیرہ انگریزی میں اور صرف میں اردو میں اسپیچ کے لیے منتخب ہوئے ہیں، دعوت بھی ہوگی، میں شاید کوئی نظم اس وقت پڑھوں۔"(۱)

کہیں مدبر الملک وزیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسن صاحب وزیر ریاست پٹیالہ کے کالج آنے کا ذکر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> "ان کے لیے کالج میں خوب جلسے ہوئے، مجھ سے نہایت شوق سے ملے، وہ مجھ کو پہلے سے جانتے تھے، جلسۂ دعوت میں سید محمود کی فرمایش سے میں نے چند بند فارسی (۱) میں لکھے اور کھانے کے بعد پڑھے، عجیب سماں بندھ گیا تھا، تمام حضارِ مجلس حقیقت میں بے تاب ہوگئے، سید محمود صاحب اٹھ اٹھ کر ہر بند کو کئی بار پڑھواتے تھے۔"(۲)

سر سید اور سید محمود کی صحبتوں نے شبلی کے خیالات کو بھی متاثر کیا وہ بعض باتوں میں ان کے ہم خیال بن گئے وہی باتیں جو پہلے پسند نہ ہوں گی، اب ان میں مضائقہ نہ تھا چنانچہ وہ پہلی مرتبہ فوٹو کھنچوانے پر آمادہ ہوگئے حالانکہ اس دور کے اکثر علماء اور ممکن ہے خود ان کے استاد مولوی فاروق چریاکوٹی بھی اس بات کو جائز نہ سمجھتے ہوں گے لیکن شبلی لکھتے ہیں:

> "سید صاحب مجھ سے اصرار کرتے ہیں کہ تم اپنا فوٹو لو، یہاں کا فوٹوگرافر نہایت استاد ہے۔"

اسی مکتوب میں علامہ شبلی نعمانی صاحب آگے لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۸۲۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۸۳

”جناب سید صاحب اپنے حالاتِ سفر لکھنا چاہتے ہیں، ان کی
تصویریں بھی ہوں گی، میری تصویر اسی غرض سے مانگتے ہیں مگر ابھی یہ
بات کہنے کی نہیں، اپنے ہی تک رکھنا۔“ (۱)

اس کے بعد بھی ایک موقع پر علامہ شبلی نے اپنی تصویر بنانے کی اجازت دی تھی جبکہ عطیہ فیضی کے شوہر مسٹر رحیمن (ایک مشہور یہودی آرٹسٹ جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے) ان کی تصویر بنانا چاہتے تھے، اس کا ذکر بھی بعض خطوط میں ملتا ہے، فوٹو کھنچوانے کا معاملہ کوئی اہم بات نہیں لیکن اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ علامہ شبلی چھوٹی چھوٹی باتوں کی مخالفت پر اڑ جانا، ان کو جائز اور ناجائز ٹھہرانا پسند نہ کرتے تھے بلکہ وہ بعض اہم امور کی طرف متوجہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلام کی صحیح اسپرٹ کو سمجھیں اور تعلیم بھی ایسی حاصل کریں کہ نہ مذہب سے بے بہرہ ہوجائیں اور نہ لکیر کے فقیر بنے رہیں۔

علامہ شبلی انگریزوں کے بھی سرے سے مخالف نہ تھے بلکہ ان کی خوبیوں کی تعریف کرنے میں انھیں کوئی پس و پیش نہ تھا، ۱۸۸۷ء میں انھیں نینی تال سرسید کے ہمراہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں سے اپنے والد کو ایک خط لکھا جو انشا پردازی کا ایک اچھا نمونہ ہے، علامہ شبلی پہاڑ کی چڑھائی پر جیسے چڑھتے ہیں، انگریزوں کی ہمت پر آفرین کی صدا بلند کرتے جاتے ہیں، لکھتے ہیں:

”در حقیقت ہم کو انگریزوں سے سبق سیکھنا چاہیے کہ صحت
سے چیزوں پر مقدم ہے اور کوئی کام دنیا میں ناممکن نہیں۔“ (۲)

علی گڑھ کے انگریز پروفیسروں میں ان کے تعلقات پروفیسر آرنلڈ سے زیادہ گہرے تھے، اس لیے کہ آرنلڈ خود بھی بڑے عالم تھے، ان کی صحبت سے مولانا شبلی نے یہ فائدہ اٹھایا کہ جدید اصولوں سے آگاہی حاصل کی اور پروفیسر آرنلڈ نے ان سے عربی سیکھی۔ شبلی کو آرنلڈ کی صحبت نے حقیقت میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع دیا۔

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۸۶
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۱،۲۲۔

جب ۱۸۹۲ء میں آرنلڈ انگلستان جانے لگے تو مولانا شبلی بھی ان کے ہم سفر ہوگئے، آرنلڈ سیدھے لندن چلے گئے اور مولانا قسطنطنیہ کی طرف روانہ ہوگئے، ترکوں سے انھیں غیر معمولی عقیدت تھی اور اس سفر کا ایک مقصد وہاں کی نادر کتابوں کا مطالعہ تھا اور ساتھ ہی اسلامی ممالک کے طرز تعلیم سے استفادہ، ترکی کے بعد انھوں نے شام اور مصر کا بھی دورہ کیا، ان کے پیش نظر ہمیشہ علی گڑھ رہا اور وہ اکثر ان اسلامی ملکوں کی طرز تعلیم سے علی گڑھ کی طرز تعلیم کا موازنہ کیا کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ قوم کے سامنے ایسے نظام تعلیم کی سفارش کریں جو اس کے لیے ہر طرح فائدہ مند ثابت ہو، علی گڑھ کی مالی امداد کے لیے بھی وہ ترکی میں کوشاں رہے، سرسید کو لکھتے ہیں:

> "یہاں کا اخبار اختر جو فارسی زبان میں ہے اور جس کی اشاعت اس کی ششماہی قیمت ۶ روپے ہے، وہ انھی روپیوں کے ساتھ بھیج دیجئے گا، ممکن ہے کہ اس اخبار میں ہمارے کالج کے حالات چھپتے رہیں اور وہ ضرور کچھ نہ کچھ فائدہ دیں گے، یہاں اکثر لوگ ہندوستان کے نام سے بھی واقف نہیں، ورنہ اگر مسلمانوں کے تمام حالات اور ضرورتیں معلوم ہوں تو کالج کو مد ملنا یقینا مشکل نہیں، ہزاروں میل تک یہاں کے اوقاف کا فائدہ پہنچتا ہے۔" (۱)

مولانا شبلی نے ان خطوط میں جو انھوں نے قسطنطنیہ سے لکھے ہیں اپنے تاثرات اور خیالات کا آزادی سے اظہار کیا ہے:

> "افسوس ہے کہ عربی تعلیم کا پیمانہ یہاں بہت ہی چھوٹا ہے اور جو قدیم طریقہ تعلیم تھا اس میں یورپ کا ذرا پر تو نہیں، جدید تعلیم وسعت کے ساتھ ہے، لیکن دونوں کے حدود جدا رکھے گئے ہیں اور جب تک یہ دونوں ڈانڈے نہ ملیں گے اصلی ترقی نہ ہوسکے گی، یہی کمی تو ہمارے ملک میں ہے، جس کا رونا ہے"۔(۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۴۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۶۔

کہیں وہ علی گڑھ کالج کے لیے ترکی زبان کی عمدہ کتابیں خرید نے کا ارادہ ظاہر کرتے جن سے وہاں کی علمی ترقی کا اندازہ ہوسکے اور کہیں کالج کے لیے مفید مشورہ بھی دیا کرتے تھے، اپنے والد شیخ حبیب اللہ کے خط میں لکھتے ہیں:

> ”یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی، ہر کالج کا خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب ہر کالج کا نام لکھا ہوتا ہے، مجھ کو یہ بات نہایت پسند ہوئی، ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا، سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس و پیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھاہے۔“(۱)

بہرحال شبلی کی اس تجویز و تحریک نے حقیقت کا جامہ پہنا اور علی گڑھ کے طالب علموں کا ایک خاص یونی فارم مقرر ہوگیا اور کالر پر علی گڑھ کا مونوگرام لگایا جانے لگا، جو تقسیم ملک تک رائج رہا۔ غرض یہ کہ مولانا شبلی کو علی گڑھ کالج سے گہری دلچسپی تھی، وہ ہر تقریب میں پیش پیش رہتے، لڑکوں کی تربیت اور حقیقی تعلیم ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتی۔ وہ شروع میں سرسید تحریک سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ اس کی کامیابی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے، وہ چاہتے تھے کہ ایک صحت مند نظام تعلیم ملک میں رائج ہو، مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی علوم اور عربی کی تعلیم کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ علی گڑھ کے قیام نے شبلی کے ذہن میں یہ بات بھی بٹھا دی کہ انگریزی تعلیم کا حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اپنے احباب کو اکثر اس طرف متوجہ کرتے نظر آتے ہیں۔ شبلی مشرقی اور مغربی علوم کا ایسا امتزاج چاہتے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کو ایک کامیاب زندگی گذارنے میں مدد دیے۔ اس خصوص میں سرسید اور سید محمود سے ان کی ضرور بحث رہتی ہوگی اور ظاہر ہے کہ نظریات میں یہ ایک اہم اختلاف تھا لیکن سرسید کی علانیہ مخالفت انھوں نے کبھی پسند نہ کی، شبلی کاخیال تھا کہ چند ماہ وہ ندوہ اور اعظم گڑھ میں گزاریں اور چند ماہ علی گڑھ میں۔ سرسید ان کی تائید میں تھے لیکن سید محمود نے اس بات کی مخالفت کی۔

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۳۔

سرسید چاہتے نہ تھے کہ علامہ شبلی علی گڑھ سے اپنا تعلق بالکل ہی منقطع کرلیں، وہ شبلی کی طبیعت سے واقف تھے اس لیے چھ ماہ ندوہ اور چھ ماہ علی گڑھ کے قیام پر رضامند ہوگئے، سرسید کی زندگی تک تو کوئی غیر معمولی تلخی پیدا نہ ہوئی۔ ۲۷مارچ ۱۸۹۸ء کو سرسید کا انتقال ہوگیا، شبلی کو بڑا صدمہ ہوا جس کا اظہار ایک عربی خط میں اس طرح کرتے ہیں کہ:

ترجمہ ''قومی عمارت کے ستون ہل گئے ...... ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا''۔(۱)

شبلی علی گڑھ سے دلبرداشتہ تھے ہی، سرسید کی وفات نے علی گڑھ سے ان کا دل بالکل پلٹ دیا۔ سید محمود چند انگریزوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی بنے ہوئے تھے، شبلی سے ان کی ناخوش گواریاں بڑھتی گئیں اور مئی ۱۸۹۸ء میں شبلی نے پہلے چھ ماہ کی رخصت لی اور پھر استعفیٰ دے کر علی گڑھ سے تعلق منقطع کرلیا۔ حقیقت یہ تھی کہ شبلی کے لیے وہ ماحول اب سازگار نہ تھا، سید محمود کی پالیسی قابل اعتراض ہوتی جارہی تھی، مولانا حالی بھی ایک مکتوب میں جو ۱۸ ستمبر ۱۸۹۹ کو شبلی کے نام لکھا تھا یوں اظہار فرماتے ہیں:

''سید محمود کی بے اعتدالیاں اب حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں اورلوگوں کو ان کی آڑ میں کالج کے درہم برہم کرنے کا خاصا موقعہ مل گیا، بہر حال اس سے یہ بات واضح ہے کہ علی گڑھ سے تعلق منقطع کرلینے کی ذمہ داری شبلی پر نہیں بلکہ حالات پر ہے ،جو اس زمانے میں پیدا ہوگئے تھے۔''

مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں شبلی اور علی گڑھ کے تعلق سے جو چند باتیں بیان کی ہیں وہ سرسید اور علی گڑھ کے بعض پرستاروں کو ناگوار ہوئی ہوں اس لیے ''ذکر شبلی'' کے نام سے محمد امین زبیری نے ایک کتاب لکھی جس میں اکثر جگہ وہ حد سے تجاوز کرگئے ہیں اور شبلی کے رتبہ کو گرانے کی کوشش کی ہے جو ایک ادبی بحث میں کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ یہاں سید سلیمان ندوی اور محمد امین زبیری کے خیالات کو پیش کرنا بے موقع ہوگا، اس لیے ہم نے وہی باتیں پیش کی ہیں جو مکاتیب کی روشنی میں سامنے آئی

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۲۲۷۔

ہیں، اس باب میں اور بہت ایسے موضوعات ہیں جن کو طوالت کی بنا پر نظرانداز کیا جاتا ہے، ویسے تو علامہ شبلی نعمانی کا ہر خط ایک نیا موضوع رکھتا ہے، جس کا احاطہ مشکل کام ہے کیونکہ ایک تحقیقی مقالے میں ریسرچ اسکالر ان موضوعات کو پیش کرسکتا ہے جس سے اس مقالے کی تشنگی پوری ہوسکے لیکنتاہم بعض ضروری موضوعات سے صرفِ نظر ناممکن ہے۔اس لئے ذیل میں ان کی مجملاً نشاندہی مناسب ہے۔اور وہ یہ ہیں:

"شبلی کی مخالفت کے محرکات، زمانہ کی حق ناشناسی کی شکایت، احساس عظمت، سادگی اور قناعت پسندی، شبلی اور بمبئی کی رنگینیاں، شبلی اور خاندان فیضی، عطیہ سے متعلق شبلی کی تجویزیں، عطیہ کی یورپ سے واپسی، عطیہ کی لکھنو میں آمد، شبلی، زہرا خط و کتابت، عمروں کا تفاوت، شبلی اور عورت، عطیہ کی قدردانی، شبلی اور موسیقی، مہمان نوازیاں، بدگمانیاں عطیہ کی شادی وغیرہ۔

میرے تحقیقی مقالے کا تیسرا باب "مکتوبات شبلی کے مکتوب الیہ کا مختصر تعارف" کا ہے اس میں مکتوبات شبلی کے مکتوب الیہ کا معتبر اور مستند تعارف پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

***

3th Chapter

باب سوم

مکتوبات شبلی کے مکتوب الیہ کا مختصر تعارف

کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے، کسی شخص کی طبیعت ،اس کے اخلاق اور کردار کا اندازہ بڑی حد تک اس کے ملاقاتیوں اور احباب سے لگایا جاسکتا ہے۔مولانا شبلی کے ملاقاتیوں کا دائرہ تو بہت وسیع تھا اس میں ان کے ایسے عقیدت مندوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، جو ان کی علمیت سے مرعوب تھے، لیکن حقیقی احباب کا دائرہ اتنا وسیع نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ حقیقی دوستوں کی تعداد ہمیشہ کم ہی ہوا کرتی ہے۔ان دونوں گروہوں میں کچھ ایسے افراد بھی تھے جن سے ان کے تعلقات ضرور تھے لیکن پھر بھی انھیں دوست احباب کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا، مکاتیب شبلی کے مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی کے مخاطب کچھ تو ایسے حضرات تھے جن کو زندگی میں مولانا نے بمشکل دوچار خط لکھے ہوں گے اور بعض ایسے تھے جن کو تقریباً ہر روز انھوں نے مخاطب کیا، اس بات سے ان کے تعلقات کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے، ان میں بھی بعض ایسے ہیں جن کے نام لکھے ہوئے خطوط سے بے تکلفی ظاہر ہوتی ہے، شبلی کے جو بھی مخاطب ہیں ان سب میں جو بات مشترک نظر آتی ہے، وہ ہے علم اور مذہب سے دلچسپی اور ذوق ادب۔

مولانا شبلی کے تعلقات جہاں ایک طرف سرسید احمد خاں سے تھے تو دوسری طرف ندوہ کے بعض طلباء سے بھی ان کے قریبی تعلق کا علم ہوتا ہے، بہرحال اس باب میں ہم شبلی کے صرف ان احباب، تلامذہ اور معاصرین کا تذکرہ کریں گے جو مکاتیب شبلی میں نمایاں نظر آتے ہیں اور جن سے شبلی کے مراسم اور تعلقات بھی گہرے تھے، اس فہرست میں سرسید، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، نواب عماد الملک، مولانا سید علی بلگرامی، مولانا حالی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا ابوالکلام آزاد، پروفیسر عبدالقادر، محمد امین زبیری، مولانا

عبدالماجد دریابادی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا حمید الدین، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا شبیر علی، مولوی مسعود علی ندوی، نواب سید علی حسن خاں خیال، مہدی افادی، زہرا بیگم اور عطیہ بیگم فیضی کے نام نامی اہمیت کے حامل ہیں، ان کے علاوہ مکاتیب سے شبلی کے بعض اور احباب اور ہم عصر مشاہیر کا بھی علم ہوتا ہے جیسے ڈپٹی نذیر احمد، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی اکبر حسین، اکبر الہ آبادی، مولوی عبدالحلیم شرر، مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی عزیز مرزا، مولوی اقبال احمد سہیل، خواجہ عزیز الدین عزیز، پروفیسر آرنلڈ، سید محمود، حکیم اجمل خاں، شبیر حسین قدوائی، مولوی عبداللہ ٹونکی، مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ لیکن ان کے نام مولانا شبلی کا کوئی خط مکاتیب شبلی میں شامل نہیں، دوسروں کے خطوط میں ان کا ذکر جہاں کہیں آیا ہے وہ ناکافی ہے اور ان کی مدد سے باہمی تعلقات پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی، اس لیے صرف ان ہی کے تذکرہ پر اکتفا کرنا ہوگا جن کے نام یا تو مولانا شبلی کے خطوط خاصی تعداد میں موجود ہیں یا جن کی مدد سے آپس کے تعلقات پر خاطر خواہ روشنی پڑ سکتی ہے۔

سرسید احمد خاں

سرسید اور شبلی کا آپس میں تعلق قائم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں اس لیے کہ دونوں کے دلوں میں قوم کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، مسلمانوں کی اصلاح ان کے پیش نظر تھی، اردو سے دونوں کو محبت تھی، کتابوں کے وہ دیوانے تھے، مطالعہ دونوں کا وسیع تھا، جہاں اتنی ساری باتیں مشترک ہوں وہاں تعلقات کا استوار ہونا بھی ضروری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید مولانا شبلی سے عمر میں بڑے تھے لیکن ہم مذاقی نے دونوں کو قریب کردیا تھا، مولانا شبلی کالج میں کب اور کس طرح آئے اور سرسید سے تعلق کس طرح پیدا ہوا، ''شبلی اور علی گڑھ'' کے عنوان سے اس کا تذکرہ آچکا ہے۔ خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج میں ملازم ہوئے لیکن سرسید کے نام پہلا خط جو مکاتیب شبلی میں شامل ہے وہ مئی ۱۸۹۲ء کا ہے جبکہ شبلی قسطنطنیہ میں تھے، اس نو سال کے عرصے میں شبلی کو سرسید سے ضرور قربت رہی ہوگی، سرسید کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے

کتب خانے میں نادر کتابیں جمع تھیں اور شبلی کو مطالعہ کا بے حد شوق تھا، علی گڑھ پہنچنے کے سات مہینے بعد انھوں نے اپنے ایک عزیز کو خط لکھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے اپنے کتب خانے کی نسبت ان کو عام اجازت دے دی تھی، اس طرح سرسید سے تقریباًروز ملاقات ہوتی تھی اور تبادلہ خیال کا موقع ملتاتھا، اسی زمانے میں ان کا تصنیفی ذوق پروان چڑھتا رہا۔ یہی زمانہ تھا کہ شبلی نے تاریخ بنی عباس لکھنا شروع کی، پھر ''مثنوی صبح امید'' بھی شایع ہوئی، یہ بات ظاہر ہے کہ شبلی کو ان کی تصانیف کے سلسلے میں سرسید نے ضرور مشورے دیے ہوں گے، شبلی کی تصانیف کا مقصد مسلمانوں کو ان کے ماضی سے واقف کرانا، ان میں اسلام کی محبت پیدا کرنا اور ان کی رہبری کرنا تھا۔ سرسید کا مشن بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھا، دیکھا جائے تو سرسید، شبلی اور حالی ان سب کے پیش نظر مسلمانوں کی فلاح و بہبود تھی اس لیے ان کا آپس میں بہت ساری باتوں پر متفق ہونا بھی لازمی تھا۔

شبلی علی گڑھ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے لیکن خطوط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسید کے اور ان کے درمیان تعلقات افسر اور ماتحت کے نہ تھے بلکہ دوستانہ تھے۔ شبلی نے قسطنطنیہ سے جو خطوط سرسید کے نام لکھے ہیں ان میں کچھ باتیں اپنی رہائش سے متعلق ہیں۔ چند نادر کتابوں کا ذکر ہے، ترکی کے حالات ہیں، کچھ مشورے ہیں، غرض یہ کہ جس بات کا بھی اظہار ہے، بے تکلفانہ ہے۔ سرسید کے ساتھ انھوں نے ہمیشہ تعاون کیا، علی گڑھ کے ہر معاملے میں پیش پیش رہے لیکن جس مسئلہ پر وہ ان سے متفق نہ ہوتے اس کا اظہار بھی کردیتے۔ سرسید کے نام ان کے صرف تین خط شریک مجموعہ ہیں لیکن دوسروں کے خطوط سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ وہ ہر بات میں انگریزوں کی تقلید اور ان کے بے جا اثر کو پسند نہ کرتے تھے، علی گڑھ چھوڑنے کا باعث بھی یہی ہوا لیکن سرسید کو خود ان کا بڑا لحاظ تھا جب انھوں نے خواہش کی کہ وہ چھ ماہ علی گڑھ میں اور چھ ماہ ندوہ اور اعظم گڑھ میں رہیں گے تو سرسید نے اس بات کی تائید کی۔ بعض تذکرہ نگار سرسید اور شبلی کی مخالفت کا ذکر کرتے ہیں لیکن مکاتیب میں کوئی بات ایسی نہیں جو ذاتی اختلافات کا پتہ دے، بجز چند مسائل میں اصولی اختلاف کے۔ شبلی کے دل میں سرسید کی جو قدریں تھی، ''مثنوی صبح امید'' اس کی

مظہر ہے، سرسید اور شبلی کے نظریات میں اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے آل احمد سرور کی یہ وضاحت بڑی معقول ہے کہ:

"سرسید نے مسلمانوں کی دنیا سنبھالی، شبلی نے ان کی دنیا کے ساتھ ان کے دین کی بھی فکر کی۔" (۱)

سرسید اور شبلی کے نظریات میں صرف اسی حد تک اختلاف ہے اس کے علاوہ ان دونوں میں شاید کوئی اختلاف تھا بھی نہیں۔سرسید کی وفات سے شبلی کو جو صدمہ پہنچا وہ ایک عربی مکتوب سے ظاہر ہے جس کے شروع میں یہ شعر تحریر ہے:

"نمی دانم حدیث نام چون است
ہمیں دانم کہ عنوانش بہ خون است"

عربی شعر کا ترجمہ یہ ہوگا:

"قومی عمارت کے ستون ہل گئے یعنی سرسید احمد خاں بہادر اپنے پروردگار کی جوارِ رحمت میں گئے۔یہ سانحہ یکشنبہ ۲۷ مارچ کو پیش آیا اور ہماری قوم کا شیرازہ بکھر گیا، میں کچھ دنوں تک کوئی کام نہیں کرسکتا"۔(۲)

اس سے اس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شبلی کے دل میں سرسید کی کتنی عزت اور عظمت تھی پھر اگر کوئی یہ الزام لگائے کہ شبلی سرسید کی جگہ لینے کے خواہش مند تھے تو وہ محض نادانی پر مبنی ہوگا۔

وقار الملک و محسن الملک

علی گڑھ تحریک کے حامیوں میں نواب وقار الملک اور نواب محسن الملک کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔وقار الملک مشتاق حسین خاں اور محسن الملک مہدی علی خاں سرسید کے نہایت معتمد معاون تھے۔ان دونوں سے شبلی کے تعلقات کا آغاز بھی علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں ہوا۔مکاتیب شبلی میں سید سلیمان ندوی نے محسن الملک کے نام

(۱)مقدمہ "شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں"
(۲)مکاتیب شبلی حصہ دوم ص۲۲۷۔

کے صرف دو خط شایع کیے اور وقار الملک کے نام کا صرف ایک جس میں شبلی نے اپنی تصانیف کا ذکر کیا ہے۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"آپ مجھ سے اڈریس لکھنے کو کہتے ہیں، آپ کے ہوتے میں ایڈریس لکھوں؟ یعنی سورج کو چراغ دکھاؤں۔" (۱)

محسن الملک کے نام جو خط شبلی نے لکھے ان سے ان کے بعض اصولوں کا صاف اظہار ہوتا ہے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دربار داری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آئو بھگت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم"۔(۲)

آگے یہ بھی لکھتے ہیں:

"رہا قوم کی خدمت کرنی، اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کرکے دوچار کو نوکری دلادی جائے۔" (۳)

ان اقتباسات سے ایک تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شبلی محسن الملک سے اس درجہ بے تکلف تھے کہ اپنے خیالات کا آزادانہ اظہار کردیا، دوسری بات یہ کہ وہ جس بات اور جس ماحول کو پسند نہ کرتے تھے اس کا برملا اظہار کرنے میں ان کو پس و پیش نہ تھا۔شبلی کے ایک مکتوب سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ جب وہ حیدرآباد چھوڑنے لگے تو محسن الملک نے انھیں پھر علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"میں سال بھر سے بیمار اور ضعیف ہوں، کوئی دماغی کام نہیں کرسکتا، تصنیف کا مشغلہ بالکل بند ہے، جب کسی کام کرنے کے قابل ہوں گا تو فخر سے اس عہدہ کو قبول کروں گا۔" (۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۳۳۵

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۸

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۹۔

(۴)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۹،۲۰

اس مکتوب کے فٹ نوٹ میں مرتب مکاتیب نے محسن الملک کا جواب درج کیا ہے جس میں لکھتے ہیں:

"یہ خط واپس ہے، منظوری کا عنایت نامہ عنایت ہو، عذر نامسموع براہ کرم ضرور منظور فرمایئے، مجھ پر احسان ہوگا۔" (مہدی)

محسن الملک کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مولانا شبلی کے بڑے قدرداں تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ۱۸۹۸ء میں جب کہ مولانا شبلی بیمار تھے، نواب محسن الملک ان کی مزاج پرسی کے لیے اعظم گڑھ آئے، اپنے بھائی محمد اسحاق کو شبلی تحریر فرماتے ہیں:

"پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے، نواب محسن الملک میری عیادت (۲) کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے، ان کی آئو بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا، لیکن میں اس کی برداشت کر سکا۔" (۱)

جب مولانا شبلی کا پاؤں بندوق سے زخمی ہوگیا تھا، اس وقت بھی محسن الملک کو ان کی صحت کی طرف سے بڑی تشویش تھی، ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہاں نواب محسن الملک نے لکھا ہے کہ یہاں کے مشہور ڈاکٹر دعوت دیتے ہیں کہ آپ کا معالجہ بلا کسی معاوضہ کے کریں گے اور قیام وغیرہ کا بندوبست بھی انھیں کی طرف سے ہوگا۔" (۲)

ایک اور موقع پر جبکہ حکومت مولانا سے خوش نہ تھی نواب محسن الملک نے اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر گورنر سے ان کی سفارش کی اور جو کچھ ان سے متعلق حکومت کو بدگمانیاں تھیں اسے دور کیا، اس کی اطلاع مولانا شبلی کو دی اور شبلی نے مولانا شروانی کو ایک مکتوب میں لکھا:

"وہ نواب لفٹیننٹ گورنر سے ملے اور معلوم ہوا کہ لفٹیننٹ

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۴۱۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ۵۸

صاحب نے میرے متعلق جو گورنمنٹ کو شکوک تھے رفع کردیے۔" (۱)

ان اقتباسات سے دونوں کے درمیان باہمی تعلقات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

نواب عماد الملک

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی سے شبلی کا تعارف سرسید کے ذریعہ ہوا، نواب عماد الملک اس زمانے میں حیدرآباد میں مقیم تھے، نواب صاحب ہی کی اعانت سے مولانا کو حیدر آباد سے منصب مقرر ہوا اور بعد میں اس میں اضافہ بھی۔

جب مولانا شبلی نے وقف اولاد کا مسئلہ اٹھایا تھا اس وقت بھی عماد الملک نے مسودہ وقف لکھنے کی پیش کش کی تھی، ایک خط میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"مولوی سید حسین بلگرامی کا خط آیا ہے کہ تم خود آئو تو میں مسودہ وقف لکھ دوں"۔

علامہ شبلی عماد الملک کے بڑے مداح تھے، مولانا ابوالکلام کو حیدرآباد کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"فلک نما اور دولت آباد دیکھنے کی چیزیں ہیں، عماد الملک بھی مغتنماتِ روزگار میں ہیں" (۲)

نواب صاحب کی شخصیت حقیقت میں قابل قدر تھی ان کی علم دوستی نے حیدر آباد کی علمی فضا کو سنوارنے میں بڑا حصہ لیا۔ علامہ شبلی جس زمانے میں حیدرآباد میں تھے عماد الملک کی صحبتوں میں ان کا وقت بڑا پر لطف گذرا اس لیے کہ نواب صاحب بھی بڑے باذوق انسان تھے، شبلی کے ندوہ واپس ہونے کے بعد بھی عماد الملک کا تعاون انھیں حاصل رہا۔ شبلی مارچ ۱۹۱۱ء کے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"نواب عماد الملک بلگرامی نے اپنا کتب خانہ عربی و انگریزی ندوہ کو

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول۔
(۲) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۰،۲۶۱۔

عنایت کیا، سید سلیمان اس کے لانے کو حیدرآباد بھیجے گئے ہیں۔" (۱)

اس گراں قدر عطیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عماد الملک کو شبلی کے مشاغل اور ان کے کاموں سے کتنی ہمدردی اور دلچسپی تھی۔جب عماد الملک نے انگریزی میں قرآن مجید کے ترجمہ کا کام شروع کیا تو مولانا شبلی سے بھی مشورے حاصل کیے، کئی وجہ سے شبلی نے ٹالنا چاہا لیکن نواب صاحب کے خلوص اور کام کی اہمیت نے مولانا شبلی کو حیدرآباد جانے پر مجبور ہی کردیا۔ تحریر فرماتے ہیں:

"میں چند روز کے لیے حیدرآباد آ گیا، مولوی سید حسین صاحب کا ایماء تھا، ترجمۂ قرآن کے متعلق مشورے مقصود تھے، پندرہ پارے ہوچکے، روزانہ وہ کام کرتے ہیں۔" (۲)

بعد میں مولانا ہی کی حسب ہدایت مولوی حمید الدین نے نواب صاحب کے ساتھ مل کر ترجمہ پر نظر ثانی کی۔مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے (ص ۷۹۵) کہ دارالمصنّفین پر نواب عماد الملک کی جو نگاہ لطف و کرم تھی وہ درحقیقت مولانا ہی کے تعلقات کا نتیجہ تھی اور بھی بہت سے خطوط ہیں جو عماد الملک اور علامہ شبلی کے متعلق ہیں جن سے طوالت کی بنا پر صرف نظر کیا جارہاہے۔

مولوی سید علی بلگرامی

مولانا شبلی کے تعلقات جس طرح نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سے تھے اسی طرح سید علی بلگرامی سے بھی تھے بلکہ مولوی سید علی سے ان کے تعلقات زیادہ دوستانہ رہے، مولانا کے حیدرآباد آنے اور ملازم ہونے کے سلسلے میں سید علی بلگرامی کو جب اطلاع ملی تو دوسرے ہی روز اپنے گھر لے آئے اور مہمان رکھا۔مولانا کے مکاتیب سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں سررشتہ علوم و فنون کا ناظم مقرر کیا گیا تھا اور یہ سررشتہ مولوی سید علی بلگرامی کی زیر نگرانی تھا اس لیے یہ کہنا درست ہوگا کہ مولانا شبلی کا نظامت پر تقرر مولوی سید علی بلگرامی

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۴۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۷۱

ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ حیدرآباد میں وزارت عظمیٰ کی تبدیلی کے سبب مولوی سید علی بلگرامی ملازمت سے علیحدہ کردیے گئے، مولانا شبلی کو بڑی تشویش ہوئی۔ اس بات کا اظہار کئی مکتوبات میں کرتے ہیں:

"مولوی سید علی صاحب وغیرہ نکلے اور بقیہ نکلتے جاتے ہیں۔" (۱)

ایک دوسرے خط میں شبلی لکھتے ہیں:

"سید علی نکل چکے اور لوگ نکلتے جاتے ہیں، میرا بھی نفس بازپسیں ہے۔" (۲)

شبلی اورایک خط میں سید علی بلگرامی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"حیدرآباد اگرچہ دیکھنے کے قابل نہیں رہا، سید حسن، سید علی میں سے کوئی نہیں، عزیز مرزا باہر ہیں۔"(۳)

حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں جو شبلی کے حیدرآباد کے دوران قیام میں ہوا کرتی تھیں سید علی بلگرامی بھی شریک ہوتے تھے "چند ہم عصر" میں مولوی عبدالحق نے ان صحبتوں کا ذکر کیا ہے۔

مولانا شروانی

نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کا شمار شبلی کے نہایت قریبی اور مخلص دوستوں میں کیا جاتا ہے، ان کے نام شبلی کا پہلا خط "مکاتیب شبلی" میں موجود ہے، فروری ۱۸۹۹ء کا ہے لیکن پہلی ملاقات غالباً ۱۸۸۸ء میں ہوئی، جبکہ مولانا شروانی نے ان کی تصنیف المامون پر ریویو لکھا تھا۔ خطوط کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان دونوں کے تعلقات تیزی کے ساتھ بڑھتے گئے اور خود شروانی کے الفاظ میں:

"نیاز مخلصانہ محبت سے مبدل ہوگیا"

ایک مرتبہ مولانا شبلی بیمار ہوگئے تھے، ارادہ تھا کہ جیسے ہی صحت ہوجائے گی سب

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول، ص۱۰۵
(۲) مکاتیب شبلی حصہ اول، ص۱۳۰
(۳) مکاتیب شبلی حصہ اول، ص۱۴۵

احباب کو مدعو کریں گے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"اگر خدا نے صحت کامل دی تو میں اپنے تمام خالص دوستوں کو مدعو کروں گا، جن میں مولانا حالی، خواجہ عزیز الدین، میر ولایت حسین وغیرہ ہوں گے، آپ کو بھی تکلیف کرنی پڑے گی، ورنہ اپنے نیاز مندوں کی فہرست سے میرا نام آپ کو نکال دینا ہوگا۔" (۱)

مولانا شروانی اس پر خلوص دعوت کو قبول کیسے نہ کرتے ادھر دعوت گئی ادھر سے جواب آیا، سات دن کے اندر اندر پھر جواب کا جواب اس طرح لکھا گیا:

"کیا آپ واقعی یہاں جلوہ فرما ہوں گے اور کیا درحقیقت ع ؎

'میرے ویرانہ میں ہوجائے گی دم بھر چاندنی'

نامۂ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہوکر کہتا ہوں

'سچ سچ بتا یہ حرف انھیں کے قلم کے ہیں' (۲)

خط کے الفاظ اور اس کا انداز ان دونوں کے آپس کے تعلقات کی غمازی کرتے ہیں۔ علامہ شبلی نے شروانی کو ایسے مخاطب کیا جیسے کسی محبوب کو کرتے ہیں، بہت کم دوست ایسے ہوتے ہیں جن میں اس درجہ خلوص ہوتا ہے۔ علامہ شبلی کی یہ بھی خواہش تھی کہ 'حبیب شبلی' کے مرکب نام سے کوئی تصنیف شائع ہو جیسے کہ ترکوں میں ہوا کرتا ہے۔

علامہ شبلی اور حبیب الرحمن خاں شروانی کے خطوط میں علمی، مذہبی اور ادبی بحثیں ملتی ہیں، مختلف تصانیف پر دونوں رائے زنی کرتے ہیں، ندوہ کے امور میں مشورہ ہوتا ہے، مولانا شروانی اپنے فارسی اشعار شبلی کے پاس بھیجتے ہیں، وہ اصلاح دیتے اور تعریف کرتے جاتے ہیں۔ خلوص کی باتیں بھی ہوتی ہیں اور گلے شکوے بھی۔ ۱۹۰۱ء میں شبلی، شروانی کو نہایت پر شوق انداز میں مدراس آنے کی دعوت دیتے ہیں اور انھیں اس کے بعد کے ایک مکتوب میں یوں مطلع کرتے ہیں۔

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۱۴۔

(۲) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۱۴، ۱۱۵

”میں نے مدراس میں نئی وادی میں قدم نہیں رکھا بلکہ یہ پرانا
کوچہ تھا، جس کی مدتوں خاک چھانی۔“ (۱)

پتہ نہیں یہ کون سا کوچہ تھا جس میں اپنے ساتھ وہ مولانا شروانی کو بھی لے جانا چاہتے تھے بے تکلفانہ انداز تحریر ملاحظہ ہو:

”مبارک مبارک، سلامت سلامت۔ مگر حضرت یہ کل اکھراپن
کیسا؟ خبر تک نہ کی، دعوت میں بولا تو بڑی بات ہے، خیر خوش رہئے،
نیاز مندوں کی خدمت بڑھ گئی یعنی ایک جان کے ساتھ دوجانوں کی
سلامتی کی دعا ذمہ ٹھہری۔“ (۲)

کس خوب انداز میں شروانی کی شادی پر شبلی نے مبارک باد دی ہے۔ شبلی نے ”چمن زار ممبئ کی گل گشت“ اور رنگین صحبتوں“ کے تذکروں سے شروانی کو کبھی محروم نہ کیا۔ اس طرح شروانی کو انکاراز داں کہنا غلط نہ ہوگا۔ مولانا سلیمان ندوی نے حیات شبلی کا مسودہ مولانا شروانی کے پاس بھیجا، شروانی سے بڑھ کر حیات شبلی پر مہر توثیق ثبت کرنے کا حق اس زمانے میں کس کو ہوسکتا تھا، شروانی مسودہ کے ملاحظہ کے بعد مولانا ابوالکلام کو تحریر فرماتے ہیں:

”دل محسوس کرتا تھا کہ علامہ کی صحبت میں حاضر ہوں، لطف
صحبت سے مستفید وفیضیاب ہوں، آہ کیا صحبت تھی، کیا فیض تھا، فخر اس
میں تھا کہ ہر موقع پر ایک نیازمند حاضر خدمت رہتا تھا، شبلی و شروانی
کی زندگی خود اس طرح منوط رہتی کہ جہاں علامہ کا فضل نور افشاں ہے
وہاں شروانی کی نادانی بھی جلوہ بیز ہے۔ والسلام ختم الکلام نیاز نشان
حبیب الرحمن۔“ (۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۳۳
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۱۳۸۔
(۳) مکتوب مورخہ ۲۳/ فروری ۱۹۴۲ء

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر مولانا شروانی کے ساتھ ہی کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی، شروانی اور آزاد ایک مثلث بناتے ہیں، ایسا مثلث جس کے درمیان بے پناہ خلوص، حد درجہ محبت اور غیر معمولی بے تکلفی ہو، آزاد سے شبلی کی ملاقات ۱۹۰۵ء میں ہوئی اور اسی سال یہ الندوہ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، شبلی سے قربت کا موقع ملا، شبلی آزاد کی قابلیت اور صلاحیتوں سے خاصے متاثر تھے۔ حالانکہ دونوں کی عمروں میں کافی تفاوت تھا لیکن ہم ذوقی نے اس تفاوت کو گھٹا دیا اور بے تکلفی نے جگہ لے لی، آزاد کے نام شبلی کا پہلا خط ۲۱/اکتوبر ۱۹۰۵ء کا ہے۔ ابتدائی خطوط میں مولانا شبلی آزاد کو الندوہ سے متعلق مختلف مشورہ دیتے نظر آئیں گے لیکن دو خطوط کے بعد چار سال کا وقفہ ہے درمیان میں غالباً خط و کتابت ترک ہوگئی یا کم رہی ہوگی۔ اس لیے مکاتیب شبلی میں درمیان کا کوئی خط نہیں۔ طویل وقفہ کے بعد لکھتے ہیں:

> ”بھائی! تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کر دی ہے، الیاس احدی الراحتین لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکالگا دیتے ہو خیر جو مرضی، یہ بھی منظور۔“

اسی مکتوب میں جبکہ افتخار عالم نے ان کی سوانح لکھنے کی خواہش کی تھی آگے لکھتے ہیں:

> ”میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا، ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوایئے، بھئی بتا تو نہ دو گے۔“ (۱)

ان اقتباسات سے شبلی اور آزاد کے تعلقات کا بخوبی اظہار ہوتا ہے، شبلی نے آزاد کو لکھنؤ آ کر رہنے کی دعوت دی تا کہ خوب صحبتیں رہیں اور پرلطف دن گزرے۔ لکھتے ہیں:

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۵۱

"میں نے ندوہ کے پہلو میں ایک اچھا مکان لے لیا ہے، اگر
آکر رہے تو وعدہ کرتا ہوں کہ ساتھ بمبئی چلوں گا بہت باتیں کرنے کو
جی چاہتا ہے لیکن قلم ساتھ نہیں دیتا، اس کی منت کیوں اٹھاؤں۔" (۱)

نہ صرف مولانا شبلی بلکہ آزاد بھی خود ان کی صحبت کے خواہش مند رہتے، ان کے خط کے جواب میں شبلی لکھتے ہیں:

"جس قدر آپ کی عنایت و محبت کا یقین زیادہ ہوتا جاتا ہے اسی
قدر آپ کی نکتہ سنجی اور نقادی کی طرف سے بے اعتباری بڑھتی جاتی
ہے کہ آپ میری صحبت کو لطف انگیز اور نسبتاً دوسروں کے مقابلہ میں
قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔"(۲)

مولانا ابوالکلام آزاد شروانی کی طرح شبلی کی بعض دلچسپیوں کے رازداں تھے جب عطیہ اور زہرا فیضی نے الٰہ آباد کی نمائش میں آنے کا خیال ظاہر کیا تو مولانا شبلی نے چاہا تھا کہ ان دونوں کو اپنے بھائی محمد اسحاق کے مکان میں ٹھہرائیں لیکن اسحاق کے پاس پہلے سے مہمان موجود تھے اس لیے ان دونوں بہنوں کو وہ وہاں نہ ٹھہرا سکے لیکن آزاد کو شبلی کچھ اس انداز میں اس بات کی اطلاع دیتے ہیں کہ جاننے والا ہی اس راز کو سمجھ سکتا ہے اور لطف اٹھا سکتا ہے ورنہ جو شبلی فیضی تعلقات سے واقف نہ ہو اسے یہ بات مطلق سمجھ میں نہیں آسکتی، کس قدر پر لطف انداز میں لکھتے ہیں:

"الٰہ آباد کی نمایش میں ایک اور اضافہ ہوا یعنی دیوان فیضی بھی
ہوگا اور وہ اوائل دسمبر میں پہنچ جائے گا، میرے پاس اطلاع آ چکی
ہے، افسوس ہے اس زمانہ میں میاں اسحاق کا کتب خانہ معمور ہوگا، ورنہ
ممکن تھا کہ زیادہ مطالعہ کا موقع ملتا۔" (۳)

ندوہ کی مصروفیات اور وہاں کے مسائل سے متعلق علامہ شبلی آزاد کو بھی مطلع کرتے

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۵۲۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۵۳۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۱۔

رہتے تھے، ندوہ والوں نے ان پر مختلف قسم کے الزامات لگائے تھے جس کا اظہار ایک مکتوب میں اس طرح کرتے ہیں:

”فرد جرم بہت بڑی ہے، خورد برد کا بھی الزام ہے، بہاولپور کے عطیہ کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے، گورنمنٹ سے ایڈ کے متعلق خط و کتابت اکبر الجرائم قرار دی گئی ہے اور سب پر مستزاد الحاد اور زندقہ جن عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامات الاولیاء حق حالانکہ میں تو کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں،، ہاں الٰہی جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے، بھائی حقیقت یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا، کہاں تک صبر کروں، بار بار قلم اٹھاتا ہوں اور پھر رکھ دیتا ہوں، طلبہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں۔“(۱)

واقعہ یہ ہے کہ انسان جس سے بے تکلف ہوتا ہے اس سے تخاطب کا انداز بھی بے تکلفانہ ہوتا ہے اس لیے عبارت میں بھی لطف پیدا ہوجاتا ہے، فرد جرم کی تفصیل بیان کرتے ہیں جس میں ابوالکلام آزاد کی محبت بھی شامل ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ آزاد ہی کو اس کی اطلاع دیتے ہیں، ایک مرتبہ جب آزاد کا کارڈ شبلی کو ملا تو اس کا جس انداز میں انھوں نے جواب لکھا۔ ملاحظہ ہو:

”مجھ کو یہ خیال ہوگا کہ کارڈ کسی اور کو لکھا تھا، پتہ بدل گیا پھر عنوان پر خیال ہوا کہ یہ عنایت بیجا تو میرے ہی لیے مخصوص ہے۔“ (۲)

ایک اور مکتوب کا جملہ ہے:

”میں آج بمبئی جارہا ہوں، گو آپ کے بغیر وہ ویرانے سے بدتر ہے۔“ (۳)

علامہ شبلی بڑے خود دار شخص تھے لیکن پرخلوص دوستوں سے متعلق وہ جانتے تھے کہ ان کی خفگی عارضی ہوتی ہے اس لیے بعض وقت ان کو منانے کی بھی کوشش کرتے۔

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۲۔
(۲) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۵۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۶۔

مولانا آزاد کو لکھتے ہیں:

”آپ کا لہجہ اب تک نہیں بدلا، لیکن بخدا یہ امید قائم ہے کہ کلکتہ پہنچوں گا تو آپ سخت دلی سے کام نہ لے سکیں گے اور ظاہری طور سے سہی لیکن وہی قدیم عنایتیں پھر مبذول ہوں گی اور میرے لیے اسی قدر کافی ہے پھر وہ مجاز رفتہ رفتہ حقیقت بن جائے گا۔“(۱)

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

”ان سب باتوں کے ساتھ یہ تسلیم کرتا ہوں اور ندامت سے منفصل ہوجاتا ہوں کہ جرم سخت ہے بلکہ سخت سے سخت تر لیکن جس سے معاملہ ہے اس کا دل بھی، اسی قدر نرم تر ہے اس لیے جرأتِ معذرت قائم ہے اور رہے گی۔“(۲)

اس تحریر کے بعد کون سخت دل ہے جس کا دل نرم نہ ہوجائے چاہے وہ کتنا ہی ناراض ہو اس مکتوب کو پاکر سب کچھ بھول جائے گا۔ شبلی کو آزاد کی شخصیت سے غیر معمولی دلچسپی تھی، وہ جانتے تھے کہ یہ نوجوان مستقبل کا بہت بڑا آدمی ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے بھی شبلی کی صحبت سے خاطر خواہ فیض اٹھایا۔ آخر دنوں میں جبکہ شبلی سیرۃ النبیؐ کا کام مکمل نہ کرسکے تو وہ چاہتے تھے کہ اپنے مذہبی، قومی اور ادبی کام چند لوگوں کے تفویض کردیں ان میں ایک آزاد بھی تھے۔ انتقال سے چار روز قبل ایک خط آزاد کو روانہ کیا کہ وہ اس اثنا میں مل جائیں تاکہ سیرۃ نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہوجائے لیکن افسوس کہ آزاد وقت پر نہ پہنچ سکے اور علامہ شبلی نعمانی اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ لیکن مولانا آزاد ان صحبتوں کو کیونکر فراموش کرسکتے تھے، ان کے دل میں شبلی کی بڑی قدر تھی ،شبلی کے متعلق مولانا آزاد کا ایک مکتوب قابل ملاحظہ ہے جو مولانا شروانی کو ۲۶/اکتوبر ۱۹۴۰ء کو تحریر فرمایا تھا، شبلی سے متعلق آزاد کے خیالات اور دونوں کے مابین تعلقات کا اس مکتوب سے بخوبی

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۶۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۶۷۔

اندازہ ہو سکتا ہے۔لکھتے ہیں:

"فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگا رنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں سر تا سر مغز بے پوست تھی، بمشکل کوئی مہینہ ایسا گذرتا تھا کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بدل نہ ہوتی، وہ کیا گیے، علم و فن کی صحبتوں کا سر تا سر خاتمہ ہوگیا، مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے، والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا تھا، اس اشتراک عادت نے ایک خاص رشتہ انس پیدا کردیا تھا، جب کبھی یکجائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف و کیفیت کا وقت ہوتا، چائے کا دور چلتا اور علم وفن اور شعر و ادب کے چرچے رہتے۔ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے۔" (۱)

مولانا عبدالماجد دریابادی

مولانا حمید الدین اور مولانا سلیمان ندوی کی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کو بھی علامہ شبلی نعمانی کا ادبی مددگار کہنا درست ہوگا۔مکاتیب کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مولانا کے تعلقات دیرینہ نے تھے، بہت قلیل مدت میں انھوں نے مولانا کا اعتماد حاصل کرلیا۔بالخصوص سیرۃ کی تحریر کے دوران انھوں نے خاصا تعاون کیا، یہ ترجمہ کرتے جاتے تھے اور اس طرح مولانا کا ہاتھ بٹاتے جاتے تھے۔شبلی تحریر فرماتے ہیں:

"دوسری قسط بھی ترجمہ کو پہنچی، ترجمہ کی خوبی مستغنی عن الوصف ہے۔" (۲)

اسی خط میں علامہ شبلی نعمانی، عبدالماجد صاحب کے متعلق لکھا ہے جن سے ان کے معترف ہونے کا ثبوت ملتا ہے لکھتے ہیں:

---

(۱)اقتباس از کاروانِ خیال۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۲۷۷۔

"آپ صرف مترجم نہیں بلکہ مصنف بھی ہیں، اس لیے آپ
کے سوا کوئی اور شخص مشکل سے میرے ارادوں اور خواہشوں کے
موافق کام کرسکے گا۔"

مولانا شبلی چاہتے تھے کہ عبدالماجد صاحب کو سیرۃ کے مستقل اسٹاف میں لے لیں تاکہ ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔ مولانا شبلی کے اکثر خطوں میں (جو مولانا عبدالماجد صاحب کے نام ہیں) ان میں علمی مباحث ہیں، مختلف کتابوں کا ذکر ہے۔ سیرۃ کے سلسلے میں ماجد صاحب سے مشورہ بھی طلب کرتے ہیں اور مختلف کتابوں کے نام بھی بتاتے ہیں اور ان کے پڑھنے کی سفارش بھی کرتے ہیں۔ دونوں بزرگوں میں آپس کے یہ تعلقات آخر تک قائم رہے۔ امین زبیری نے جب "شبلی کی رنگین زندگی" لکھی تو شبلی کی شان میں ان کی یہ حرکت مولانا عبدالماجد دریابادی کو سخت ناگوار گذری۔

مولانا حمید الدین

مولانا حمید الدین مولانا شبلی کے شاگرد، ماموں زاد بھائی، مخلص دوست اور دست راست تھے، یہ قرآن مجید کے بڑے عالم تھے اور مولانا شبلی کی تعلیم وتربیت کا ایک اچھا نمونہ۔

علامہ شبلی سے ان کو بڑی عقیدت تھی اور وہ بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"میں سچ کہتا ہوں کہ میں تمہارے وجود کو اپنی تمام برادری کے
لیے تاج عزت سمجھتا ہوں۔" (۱)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"تمہاری خالصانہ ہمدردی سے طبیعت کو بہت تشفی ہوئی۔" (۲)

---

(۱) مکاتیب شبلی جلد دوم، ص۱۵۔
(۲) مکاتیب شبلی جلد دوم، ص۳۔

مولانا شبلی اپنے خطوط میں اکثر مولوی حمید الدین کو علمی کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کے خطوط میں بھی وہی علمی گفتگو ہو جو مولانا کے اکثر خطوط میں ہوا کرتی ہے، وہی کتابوں کے تذکرے، مضامین اور تراجم پر مشورے اور اپنے کاموں کی تفصیل۔ان کے نام مولانا کے ۷۷ خطوط مکاتیب شبلی میں ہیں، اس کے علاوہ دوسروں کے خطوں میں بھی مولانا شبلی نے مولوی حمید الدین کا اکثر ذکر کیا ہے۔

مولانا شبلی ہر ہر قدم پر مولوی حمید الدین کی ہمت افزائی کرتے تھے۔نواب عماد الملک نے مولانا ہی کے مشورے پر ان کو ساتھ لے کر ترجمہ قرآن مجید پر نظر ثانی شروع کی تھی۔مولوی حمید الدین قرآن پاک کی تفسیر اور مطالب پر بہت گہری نظر رکھتے تھے اس لیے مولانا شبلی تحریر فرماتے ہیں:

> "قرآن مجید کے شبہات کا جواب یورپ کے مقام میں تمام ہندوستان میں کوئی شخص مولوی حمید الدین پروفیسر میور کالج سے بہتر بلکہ برابر بھی نہیں کرسکتا۔" (۱)

نواب عماد الملک کے توسط سے دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی پر ان کے تقرر کی مولانا نے کوشش کی بلکہ فیصلہ بھی مولانا ہی پر چھوڑ دیا تھا۔جب دارالمصنّفین کے قائم کرنے کا ارادہ ہوا تو ان کی نظر انتخاب مولوی حمید الدین پر پڑی چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

> "اگر دارالمصنّفین قائم ہوا تو تمہارے سوا کون چلائے گا۔" (۲)

آخر زمانے میں مولانا شبلی کی یہ تمنا تھی کہ ان کے رفقائے کار سب یکجا ہوں اور کچھ کام کریں لیکن مولانا شبلی کی موت نے ان کی بہت سی اسکیموں پر پانی پھیر دیا۔

"محمد امین زبیری"

ان سے مولانا شبلی اس وقت متعارف ہوئے جبکہ وہ والیہ بھوپال کے ایک عہدیدار

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۳۸۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۷۴۔

حضوری تھے، ان کا تعلق بھوپال کے قومی کاموں سے تھا، ندوہ اور سیرۃ النبی کی امداد کے سلسلے میں مولانا شبلی سے ان کے تعلقات ہوگئے۔زبیری صاحب کو جیسا کہ ذکر شبلی میں انھوں نے خود لکھا ہے، مولانا شبلی سے "بڑی عقیدت تھی۔"

خطوط میں کہیں وہ مولانا کو مولود کے بیان کے لیے بھوپال بلاتے اور کبھی والیہ بھوپال کے سفر نامے پر تقریظ لکھنے کی خواہش کرتے۔مکتوب ملاحظہ ہو:

> "ربیع الاول کی دعوت میں میں آسکتا ہوں، لیکن مولود کا بیان میں اچھا کیونکر کرسکوں گا، میری تقریر لکچر ہوتی ہے نہ وعظ، سفر نامہ سامنے ہو تو تقریظ لکھوں، غائبانہ شطرنج کھیلنا ہر شخص کا کام نہیں۔" (۱)

ایک مکتوب میں مولانا شبلی مولوی عزیز مرزا کی سفارش کرتے ہوئے (جبکہ وہ حیدرآباد سے جارہے تھے اور غالبا بھوپال جانے کا قصد تھا) زبیری صاحب کو مشورہ دیتے ہیں:

> "ان کی لیاقت سے کام لینا ریاست کے لیے قطعاً مفید ہوگا، نیز انشا پردازی اور تصنیف کے کاموں میں ان سے بہت مدد ملے گی، اس لیے ریاست کو ان کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔" (۲)

زبیری صاحب دراصل مولانا شبلی اور ہرہائینس کے درمیان ایک رابطہ تھا، جو کچھ بیگم صاحبہ کا ارشاد ہوتا وہ مولانا شبلی تک پہنچا دیتے اور ادھر کی درخواست ادھر پیش کر دیتے لیکن مولانا شبلی نے ان کی خدمات کو سراہا ہے۔چنانچہ لکھتے ہیں:

> "واقعہ یہ ہے کہ علی گڑھ اور ندوہ کو ریاست سے جو فوائد پہنچ رہے ہیں، اس کے سنگِ بنیاد آپ ہیں۔" (۳)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۲۴۔

(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۲۴۔

(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۲۶۔

علامہ شبلی ندوہ اور سیرۃ کے کاموں کے سلسلے میں محمد امین زبیری کو ہمیشہ باخبر رکھتے تھے، غرض یہ کہ مولانا کی زندگی تک زبیری صاحب کے ان سے تعلقات قائم رہے لیکن بعد میں زبیری صاحب نے ''ذکر شبلی'' کے نام سے حیات شبلی پر جس انداز میں تنقید کی ہے اس سے شبلی کے ساتھ ان کی عقیدت مندی کا کوئی خاص ثبوت نہیں ملتا۔ بیگمات فیضی کے نام شبلی کے خطوط منظر عام پر لاکر زبیری صاحب نے ادب میں ایک متنازعہ بحث کا آغاز کر دیا، اس میں شک نہیں کہ ان خطوط کی طباعت کے بعد شبلیات کا ایک اہم اور دلچسپ موضوع اور پہلو سامنے آیا،ورنہ شبلی کی زندگی کے اس اہم رخ سے ہم لاعلم ہی رہ جاتے۔

پروفیسر عبدالقادر

پروفیسر عبدالقادر سے مولانا شبلی کے تعلقات کیسے قائم ہوئے مکاتیب سے کوئی پتہ نہیں چلتا۔ پہلا مکتوب ۷ جنوری ۱۹۰۸ء کا ہے۔ عبدالقادر صاحب دکن کالج پونا میں پروفیسر تھے۔ خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں فارسی اور تاریخ ہر دو سے دلچسپی تھی اور مولانا شبلی سے تعلق پیدا ہونے کا سبب یہی ذوق تھا۔ ان کے نام خطوط میں مختلف تصانیف کا ذکر پایا جاتا ہے۔ علمی گفتگو سے پروفیسر صاحب کے نام کے خطوط بھرے پڑے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر کے مولانا معترف تھے۔ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں، بیشک ترجمہ (۲) میں اردو کی غلطیاں بہت ہیں ان کو صحیح کرکے ایک مختصر تمہید کے ساتھ جس میں آپ کو ملک سے روشناس کرائوں گا، الندوہ میں شائع ہونے کو بھیج دوں گا، آپ کے علمی مذاق کا نہایت معترف ہوں۔'' (۱)

پروفیسر قادر نے بعض خطوط میں بیگمات فیضی کی اردو دانی اور اردو نویسی کی بھی تعریف کی ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ پروفیسر صاحب کی غلطیاں بھی درست کردیا کریں، پروفیسر صاحب کے خطوط میں بھی بمبئی کی اردو کا رنگ جھلکتا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۰۶۔

کو ترجمہ سے زیادہ دلچسپی تھی وہ اکثر انگریزی سے ترجمہ کیا کرتے تھے۔ خطوط میں مولانا کبھی ان سے مضامین عالمگیری کے ترجمہ کے متعلق معلوم کرتے ہیں، کبھی اپنی شعرالعجم کا ذکر کرتے ہیں، کبھی ان سے کسی کتاب کا حوالہ پوچھتے ہیں اور کبھی خود انھیں مشورہ دیتے ہیں۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اے وقت تو خوش کہ وقت خاموش کردی، کتابیں یا انتخابات تو جب آئیں گے آئیں گے لیکن خوش تو میں ابھی ہولیا اور کئی دن تک کے لیے یہ سامان کافی ہوگا، واقعی مجھ کو ان علمی ذخیروں کے پتہ سے بھی خوشی ہوتی ہے۔"(۱)

اس کے بعد ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"آپ کی عنایتوں کی بارش برابر جاری ہے۔" (۲)

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں کے تعلقات کی بڑی وجہ کتابیں تھیں، پروفیسر صاحب کا مطالعہ گہرا تھا اور ان میں تحقیق اور تفتیش کا مادہ بھی تھا، پھر مولانا شبلی سے کیوں نہ بنتی۔ سیرت صلعم کی ترتیب میں بھی پروفیسر صاحب نے ضرور مدد دی ہوگی اسی لیے مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"سیرۃ نبویؐ کے متعلق آپ کی قلمی امداد کا امید وار ہوں۔" (۳)

دکن کالج پونا میں اسسٹنٹ پروفیسری کی خدمت پر مولانا سید سلیمان کے تقرر میں پروفیسر عبدالقادر ہی نے کوشش کی جس کا شکریہ مولانا شبلی اس طرح ادا کرتے ہیں:

"بے شبہ سید سلیمان کی کامیابی حیرت انگیز ہے (۲) لیکن اصل حیرت انگیز آپ کا زورو اثر ہے۔" (۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۱۶۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۱۶۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۱۸۔
(۴)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۲۲۰

بہرحال پروفیسر عبدالقادر اور مولانا شبلی کے تعلقات بھی بڑی خاص نوعیت کے تھے، ان کے خطوط میں اکثر خانگی باتوں کے بجائے صرف کتابوں اور تحقیقی کاموں کا ذکر ہوتا تھا۔

مولوی مسعود علی ندوی، مولوی ضیاء الحسن ندوی
مولوی عبدالسلام ندوی اور مولوی عبدالباری ندوی

مندرجہ بالا حضرات مولانا شبلی کے عزیز شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں، ان حضرات کے نام مولانا شبلی نے جو خطوط لکھے ان میں ایک بات مشترک ہے اور وہ ہے ان کا مشفقانہ طرز عمل۔ان کے پیش نظر قوم میں قابل افراد پیدا کرنا اور ان کو تربیت دینا تھا، وہ خطوط میں بھی کچھ ایسی ہی کوشش کرتے ہیں، وہ اکثر اوقات اپنے شاگردوں کی ہمت افزائی بھی کرتے نظر آتے ہیں لیکن اگر سختی کی ضرورت ہو تو بعض وقت سخت رویہ بھی اختیار کرلیتے ہیں:

ایک مکتوب میں مولوی مسعود علی ندوی کی اس طرح ہمت افزائی کرتے ہیں:

> "تم عملی آدمی ہو، اس لیے قومی اشغال میں اہل قلم سے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔" (۱)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "بھائی جو اسکیم پیش نظر ہے اس میں تمہاری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔" (۲)

مولانا شبلی چاہتے تھے کہ اپنے قابل شاگردوں کو ایک مرکز پر جمع کریں، ان کی یہی تجویز دارالمصنّفین کی شکل میں ظاہر ہوئی، انھوں نے اپنے ان شاگردوں کو خطوط لکھے کہ جو

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۰۳۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۱۸۔

آنے والے ہوں وہ جلد آجائیں تاکہ ان کی اسکیم پر عمل ہوسکے، بعض شاگردوں کو وہ اپنے ساتھ رکھ کر تربیت دینا چاہتے تھے اس لیے مولوی ضیاء الحسن کو لکھتے ہیں:

"میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا میرا ساتھ رہتا تاکہ میں ادب و فلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا اور مضمون نگاری کی تعلیم بھی دیتا۔" (۱)

سیرۃ کے کام میں مولوی عبدالسلام ان کے مددگار تھے ایک موقع پر جبکہ انھوں نے حسب خواہ کام نہیں کیا تو اس طرح لکھتے ہیں:

"تم اس قدر بھولے کیوں بن جاتے ہو، تم خود اگر قرآن مجید پر کوئی کتاب لکھتے تو کن عنوانوں کو لیتے۔" (۲)

ان ہی عبدالسلام سے متعلق مہدی حسن کے خط میں لکھتے ہیں:

"عبدالسلام نہایت قابل لڑکا ہے جو غالباً خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔" (۳)

مولانا شبلی اپنے خطوط میں اپنے شاگردوں کو اکثر مفید مشورہ بھی دیتے تھے، جب مولوی عبدالسلام الہلال اخبار میں جانے لگے تو انھیں اس طرح نصیحت کرتے ہیں:

"تم الہلال میں جائو، مضائقہ نہیں، لیکن یہ شرط کرلو کہ تم الہلال میں جذب نہ ہوجائو، یعنی جو لکھو اپنے نام سے لکھوں، ورنہ تمہاری زندگی پر بالکل پردہ پڑ جائے گا اور آئندہ ترقیوں کے لیے مضر ہوگا۔" (۴)

ایک اور مکتوب میں گمنام مضامین لکھنے سے منع کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہوجائے تمہاری

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۲۲۔

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۲۸۔

(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۷۹۔

(۴)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۲۹

قوت اور نمود سے بہرحال ہماری سوسائٹی کو فائدہ ہی ہو گا۔" (۱)

علامہ شبلی اپنے ان شاگردوں کو اپنے کاموں سے متعلق مطلع کرتے رہتے تھے اور انھیں اس بات کی ترغیب دیتے کہ وہ بھی ان کی طرح کام کریں۔ مولوی عبدالباری کے نام خطوط میں مولانا شبلی نے اکثر سیرۃ ہی کا ذکر کیا ہے، یا پھر ندوہ کی باتیں ہیں اور کہیں مسلم لیگ کا تذکرہ ہے، یہ اپنے شاگردوں کی مدد کرنے کو ہمیشہ اور ہر طرح تیار رہتے تھے، مولوی عبدالباری کو لکھتے ہیں:

"آئندہ مراحل کے لیے بھی مجھ سے جو کچھ ہوسکتا ہے میں ہمیشہ موجود ہوں۔" (۲)

مولانا سید سلیمان ندوی

سید سلیمان ندوی کو مولانا شبلی کا صحیح اور سچا جانشین کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ مولانا شبلی کے نامکمل کاموں کو ان کے بعد جنھوں نے جاری رکھا اور تکمیل کو پہنچایا وہ سید سلیمان تھے۔ شبلی کی سب سے بڑی آرزو اور وصیت یعنی "سیرۃ النبی" کی تکمیل سید سلیمان ہی نے کی، حیات شبلی لکھ کر نہ صرف اپنے محسن اور استاد کو خراج عقیدت پیش کیا، بلکہ اردو کے سوانحی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا۔ انھوں نے مکاتیب شبلی کو ترتیب دے کر حقیقی شبلی کو پیش کیا، اگر آج یہ مکاتیب ایک مجموعے کی شکل میں نہ ہوتے تو شاید اس مقالہ کی تحریر میں بھی بڑی دشوار ہوتی۔

مولانا سید سلیمان کے نام مولانا شبلی کا سب سے پہلا خط ۵، جنوری ۱۹۰۶ء کا ہے جبکہ سید سلیمان ندوہ میں طالب علم تھے اور مولانا وہاں کے معتمد۔ ان کے نام کے خطوط میں نصیحتیں ہیں، کام کرنے کے طریقے ہیں، شفقت کا اظہار ہے، تصانیف کے سلسلے میں مشورے ہیں اور حضرت عائشہ اور دیگر ازواج مطہرات کی سوانح لکھنے کی ترغیب۔ سید سلیمان کا تقرر

---

(۱) مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۳۲

(۲) مکاتیب شبلی جلد دوم ص ۱۳۴۔

دکن کالج پونا میں مولانا کی کوششوں سے ہوا، مولانا شبلی چاہتے بھی یہی تھے کہ سید سلیمان کا تقرر کسی موزوں خدمت پر ہو۔سید سلیمان نے اپنی ملازمت کے سلسلے میں مولانا کو ایک مرتبہ لکھا تھا کہ ان کا خیال رکھیں، اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

> "عزیزی کیا اس کے کہنے کی حاجت ہے، تم ہر وقت میری آنکھوں میں ہو۔" (۱)

آگے لکھتے ہیں:

> "سب سے پہلے جو موقع ملے گا میں تم کو پیش کروں گا۔"

یوں تو مولانا شبلی کا طرز عمل اپنے تمام شاگردوں کے ساتھ نہایت ہمدردانہ تھا لیکن جن کے ساتھ خصوصی نسبت و مناسبت تھی ان میں سید سلیمان بھی تھے، حقیقت یہ ہے کہ سید سلیمان مولانا سے بہت قریب رہے خصوصاً سیرۃ کے کام کے سلسلے میں جب بھی مولانا حیدرآباد بمبئ جاتے تو کتابیں اکثر ساتھ ہوتیں اور سید سلیمان بھی ساتھ جاتے۔دیکھا جائے تو سفر میں کتابوں کی طرح ان کو سید سلیمان کی موجودگی سے بھی بڑی مدد ملتی چنانچہ لکھتے ہیں:

> "یہ عزم کرلیا ہے کہ جہاں رہوں ندوہ اپنے ساتھ رکھوں، ندوہ درودیوار کا نام نہیں، سید سلیمان وغیرہ کا نام ہے۔" (۲)

اپنے احباب کے خطوط میں وہ سید سلیمان کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے، وفات سے قبل بھی سید سلیمان کو طلب کیا تاکہ اپنی ساری اسکیمیں ان کو سمجھا دیں، مختصر یہ کہ مولانا شبلی کو سید سلیمان ندوی سے بڑا اُنس تھا اور سید سلیمان کو مولانا سے غیر معمولی عقیدت تھی۔

نواب سید علی حسن خاں

سید علی حسن خاں صفی الدولہ حسام الملک مولانا شبلی کے بڑے معتقد تھے۔مولانا سید سلیمان کے بیان کے مطابق نواب علی حسن سے شبلی کی ملاقات بھوپال میں ۱۸۹۱ء میں ہوئی

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۵۹

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۱۱۔

لیکن پہلا مکتوب ۱۳؍ جولائی ۱۸۹۹ء کا ہے۔ مولانا نواب صاحب کی علم دوستی کے معترف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ نواب علی حسن بھی اورینٹل کانفرنس میں شرکت کریں جو اٹلی میں منعقد ہو رہی تھی اور جس میں یورپ، مصر اور شام کے علماء شریک ہونے والے تھے، لکھتے ہیں:

”ریاست حیدرآباد نے سید علی بلگرامی کو اس کی شرکت کے لیے بھیجا ہے اور پنجاب گورنمنٹ نے ہمارے مسٹر آرنلڈ کو، میں بھی انشاء اللہ جاؤں گا۔“(۱)

نواب علی حسن خاں کی نظامت تعلیمات کے زمانے میں بھوپال میں کافی ترقی ہوئی تھی، شبلی علمی ترقی کے آثار کو دیکھتے ہوئے ایک مکتوب میں اس طرح مخاطب ہیں:

”آپ یقین فرمایئے کہ میں آپ کے حق میں دعائے خیر کیا کرتا ہوں اس لیے نہیں کہ آپ دولت مند ہیں، اس کو تو میں کمینہ پن سمجھتا ہوں بلکہ اس لیے کہ آپ کی ذات سے ایک ایسی زمین کی تربیت کی امید ہے جہاں کبھی علم کی ہوا بھی نہیں چلی تھی۔“ (۲)

مولانا شبلی جب بھی بھوپال جاتے نواب علی حسن خاں کے یہاں مہمان رہتے، ہم کلامی کا لطف اٹھاتے اور جب وہاں سے واپس آتے تو خط و کتابت کے ذریعہ تعلقات قائم رکھتے۔ ندوہ کے معاملات میں بھی نواب علی حسن نے ہمیشہ دلچسپی لی، ان دونوں کے خطوط میں اکثر باتیں ندوہ ہی سے متعلق ہیں۔ جب مولانا شبلی نے دارالمصنّفین کے قیام کی تجویز پیش کی اور وہاں ایک کتب خانے کی ضرورت بتائی تو نواب صاحب موصوف نے اپنے قیمتی کتب خانے سے بیشتر کتابیں دارالمصنّفین کو دے دیں۔ اس گراں قدر عطیہ کے دینے میں نواب صاحب کی علم دوستی کے علاوہ مولانا شبلی کے تعلق کو بھی بڑا دخل ہے، اسی تعلق اور محبت کی وجہ سے نواب صاحب نے مولانا کے انتقال کے بعد بھی ندوہ سے تعلق قائم رکھا۔

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۴۴

(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۴۵

مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس رسولپوری ضلع مظفر پور

وہ رئیس بھی تھے، شاعر بھی اور مولانا شبلی کے عقیدت مند بھی۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں علم و ادب سے بڑی دلچسپی تھی اس لیے ان کے نام مولانا شبلی نے جو خط لکھے ان میں مختلف تصانیف کا ذکر ہے اوربسااوقات شاعری کے موضوعات بھی زیر بحث آئے ہیں:

"آپ کا خط جب آتا ہے تو بخدا تھوڑی دیر رشک میں مبتلا رہتا ہوں کہ کاش یہ خط مجھ کو نصیب ہوتا۔" (۱)

ریاض حسن خاں کے اشعار کی بھی مولانا شبلی اپنے خطوں میں تعریف کرتے تھے۔ ایک خط ملاحظہ ہو:

"واقعی آپ کا کلام بہت شستہ اور صاف ہوتا ہے، مجھ کو اس قدر گمان نہ تھا، کل ہی آپ کی نظم اردو بھی ایک پرچہ میں دیکھی، کیا کہنا۔" (۲)

ریاض حسن خاں کے علاوہ شبلی نے جن حضرات کے نام خطوط لکھے ان میں محمد عمر اور محمد سمیع صاحبان قابل ذکر ہیں۔

محمد سمیع اور مولوی محمد عمر

مولوی محمد عمر مولانا شبلی کے دوست، ہم درس اور ہم صحبت تھے اور مولوی محمد سمیع ابتدائی شاگردوں میں تھے لیکن مولانا شبلی کو بہت عزیز تھے، علی گڑھ سے پابندی کے ساتھ مولانا شبلی انھیں خطوط لکھا کرتے تھے اور ان سے خواہش کرتے تھے کہ:

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۶۱۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۵۹

"تمہارا خط ہفتہ میں ایک ضرور آنا چاہیے۔" (۱)

ان کے خطوط میں اپنا تازہ کلام بھی لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ محمد سمیع کا خط ملنے پر انھیں لکھتے ہیں:

"آج تمہارا خط پہنچا، یہ بھی چشم فلک کو برا نہ لگے کہ عزیزوں میں سے ایک شخص تو میرے حال سے محبت رکھتا ہے، زندہ باشی وجاوداں باشی"۔(۳)

جب محمد سمیع کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھیں تعزیت کا ایک خط لکھا جس میں ان کے خطوط کا پتہ چلتا ہے۔ محمد سمیع کے وہ بڑے معترف تھے۔ایک مکتوب میں ان کی اس طرح تعریف کرتے ہیں:

"تمہاری محنت اور تحقیق کا میں جلسہ میں خاص طرح پر اظہار کروں گا۔"(۳)

محمد سمیع کے نام مولانا شبلی نے ایک خط باہمی گفتگو کے انداز میں لکھا ہے اور وہی لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو غالب کے خطوں میں ہوتی تھی اپنے سارے عزیزوں میں مولانا شبلی کو محمد مہدی اور محمد اسحاق سے بڑی محبت تھی، اس بات کا علم ان کے متعدد خطوں سے ہوتا ہے۔

ایم مہدی حسن افادی صاحب

مہدی حسن افادی مولانا شبلی کے نہایت بے تکلف دوست تھے، ان پر اور ان کے طرز تحریر پر خود مولانا شبلی کو رشک تھا، وہ ان کے بڑے مداح تھے، ان دونوں کے خطوط ایک دوسرے کے نام بڑے دلچسپ اور پر لطف ہیں۔مولانا شبلی کے تمام خطوط کو مہدی نے بڑی حفاظت سے رکھا اور چاہتے تھے کہ ایک علیحدہ مجموعہ کی شکل میں اسے شائع کریں لیکن جب مولانا سلیمان ندوی نے مکاتیب شبلی کو شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو انھوں نے تمام خطوط ان کے پاس اس شرط سے بھجوا دئے کہ کوئی خط مجموعے میں چھپنے سے نہ رہ

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۶۴۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ص۶۹،۷۰
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول: ص۱۰۰۔

جائے افسوس کہ مہدی کے خطوط جو انھوں نے مولانا شبلی کو لکھے تھے محفوظ نہیں ہیں، مکاتیب مہدی میں صرف چند خطوط شامل ہیں جو ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ مکاتیب مہدی کے دیباچہ میں مہدی بیگم فرماتی ہیں:

"مولانا شبلی مرحوم کو انھوں نے کیسے کیسے بہترین خطوط لکھے لیکن مولانا مرحوم نے باوجود اتنے خلوص اور قدر دانی کے .... خطوں کو محفوظ نہیں رکھا۔" (۱)

مہدی نے مولانا شبلی کے مختصر سے مختصر خط کو محفوظ رکھا اور ان کی قدر کی۔ شبلی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"آپ کے لائق ادب کارڈ بھی اس قدر جامع و مانع ہوتے ہیں جیسے چنے کی دال پر قل ھو اللہ لکھی ہو۔" (۲)

مہدی چاہتے تھے کہ شبلی خط کے لیے اچھا کاغذ استعمال کریں، ان کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح شبلی کے خطوط حسن معنوی کے حامل ہوتے ہیں۔ حسن ظاہری میں بھی کم نہ ہوں اس لیے انھوں نے عمدہ کاغذہ اور لفافے مولانا کے پاس روانہ کیے جس کا علم ایک مکتوب مورخہ ۱۳/ دسمبر ۱۹۱۲ء سے ہوتا ہے لیکن شبلی کے لیے یہ پابندی مشکل تھی، چنانچہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"قدرت نے آپ کی نفاست پسندی پر یہ ظلم کیا کہ آپ کا عنایت کردہ کاغذ اور لفافہ دونوں گم ہوگئے، انا للہ۔" (۳)

مکاتیب شبلی میں مولانا شبلی کا پہلا خط جو انھوں نے مہدی کے نام لکھا مئی ۱۸۹۰ء کا ہے جس میں چند تصانیف کا ذکر ہے اور ساتھ ہی تبصرہ اور ریویو سے متعلق مولانا کے خیالات کا اظہار بھی ہے۔ پہلے خط کے بعد ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلقات بڑھنے لگے، مہدی

(۱) مکاتیب مہدی۔ مرتبہ: مہدی بیگم، آر سی پریس گورکھپور۔ ص۲۔
(۲) علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی: ص۱۲۴۔
(۳) مکاتیب شبلی جلد دوم ص۲۰۰

نے آم بھیجے ادھر سے "غریب نوازی" کا شکریہ ادا کیا گیا اور توقع ظاہر کی گئی کہ:

"خط و کتابت کے ذریعہ سے مخلصانہ تعلقات قائم رہیں گے۔" (۱)

جب دونوں میں ایک دوسرے کی عزت اور قدر کرنے کا جذبہ پیدا ہوا تو تعلقات بھی استوار ہونے لگے۔ایک مکتوب کے جواب میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"آپ کے عنایت آمیز، پُرلطف، نکتہ خیز والا نامہ کا جواب کیا لکھوں،عنایت نامہ کیا میری ہیچ دانی کا قابل قدر سرٹیفکٹ ہے، میں سچ کہتا ہوں کہ اس کو پڑھ کر پہلا خیال جو میرے دل آیا یہ تھا کہ یہ لٹریچر کسی تصنیف میں صرف ہوتا تو وہ نہایت عمدہ تصنیف خیال کی جاتی۔" (۲)

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں:

"آپ کا تو خط بھی ایک دلچسپ آرٹیکل ہوتا ہے لیکن اگر اس کی داد دوں تو ہم دونوں "حاجی" ہوئے جاتے ہیں۔" (۳)

مہدی نے قاموس الاسلام کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو البشیر میں شایع ہوا اور مولانا شبلی کی نظر سے گذرا لکھتے ہیں:

"نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے، حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے، کئی دن تک دیکھتا اور احباب کو دکھلاتا رہا۔" (۴)

اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۶۸۔
(۲)مکاتیب شبلی جلددوم ص۱۷۰۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۷۳
(۴)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۷۱

"خدا آپ کو، آپ کے دست قلم کو، آپ کی صنعت گری طبع کو قائم رکھے، بخدا مجھ کو خوشی سے زیادہ آپ پر رشک آتا ہے۔" (۱)

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

"کاش شعرالعجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے۔" (۲)

مولانا شبلی جس طرح بمبئی کی دلچسپیوں سے مولانا شروانی اور مولانا آزاد کو مطلع کرتے رہتے تھے مہدی کے خطوط میں بھی ان باتوں کا ذکر پایا جاتا ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہدی خود چھیڑ چھیڑ کر ان باتوں کو پوچھتے تھے اور شبلی بے تکلف ہوکر لکھتے تھے، بعض مرتبہ خود شبلی ہی نے مہدی کو کچھ اس انداز میں لکھا:

"الہ آباد بلایئے تو آجائوں لیکن شرط یہ ہے کہ بمبئی کا نعم البدل نہ سہی، برابر سرابر تو ہو۔" (۳)

بہرحال دونوں کی دلچسپ نوک جھونک اور راز و نیاز کی باتیں چلتی رہتی تھیں۔ایک خط میں اس طرح رقم طراز ہیں:

"میری نسبت آپ کا دعویٰ عموم خود مجھ کو بھی تسلیم ہے، لیکن بمبئی کی سی فیاضی کہاں، تحریر کی بے پردگی سے مجھ کو حسن ظن نہیں پیدا ہوسکتا ہے، امتحان کے لیے میں خود اکبرپور آنے کے لیے طیار ہوں۔" (۴)

ایک اور مکتوب میں مہدی اپنے تعلق خاطر کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"مجھ کو رنج تھا کہ آپ اب قابل خطاب بھی نہیں سمجھتے، بمبئی اور الہ آباد دونوں صدائیں بیکار گئیں۔"

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۷۱۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۹۵۔
(۳)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۹۲۔
(۴) مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۹۴۔

مولانا شبلی نے ایک مکتوب کے ذریعے مہدی افادی کو اپنے پاس بلایا ساتھ ہی ابوالکلام کو بھی مدعو کیا تھا، لکھتے ہیں:

> ”بڑے دن میں ضرور آیئے، کمرہ کے برابر کمرہ لیا ہے، اس قدر خوش فضا کہ بمبئ میں بھی جواب نہیں، وہ بالکل خالی رہے گا، شاید آزاد آئیں تب بھی ہرج نہیں، دیوانے دو۔“ (۱)

مولانا شبلی کو آزاد اور مہدی دونوں سے انس تھا آزاد کے ذکر میں ہم ان کے نام کے خطوط کا اقتباس دے چکے ہیں، آزاد کے تعلق سے مہدی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں، جو مکاتیب مہدی میں شامل ہے:

> ”مجھ کو تمام عمر اگر کسی پر رشک آیا ہے توراچی والے پر، شبلی کے دل میں اس کی بھی جگہ تھی۔“ (۲)

علامہ شبلی بھی مہدی کو بمبئ چلنے کی دعوت دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ”اب تو خدا کے لیے بمبئ چلیے، تحصیلداری میں ایک مہینہ کی رخصت کچھ بڑی زیرباری نہیں ہے، وہاں کے سب مصارف میرے ذمہ، اس میں صرف ایک مستثنیٰ ہے۔“ (۳)

کبھی مہدی کے پاس خود مہمان ہونے کی خواہش کرتے اور لکھتے:

> ”واقعی سخت تعجب ہوا کہ آپ وعدہ کرکے میزبان سے کترا گئے، خیر کوئی مصلحت ہوگی۔“ (۴)

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۹۸۔

(۲)مکاتیب مہدی،مرتبہ: مہدی بیگم ، آسی پریس گورکھپور ص۳۵۔

(۳) مکاتیب شبلی جلد دوم ص۲۰۰۔

(۴)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۱۹۹۔

ایک اور رمکتوب سے دبے دبے الفاظ میں شکایت کا پہلو بھی نکل آتا ہے:

"لیکن آپ یا بھاوج صاحب ہر دفعہ دامن بچا جاتے ہیں۔" (۱)

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی کے دل میں مہدی کے لیے بڑا خلوص تھا وہ چاہتے تھے کہ مہدی ان سے قریب رہیں تاکہ دلچسپ بے تکلف اور پر لطف صحبتیں رہیں۔

مولوی شیر علی

مکاتیب شبلی میں مولوی شیر علی کے نام کا کوئی خط شریک نہیں لیکن بعض خطوط میں ان کا تذکرہ موجود ہے لیکن ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے اپنی کتاب "مکتوبات شبلی" میں ان کے نام کے خطوط کو جگہ دی ہے اس کے علاوہ شیر علی کے نام مولانا شبلی کے چند غیر مطبوعہ خطوط ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ان تمام خطوط کے مطالعہ سے ان دونوں کے تعلقات پر کچھ روشنی پڑسکتی ہے۔مولوی شیر علی کا شمار بھی مولانا شبلی کے احباب میں کیا جاسکتا ہے۔مولانا سلیمان ندوی کے بیان کے مطابق مولوی شیر علی "معقولات و ریاضیات میں اس عہد میں یگانہ ہیں۔مولانا شبلی ان کے علم و فضل کے بیحد مداح تھے۔" (۲)

اس کا اعتراف و اظہار خود مولانا شبلی کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے لکھتے ہیں:

"دارالعلوم اب جاکر رنگ پر آیا، بڑا رونا تعلیم کا تھا ... نہ فن کے ماہر تھے، نہ کبھی کتاب کا مطالعہ کرتے تھے اب ان کے جو قائم مقام ہیں اور جن کو میں نے زبردستی حیدرآباد (۱) سے بلایا ہے، ایسے شخص ہیں کہ دوہی چاردن میں طلبہ کی آنکھیں کھل گئیں اور سمجھے کہ تعلیم اور فن دانی اس کو کہتے ہیں"۔(۳)

مولانا شبلی ان سے اتنے متاثر تھے کہ شیر علی کو کچھ عرصے کے لیے ندوہ بلایا اور

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم ص۲۰۰۔
(۲)مکاتیب شبلی جلد دوم فٹ نوٹ:ص۹۹۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول:ص۱۶۸۔

وہاں کا پرنسپل مقرر کیا تھا۔

غالباً حیدرآباد کے دوران قیام میں مولانا شبلی، مولوی شیر علی سے متعارف ہوئے ہوں گے، لیکن پہلا خط جو نظر سے گذرا وہ جولائی ۱۹۰۹ء کا ہے جس میں انھوں نے مولوی شیر علی کا شکریہ ادا کیا ہے، مولوی صاحب موصوف نے اپنے مکتوب میں مولانا شبلی کو ندوہ سے متعلق چند تعلیمی امور کی طرف متوجہ کیا تھا جس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آپ نے جو شکایت کی ہے یہ تو میرے ہی دل کا زخم ہے
لیکن کیا کروں، سو سو طرح مدرسوں کو ابھارا، خود جاکر درس میں بیٹھا
پڑھا کر بتایا، اعتراضات کئے جواب مانگے، لیکن وہ جگہ سے نہیں ہلتے،
سخت کوفت ہوتی ہے، لیکن کیا کیا جائے۔ آشنائے فن تمام ملک میں ناپید
ہیں اور ذوق علمی کا پتا نہیں"۔(۱)

مولانا شبلی مولوی شیر علی کے خیالات اور ان کی علمیت سے اتنے متاثر ہوئے کہ مذکورہ بالا خط کے کچھ روز بعد ان کو ایک اور خط لکھا اور دارالعلوم ندوہ کی پرنسپلی کی پیش کش کی (مکتوب مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۰۹ئ) اس کے بعد کے ایک خط میں اصرار کیا اور لکھا۔

"آپ ہرگز پس و پیش نہ کیجئے گا، فوراً تشریف لایئے گا۔" (۲)

مولانا شبلی مولوی شیر علی کا بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگے اور انھیں ہر طرح کی سہولت پہنچانے کی کوشش کی، چنانچہ لکھتے ہیں:

"دفتر ندوہ میں تار دے دیجئے گا، اسٹیشن پر کوئی جاکر آپ کو
لائے گا۔ آپ کے قیام کے لیے مکان وغیرہ کا بند و بست کردیا جائے
گا۔"(۳)

---

(۱)مکتوبات شبلی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اصیلہ پریس، نئ دہلی۔ طبع اول دسمبر ۲۰۱۲۔ ص۵۱۔
(۲)مکتوبات شبلی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اصیلہ پریس، نئ دہلی۔ طبع اول دسمبر ۲۰۱۲۔ ص۵۳۔
(۳)مکتوبات شبلی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اصیلہ پریس، نئ دہلی۔ طبع اول دسمبر ۲۰۱۲۔ ص۵۳۔

۱۹۱۰ء میں مولوی شیر علی دارالعلوم ندوہ کے پرنسپل تھے۔اس زمانے کے خطوط میں انتظامی امور اور درس و تدریس سے متعلق مختلف ہدایات ہیں۔لیکن ۷ جنوری ۱۹۱۱ء کے مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ مولوی شیر علی نے ندوہ سے رخصت لے لی تھی، پھر ندوہ آنے کا ارادہ نہ تھا۔یکم مارچ ۱۹۱۱ء کو شبلی لکھتے ہیں:

"بذریعہ تار مطلع فرمایئے کہ آپ واپس آئیں گے یا نہیں۔"

اس کے جواب میں مولوی شیر علی نے دوبارہ نہ آنے کا خیال ظاہر کیا تھا اسی لیے لکھتے ہیں:

"آپ کے جانے کا سخت افسوس ہے۔کوئی بھی نعم البدل نہیں مل سکتا۔" (۱)

اسی مکتوب میں شبلی آگے لکھتے ہیں:

"آپ سر دست درخواست رخصت بیماری مع سرٹیفکیٹ طبی بھیج دیجیے"۔

مولانا شبلی چاہتے نہ تھے کہ مولوی شیر علی ان سے اور ندوہ سے اپنے تعلقات منقطع کریں اسی لیے انھیں مشورہ دیتے ہیں کہ وہ سردست بیماری کی رخصت لے لیں اور اس طرح ندوہ سے تعلق بالکل ہی منقطع نہ کرلیں۔اسی اثنا میں پرنسپلی کے لیے مولوی عبداللہ ٹونکی اور مختلف اصحاب کے لیے کوشش کی گئی لیکن کوئی آنے پر آمادہ نہ ہوا لکھتے ہیں:

"دارالعلوم کی حالت نہایت قابل رحم ہے، (مولوی عبداللہ) ٹونکی وغیرہ کوئی نہیں آتے۔آپ ہی رحم فرمایئے، مشاہرہ میں پچیس کا اس وقت اضافہ اور سبق آپ کی مرضی کے مطابق جس قدر آپ پڑھا سکیں۔بورڈنگ وغیرہ کے اہتمام سے سبکدوشی، عہدہ وہی پرنسپلی، اس صورت میں تو درخواست منظور فرمایئے جو رائے ہو فوراً بلکہ بذریعہ تار مطلع فرمایئے۔" (۲)

مولوی شیر علی باوجود اصرار کے اور ان تمام مراعات کے جس کا ذکر مولانا نے اپنے خط میں کیا ہے۔آنے پر آمادہ نہ ہوئے اس لیے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

(۱)مکتوبات شبلی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اصیلہ پریس، نئی دہلی۔طبع اول دسمبر ۲۰۱۲۔ص۵۴۔
(۲)مکتوبات شبلی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اصیلہ پریس، نئی دہلی۔طبع اول دسمبر ۲۰۱۲۔ص۵۵۔

"آپ کی یاد مدرسہ کے درودیوار تک کو نہیں بھولی:
"عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں"۔(۱)

مولوی شیر علی اور مولانا شبلی کے تعلقات دوستانہ تھے، مولانا ان کے علم و فضل کے معترف تھے اور ندوہ کی پرنسپلی کے لیے ان سے زیادہ موزوں کسی اور کو نہ سمجھتے تھے۔ مولوی شیر علی کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی "حیات شبلی" میں لکھتے ہیں:

"علماء میں ایسے فیاض، شریف اخلاق اور باوقار کم لوگ دیکھنے میں آئے۔"

مولوی شیر علی حیدرآباد میں کافی اثر و رسوخ رکھتے تھے،ان کے تعلقات مولانا انوار اللہ خاں فضیلت جنگ (استاد حضور نظام) سے بھی تھے اسی لیے مولانا شبلی نے ان کے پاس چند مظلومین کی ایک درخواست بھیجی اور تحریر فرمایا:

"آپ اگر جناب مولوی انوار اللہ خاں صاحب سے مل کر یا جس مناسب صورت سے ممکن ہو مولوی صاحب موصوف کو دیں کہ اعلیٰ حضرت تک پہنچا کر دادرسی کرادیں تو داخل حسنات اور سبب شکر گزاری ہوگا۔" (۲)

ممکن ہے مولوی شیر علی اور مولانا شبلی کے اور غیر مطبوعہ خطوط کہیں اور محفوظ ہوں تاہم مذکورہ بالا خطوط سے دونوں بزرگوں کے باہمی تعلقات کا بخوبی علم ہوسکتا ہے۔

مولانا شبلی کے احباب اور معاصرین کی فہرست کافی طویل ہے اور ان سب کا تذکرہ یہاں بہت مشکل ہے، صرف ایسے احباب اور مشہور شخصیتوں کو جو مولانا شبلی کے مکتوب الیہ تھے خطوط کی روشنی میں ان کا مختصر تعارف پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن سے نہ صرف مولانا شبلی کے تعلقات کا اظہار ہوتا ہے بلکہ ان خطوط کے اقتباسات سے خود مولانا شبلی کی شخصیت پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔مولانا کے بعض دوسرے احباب اور ان کے اپنے

---
(۱)مکتوبات شبلی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اصیلہ پریس،نئ دہلی۔طبع اول دسمبر ۲۰۱۲۔ص۵۶۔
(۲)مکتوبات شبلی،ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،اصیلہ پریس،نئ دہلی۔طبع اول دسمبر ۲۰۱۲۔ص۷۵۔

رشتے داروں کو اس مطالعہ میں شامل کرنا طولِ عمل تھا، اس لئے ان سے صرف نظر کیا گیا ہے، اس کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے۔اس مقالے کا چوتھا باب "مکتوبات شبلی کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے ہے، جس میں علامہ شبلی نعمانی کے تمام مجموعوں میں "مکاتیب شبلی" جلد اول و دوم، خطوط شبلی، مکتوبات شبلی، مراسلات شبلی وغیرہ پر سیر حاصل بحث ہوگی۔

***

4th Chapter

باب چہارم

مکتوبات شبلی کا تنقیدی جائزہ

اس باب میں علامہ شبلی نعمانی کے مکتوبات کی معنویت اور ادبی اہمیت متعین کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو مکاتیب پر مختصر تنقیدی تبصرہ کرلیا جائے۔

مکتوباتی ادب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اب تک خطوط کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں۔ مشہور مکتوب نگاروں میں غالب، سرسید، حالی، شبلی، مولانا آزاد، نذیر احمد، مہدی افادی، اقبال اور ابوالکلام آزاد کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ مرزا غالب نے اپنی مکتوب نگاری میں قدیم روش سے ہٹ کر جدت اختیار کی۔ ان کے خطوط میں مکالمہ کا رنگ اور بات چیت کا سا لطف ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب خط پڑھنے والے سے مخاطب ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ”مرزا صاحب میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو
> مکالمہ بنا دیا ہے، ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں
> وصال کے مزے لیا کرو۔“

غالب کے خطوط سے ان کی زندگی کی بہت ساری باتوں اور اس دور کے واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور گردو پیش کی عکاسی ہوتی ہے۔ ان کی تحریر میں شوخی بلاکی ہے۔ وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ مکتوب الیہ ان کے مکتوب کو پڑھ کر محظوظ ہو۔ مکتوب الیہ کی اپنی سمجھ اور مذاق کے مطابق خط میں شوخیاں ہوتی ہیں کہ اس پر بار نہیں گذرتیں۔ یہی شوخی اور شگفتگی مرزا کے خطوط کی جان ہے۔ ان کے خطوط کے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مرزا غالب کا اپنا رنگ تھا۔ جس کی تقلید شبلی کے علاوہ کوئی نہ کرسکا۔

اس کے بعد دوسرا نام سرسید کا لیا جاسکتا ہے، ان کے خطوط کی بڑی خصوصیت ان کی سادگی اور بے تکلفانہ انداز تحریر ہے جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے وہی نوک قلم پر بھی آجاتی ہے، ان کے خطوط سے جو اہم پہلو ابھر کر سامنے آتا ہے وہ قومی ہمدردی کا ہے۔ قوم کی بھلائی اور ترقی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ سرسید کے وہ خطوط جو انھوں نے سمندر پار سے لکھے تھے پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دیگر مفید باتوں کے علاوہ ان خطوط کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سرسید انگریزوں سے کس درجہ متاثر تھے۔

سرسید کی طرح حالی کے خطوط میں بھی سادگی اور بے تکلفی ہے اور ساتھ ہی بے پناہ خلوص اور ہمدردی۔ یہ بڑے منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، اس لیے ان کے خطوط میں بھی انکساری نمایاں ہے۔اس تعلق سے مولوی عبدالحق نے ''مکتوبات حالی'' پر اپنی رائے دیتے ہوئے اسی بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔

ان کے بعد محمد حسین آزاد کا مقام انشا پردازی میں بہت بلند ہے۔ فن کو سنوارنے اور اس میں رنگینی پیدا کرنے کی طرف انھوں نے زیادہ توجہ دی اس لیے ان کی نثر میں نظم کا سا لطف آتا ہے۔ان کے خطوط میں یہ کیفیت تو نہیں پائی جاتی۔ آزاد کے خطوط آزاد کی طبیعت اور فطرت کے مظہر ہیں۔ان کی قناعت پسندی، خودداری اور اصول پسند طبیعت کو ان کے خطوط کے آئینہ میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

نذیر احمد کے بیشتر خطوط اپنے لڑکے کے نام ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے اس کو تربیت دینے کی کوشش کی۔ خطوط میں بات چیت کا سا انداز ہے۔اپنے لڑکے سے ناراض بھی ہوجاتے ہیں اور محبت سے بھی پیش آتے ہیں غرض یہ کہ اردو مکتوب نگاری میں نذیر احمد کے خطوط ایک نئی صنف کا آغاز کرتے ہیں۔ جو غالباً بعض انگریزی مکتوب نگاروں کی تقلید ہے۔عبدالرحمن بجنوری نے بھی کچھ ایسے ہی تجربات کئے ہیں لیکن نذیر احمد کی طرح وعظ و نصیحت کا انداز بجنوری نے نہیں اختیار کیا۔ خطوط میں نذیر احمد نے زیادہ تر اپنے لڑکے کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم اور زندگی کا ایک مقصد مال اور دولت، نام و نمود اور عزت اور امتیاز کا حصول ہے۔ان کے خطوط کے مطالعے سے یہ تمام باتیں صاف طور سے

واضح ہوتی ہیں۔

اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز مہدی افادی بھی تھے۔افادات مہدی اور مکاتیب مہدی ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔مہدی کے خطوط میں لطافت ہے اور رنگینی، خوشبو ہے اور خوشنمائی، ان کے خطوط میں جدت بھی ہے اور شوخی اور شگفتگی بھی۔ مہدی کے خطوط درحقیقت زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔انھوں نے اپنے مکتوبات سے تنقید کا کام بھی لیا ہے۔اپنے ہم عصروں کی لغزش پر بلا جھجک ٹوک بھی دیتے تھے اور جو بات قابل داد ہوتی جی بھر کر اس کی تعریف بھی کرتے۔طبیعت میں شوخی، بانکپن اور رنگینی تھی وہی شوخی، رنگینی اور بانکپن ان کے خطوط میں بھی ہے اور بانکپن بھی بقول آل احمد سرور "وہ بانکپن ہے جس پر سادگی قربان اور وہ سادگی جس پر بانکپن نثار ہے۔" زندہ دلی ان کے خطوط کی جان ہے۔ بعض وقت ان کی زندہ دلی اور شوخی عریانی کی حد تک پہنچ جاتی ہے لیکن پھر بھی متانت اور سنجیدگی کے کے پردے میں رہتی ہے۔مختصر یہ کہ مہدی کے خطوط رنگینی اور دلچسپی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

علامہ اقبال کے خطوط ان کے خیالات اور نظریات کے آئینہ ہیں۔ان میں اقبال کے مشاغل اور مصروفیات کا حال ہے اس کے علاوہ علمی اور ادبی بحثیں ہیں، خود تنقید کرتے ہیں اور دوسروں کو دعوت تنقید دیتے ہیں۔اقبال کی وضع داری اور اہل اللہ سے ان کی عقیدت کا پتہ ان خطوط سے چلتا ہے جو انھوں نے مہاراجہ کشن پرشاد کے نام لکھے ہیں۔اپنے ہم عصر علماء کی بھی اقبال کے پاس بڑی قدر و منزلت تھی۔اس سے خود ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔اقبال کے خطوط میں سادگی ہے جو خود ان کی فطرت کی غماز ہے۔

متذکرہ بالا مشہور ادیبوں کے مکاتیب سے اردو کا مکاتیبی ادب ترتیب پاتا ہے لیکن ان سب میں مولانا شبلی کے مکاتیب اور خطوط کو ایک نمایاں حیثیت اور اہمیت حاصل ہے۔ ساری خوبیوں کا تو کسی ادیب میں جمع ہونا ناممکن ہے لیکن مولانا شبلی کے مکتوبات کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے خطوط میں غالب کے خطوط کی سی شگفتگی ہے بعض خطوط میں مکالموں کا بھی وہی انداز ہے جو غالب کے خطوط میں پایا جاتا ہے۔بقول مولانا شاہ معین

الدین احمد ندوی:

”مولانا کے خطوط میں غالب کے طرز تحریر کی اتنی جھلک ہے کہ ان کے بعض خطوط پر غالب کا دھوکا ہوتا ہے وہ بھی غالب کی طرح آداب و القاب بہت مختصر لکھتے تھے اور اس کے بعد ہی اصل مدعا شروع کر دیتے تھے۔بعض خطوط میں تو مختصر القاب بھی ہونے، ہونا تھا۔بعض خطوط کا طرز خطاب بھی غالب ہی کے جیسا ہے مثلاً ایک عزیز کو لکھتے ہیں:

”لیجئے آپ کو بھی چپ لگ گئی، بھائی کوئی قصور تو نہیں ہوا، ناراض کیوں بیٹھے ہو وہ قصیدہ یہاں نہیں ملتا دین لکھوالو، میں جب آئوں گا تو لکھوا دوں گا۔“(۱)

علامہ شبلی نعمانی کی خطوط نگاری کے متعلق ڈاکٹر شباب الدین تحریر کرتے ہیں:

”خطوط شبلی کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ شبلی، غالب کی طرح القاب و آداب کی پرواہ نہیں کرتے، سلام و دعا کے فوراً بعد مطلب کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں، خط مختصر لکھتے ہیں مگر اس ایجاز و اختصار میں مقصد کی وضاحت اور معنی کی وسعت موجود ہوتی ہے، یہی چیز ان کی مکتوب نگاری کی جان ہے، ان کا ہر لفظ سانچے میں ڈھلا ہوا اور عجب طرح کی تاثیر سے معمور ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس کی لذتوں میں کھو جاتا ہے، ان کے خطوط کی نمایاں خصوصیت مخاطبوں کے رتبہ و مقام کا لحاظ ہے، وہ ان کے جذبات و نفسیات کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ہر ایک کو اس کے ذوق و شوق کے مطابق خط لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے خطوط مستقل قدر و قیمت کے مالک تصور کئے جاتے ہیں“۔(۲)

علامہ شبلی نعمانی کے خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ طویل نہیں ہوتے تھے، مہدی کی بیوی شبلی کے خط کو تار کہا کرتی تھی، لیکن اس اختصار میں بھی وہ سب کچھ کہہ جاتے تھے، جو وہ کہنا چاہتے تھے، ان کے جملوں میں بڑی جامعیت ہوتی ہے، ان کے خطوط میں سادہ اور موزوں عبارتیں ہیں، پر تکلف مسجع اور مقفیٰ فقرے نہیں ملتے، غالب کی طرح

---

(۱)ماہنامہ ادیب، شبلی نمبر۔مدیر ابن فرید، سرسید بک ڈپو علی گڑھ، ستمبر ۱۹۴۰۔ص ۲۵۰ ، ۲۵۱

(۲)دارالمصنّفین کی ادبی خدمات کا تعارف (۱۹۸۰ء تک) مصنف ڈاکٹر شباب الدین، مطبع، اصیلہ آفسیٹ پرنٹرز، نئ دہلی، سن اشاعت بار اول ۲۰۰۵ئ، ص ۴۲

یہ بھی القاب کی پرواہ نہ کرتے تھے، جو کچھ لکھنا چاہتے بلا کسی تمہید کے نوک قلم پر آجاتا، مکاتیب شبلی کے مقدمہ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے شبلی کی خطوط نویسی کی جو خصوصیات بتائی ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) نہایت مختصر لکھتے تھے، کبھی کبھی صرف "ہاں" "نا" پر اکتفا کرتے تھے، مفصل اور طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دو فقروں میں دیتے تھے۔

(۲) لیکن درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں ہے، اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے ساتھ معنی میں پوری وسعت موجود ہو، یہی خصوصیت مولانا کی انشاپردازی اور بلاغت کی جان ہے، وہ ان ہی ایک دو فقروں میں جو کچھ کہہ جاتے ہیں، ہم صفحوں میں ان کو نہیں کھپا سکتے، وہ چند لفظوں میں جو جادو پھونک دیتے ہیں، اس زمانہ کے سامری سینکڑوں منتروں میں وہ روح نہیں پیدا کرسکتے، ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کو مثالوں سے واضح کرتے، لیکن اس خوف سے کہ یہ مختصر دیباچہ مطول نہ بن جائے، اس کو ارباب ذوق سلیم پر چھوڑ دیتے ہیں۔

(۳) آداب و القاب کی پروا نہیں کرتے تھے، اکثر بلا تمہید مطلب شروع کردیتے تھے (قدما کا یہی طرز تھا) جس کا بڑا خیال کیا، اس کو صرف ایک دو لفظ القاب کے لکھ دیے۔

(۴) خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن لکھتے تھے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ خط لکھا اور آنے جانے کا حساب لگا کر جو دن مقرر کیا اسی دن جو اب آگیا، بیماری تک میں بھی وہ اس وضع داری کو نباہتے تھے، بہت مجبور ہوتے تو دوسروں سے لکھا دیتے، چنانچہ مکاتیب کی دونوں جلدوں میں اس قسم کے خطوط ملیں گے۔

(۵) ابتداء مولانا کا خط شکستہ تھا، پھر خوشخط نستعلیق لکھنے لگے تھے، آخر میں شکستہ اور نستعلیق مل کر ایک عجیب خوش سواد خط پیدا ہوگیا تھا، یہ خط اس قدر خوبصورت اور حسین تھا کہ بیسیوں سلیقہ شعار اشخاص نے اس کی نقلیں کیں اور بہت سے اس میں کامیاب ہوئے، چنانچہ ندوہ کے طلبہ، مولانا کے شاگردوں اور بعض دوستوں نے مشق بہم پہنچائی ہے کہ بہت مشکل سے ان میں تمیز ہوسکتی ہے۔

(۶) تمام مکاتیب کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوگا کہ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے، شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آئیں گے، مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی کے خطوط میں زیادہ تر فارسی شاعری، نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں، پروفیسر عبدالقادر سے "ادب و تاریخ فارسی" کے مباحث پر گفتگو ہے، مولانا حمید الدین صاحب سے تغیر اور سیرت پر مکالمات ہیں، مسٹر عبدالماجد سے "مغربیات" کی باتیں ہیں، مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف "دائرۂ ادبیہ" کے نام کے خطوط میں "محاسن ادبی" اور "لطافت شعری" پر گلفشانیاں ہیں۔"(۱)

ان خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علامہ شبلی صاحبِ طرز تھے، ان کا اپنا اسلوب تھا، ان کے اسلوب سے نہ جانے کتنے اسلوب اور بنے آج بھی شبلی کا پرتو مولانا آزاد، نیاز فتحپوری اور آل احمد سرور کے یہاں ملتا ہے۔علامہ شبلی کے انداز کی سب سے بڑی خصوصیت Directness مدعا نگاری، مقصدیت اور اختصار ہے۔مولانا شبلی الفاظ کے بہت بڑے کفایت شعار ہیں۔وہ اپنے مافی الضمیر کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرتے ہیں، ان کے یہاں ہر لفظ کی بڑی اہمیت ہے، خط میں ان کا یہ رنگ تو بھرپور، نظر آتا ہے مگر (خط کے) فن کے توازن کا احترام نہیں ہے، ان کے بعض خط تو دہن یار کی طرح مختصر، حد یہ ہے کہ بعض محض ایک فقرے، ایک شعر بلکہ کبھی محض ایک مصرع کا ہوتا ہے، آزاد

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، سن اشاعت ۲۰۱۰ئ، ص ۱۱، ۱۲۔

کے نام اس طرح کے ایک خط کی نقل ملاحظہ فرمایئے:

"اسی قدر ناسی ارباب وفا ہو جانا" (۱)

مولانا شبلی کی نثر میں تشبیہ اور تمثیل بہت کم ہیں، وہ کلام کو مختصر کرنے کے لیے استعارے کے بڑے فنکار بن گئے، یہ استعارے شبلی کے ادبی اور تخلیقی ہوا کرتے تھے، بعض ان کے استعارے خطاب کا قائم مقام معلوم ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر ان میں سے کچھ پر نظر ڈالیں، جیسے:

(۱)	عطیہ فیضی کو	قرۃ العینی
(۲)	دوسری شادی کو	احرامِ جدید
(۳)	مہدی کی بیوی کو	ایمان بالغیب
(۴)	اپنے آپ کو	نفوسِ قدسیہ
(۵)	حیات جاوید کو	کتاب المناقب
(۶)	// //	(مدلل مداحی)
(۷)	منتظمین ندوہ	سگانِ بازاری
(۸)	اپنے تخلص کشاف کو	کشافیات

مولانا شبلی فطری ادیب تھے اس لیے ان کی تحریر حتی کہ مذہبی تحریر میں بھی ادب و انشاء کی چاشنی سے خالی نہ ہوتی تھیں، ان کے مکاتیب میں تو بکثرت ایسے ادبی فقرے ملتے ہیں جن سے پورا خط چمک جاتا تھا۔ خصوصاً شاعروں اور ادیبوں کو جو خط لکھتے تھے وہ ادب و انشاء کا مرقع ہوتے تھے، مولانا شبلی کے مکاتیب میں خطوط غالب کے وہی اوصاف عموماً پائے جاتے ہیں جو شبلی نے غالب کے بتائے ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ شبلی اسی اسلوب کو نہ صرف پسند کیا بلکہ دانستہ طور پر وہی خصوصیات اپنے مکاتیب میں شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ رفیق دارالمصنّفین کلیم صفات اصلاحی نے مکاتیب شبلی کی اس خصوصیت کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، سن اشاعت ۲۰۱۰ئ، ص ۲۶۵

"ان خطوط کے بغور مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے غالب کی مکتوب نگاری کے جو اوصاف و خصائص بیان کیے ہیں وہ خود ان کے مکتوبات میں بھی جلوگر ہیں۔ مکتوب الیہ کو مخاطب کرنے کا وہی اسلوب جو غالب نے اپنایا تھا۔ شبلی کے مکاتیب کا حصہ ہے، وہی سادگی، وہی سلاست، وہی روانی، وہی برجستگی، وہی ادبی لطافت، وہی علمی ثقاہت، وہی دلکشی، وہی رعنائی، وہی سادگی، وہی مصوری، وہی ایجاز، وہی بانکپن جو نوک خامۂ غالب نے مکاتیب میں "در منثور" کے مثل بکھیرے ہیں اس کا پورا عکس مکاتیب شبلی میں موجود ہے۔" (۱)

ایک دوسری جگہ مولانا شبلی کی خطوط نگاری کے متعلق ڈاکٹر شمس بدایونی تحریر کرتے ہیں:

"مولانا شبلی اپنے انداز نگارش میں زبان کی تازگی اور شگفتگی برقرار رکھنے کے لیے کبھی "حکیمانہ شوخی اور لطیف طنز" سے کام لیتے ہیں، کبھی عبارت میں زور پیدا کرنے کے لیے برمحل شعر، مصرعہ، آیت یا کہاوت کا نگینہ جڑ دیتے ہیں اور کبھی ایک لفظی ترکیب یا فقرے سے خط کے مضمون کو معانی کی وسعت اور ادبی لذت و حلاوت سے بھر دیتے ہیں۔ ایجاز و اختصار شبلی کی تحریر کا نمایاں وصف ہے۔ ان خطوط میں بھی وہ ایجاز، رمزیت، استعارتی انداز سے کام لیتے ہیں، گرد و پیش کی عکاسی کرکے ذوق نظر کا سامان بھی فراہم کرتے چلتے ہیں، غرض کہ وہ بڑی سے بڑی بات، ادق سے ادق علمی مسئلہ پیچیدہ سے پیچیدہ گتھی کو اتنے سلیقے، اعتماد، فطری اور بے ساختہ انداز میں رقم کرتے ہیں کہ اس کا ہر لفظ تاثر اور لذت سے معمور ہوجاتا ہے، ان کے طاقتور اور ولولہ انگیز اسلوب بیان نے ان خطوط میں جوش، توانائی اور ایک خاص قسم کا جمالیاتی عنصر پیدا کردیا ہے۔"

---

(۱) حروف بازگشت، کلیم صفات اصلاحی، رفیق دارالمصنّفین، مطبع، اصلاحی، ہیلتھ کیئر، فائونڈیشن، نئی دہلی، سن اشاعت، ۲۰۲۰ئ، ص ۱۳۵ تا ۱۴۰

آگے تحریر کرتے ہیں:

”یہ خطوط زندگی کی حرارت سے معمور ہیں، ان میں مکتوب نگار کا بے ریا چہرہ، مزاج کی نفاست، ذوق کی رنگا رنگی و لطافت و حوصلے کا عزم، احساس کی حدت اور جذبات کی تمازت صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔“(۱)

مولانا شبلی کے مکتوبات سے عزت اور وقعت کا پاس، دیانت داری، جذبہ ایثار و قربانی، شبلی کی مخالفت کے محرکات، زمانہ کی حق ناشناسی کی شکایت، احساس عظمت، سادگی اور قناعت پسندی اور روشن خیالی جیسے سر چشمے پھوٹتے ہیں جن کا ذکر تنقیدی نکتہ نظر سے بڑا اہم ہے۔

عزت اور وقعت کا پاس

مولانا شبلی کی زود حس طبیعت سے ان کے رقیبوں اور مخالفوں نے ناجائزہ فائدہ اٹھایا اور ان کو طرح طرح سے پریشان کرنا شروع کیا، طبیعت کی زود رنجی نے بھی لوگوں کو موقع دیا کہ طرح طرح سے ان پر الزام تراشیں، ندوہ کے لڑکوں کو عدم پابندی مذہب کی ذمہ داری بھی ان پر تھوپی گئی، انھیں ملحد اور نہ جانے کیا کیا ٹھیرایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ لڑکوں کی مذہب کی طرف سے لاپروائی کا باعث شبلی ہیں۔ ندوہ کے جلسہ انتظامیہ نے یہ طے کیا کہ ایک کمیشن ان شکایات کی جانچ کرے، شبلی جیسے حساس اور زود رنج کے لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس توہین کو برداشت کرتے۔ مولانا شروانی کو لکھتے ہیں:

”اس صورت میں کمیشن بیٹھنا کہ میں مجرم کی حیثیت سے سامنے آئوں اور میرا اظہار تحریری یا تقریری لیا جائے، میں قیامت تک پسند نہیں کرسکتا، اور اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہوتا ہے تو آپ مجھ کو مطلع کریں تاکہ میں قطعی استعفا دے دوں“۔(۲)

---

(۱)مکتوباتی ادب، ڈاکٹر شمس بدایونی، اردو بک ریویو، ناشر، مصنف، ص ۴۶ ، ۴۷۔

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، مرتبہ، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، سن اشاعت ۲۰۱۰ئ، ص ۱۷۵۔

اس توہین کے باوجود بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شبلی کے پیش نظر ایک قومی کام کی اہمیت زیادہ ہے۔وہ مولانا شیروانی کو اس مکتوب میں جو کچھ لکھتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کہ مولانا شیروانی یا کوئی اور رکن مدرسہ آئے اور لڑکوں کا معائنہ کرے۔مذہب کی طرف سے طلبا کی عدم توجہی اور عدم پابندی کا جائزہ لے اور انتظام اور اصلاح کا طریقہ ہوچلے۔انھیں اس بات کا ڈر نہیں کہ ان کے خلاف شہادت دی جائے گی، وہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ اس کارروائی کی وجہ سے ایک قومی ادارے میں خواہ مخواہ شور و غل ہو اور اس کی شہرت متاثر ہو۔ان کا یہ خیال کہ:

”کسی معتمد کے مقابلہ میں طلبہ وغیرہ سے اظہار لینا یہ اس کی توہین ہے“۔(۱)

اگر کوئی بات واقعیت پر مبنی ہوتی تو شبلی اس کے اعتراف میں کبھی پس و پیش نہ کرتے بلکہ اس کا حل تجویز کرتے اور عمل کرنے کی کوشش کرتے تاکہ یہ خامی بھی دور ہوجائے۔انھیں اعتراف ہے کہ:

”طلبہ میں تقدس کا اثر نہیں ہے۔“ (۲)

ایک مرتبہ ندوہ کے لڑکوں کا ایک وفد مولانا شیروانی سے ملنے بھیکم پور گیا تھا جن کی وضع و قطع سے شروانی صاحب نے یہ سمجھ لیا کہ علی گڑھ کے لڑکے ہیں اور مولانا شبلی سے اس امر کی شکایت کی جس سے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

”یہ میری موجودگی سے قبل کا زمانہ ہے، اس کی وجہ میں نے بہت سوچا اس کے سوا کوئی نہیں کہ ابتدا سے آج تک کوئی پرنسپل مقدس اور با اثر نہیں ملا۔“(۳)

یہی وجہ تھی کہ وہ ایسے پرنسپل کی تلاش میں ہمیشہ کوشاں رہے اور جس کمیشن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس سے مولانا کو اندیشہ صرف اس حد تک تھا کہ ان کی عزت اور وقعت

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، ص ۱۷۷۔
(۲)مکاتیب شبلی حصہ اول ، ص۱۷۸۔
(۳)مکاتیب شبلی حصہ اول ، ص۱۷۸۔

اس سے متاثر ہوگی اور دشمنوں کو موقع ہاتھ آئے گا کہ اس کی تشہیر کریں گے، مخالفین سے اتنی گھبراہٹ ایک فطری بات تھی اس لیے کہ یہ بڑے زود حس تھے، اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

"بہر حال یہ معاملہ، موجودہ صورت میں معمولی معاملہ نہیں ہے، مجھ کو مطمئن فرمایئے کہ طریقہ تحقیقات کیا ہوگا؟ کیونکر ہوگا، عنوان کیا ہوگا؟ رزولیوشن میں خاص میرے زمانہ کے مقابلہ کا ذکر ہے، اس سے مخالف طبیعتوں کو ہر قسم کے مخالف پہلو کا موقع ملے گا اور اس سے وہ کام لیں گے۔"(۱)

دراصل شبلی کے مخالفین کا منشا بھی یہی تھا جس کو شبلی سمجھ چکے تھے۔

ندوہ سے مولانا شبلی کا تعلق جب تک رہا ایک طبقہ ہمیشہ ان کی مخالفت کی، ایک مکتوب کے ذریعہ شبلی نے دلچسپ انداز میں مولانا ابوالکلام کو مخالفین کی کارروائیوں سے مطلع کیا ہے:

"فرد جرم بہت بڑی ہے، خورد برد کا الزام ہے، بہاولپور کے عطیہ کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے، گورنمنٹ سے ایڈ کے متعلق خط وکتاب اکبر الجرائم قرار دی گئی ہے اور سب پر مستزاد الحاد اور زندقہ جن عقائد کا مجھ سے اقرار کرایا جائے گا ان میں کرامات الشیاطین حق کا بھی قائل ہوں، ہاں انہی جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔ اسی مکتوب میں آگے لکھتے ہیں:

"بھائی حقیقت یہ ہے کہ اب ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا، کہاں تک صبر کروں، بار بار قلم اٹھاتا ہوں اور پھر رکھ دیتا ہوں، طلبہ بے قابو ہوئے جاتے ہیں لیکن بڑی مشکل سے روکتا ہوں کہ فساد سے کیا حاصل، دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔(۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول ، ص ۱۷۹

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۶۲

مولانا شبلی کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہا کہ لوگ ان سے متعلق غلط رائے نہ قائم کرلیں اور کوئی بات ایسی نہ ہوجائے جس کی وجہ سے ان کی بدنامی ہو، بالخصوص قومی اور مذہبی معاملات میں چاہے وہ ندوہ سے متعلق ہوں یا الندوہ سے۔وہ بہت محتاط تھے۔ کمیشن کا بیٹھنا بھی وہ اسی وجہ سے پسند نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ الندوہ کے اداریہ میں مولوی عبدالسلام ندوی نے (جو اس زمانے میں الندوہ میں کام کرتے تھے) ایک مصرعہ لکھ دیا جس کو مولانا نے ناپسند کیا اور انھیں ہدایت کی کہ آئندہ احتیاط رکھیں کہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے درج نہ ہونے پائیں۔ لکھتے ہیں:

> ”رسالہ ادیب کی نسبت تم نے جو ریمارک لکھا ہے وہ اڈیٹوریل میں لکھا، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ میرا لکھا ہوا ہے، مجھ کو اس سے نہایت افسوس ہوا، میرا وہ طرز عبارت نہیں ہے اور جو مصرع تم نے نقل کیا اس کو تو میں اپنے حق میں ازالہ حیثیت عرفی سمجھتا ہوں، آئندہ احتیاط رکھو کہ ایسے مبتذل اور عامیانہ فقرے درج نہ ہونے پائیں۔“ (۱)

لوگ کیا خیال کریں گے، اس بات کا خیال مولانا کی حساس طبیعت کو ظاہر کرتا ہے اس لیے وہ ایسے معاملات میں احتیاط سے کام لیتے تھے، ایک مکتوب میں اپنے اصول کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

> ”میرا اصول یہ ہے کہ انسان ہر کام کے نقص و ہنر کا خود فیصلہ کرسکتا ہے، اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً عوام کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔“ (۲)

اس اصول کے حامی ہونے کے بعد مولانا شبلی کا کمیشن سے گھبرانا اپنے پیچھے چند وجوہات رکھتا تھا۔ بات یہ تھی کہ ندوہ میں اس وقت دو پارٹیاں تھیں، ایک مولانا شبلی کے حامیوں کی اور دوسری مخالفین کی۔

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۲۷
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۳۴

مخالفین کا پلہ بھاری تھا، اور مولانا شبلی کا یہ خیال تھا کہ اگر یہ سیاست بڑھتی جائے گی تو تعلیم اور ندوہ کے انتظامات ضرور متاثر ہوں گے جو وہ کسی قیمت میں بھی نہیں چاہتے تھے۔وہ خود ہر بات میں احتیاط سے کام لیتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کوئی بات ایسی سرزد نہ ہو جو قابل اعتراض ٹھہرے یا جس سے ذاتی شہرت متاثر ہو اور قومی و مذہبی کاموں کو نقصان پہنچے۔

دیانت داری

علامہ شبلی نعمانی کے مکتوبات کا ایک پہلو دیانت داری کا لحاظ بھی ہے جن کو کچھ مکتوب کے ذریعہ سے واضح کیا جا رہا ہے۔

اعظم گڑھ کا مدرسہ ان کے اپنے مکان میں تھا، مکان میں تعمیر و ترمیم کی ضرورت لاحق ہوئی تو بعض لوگوں نے رائے دی کہ مدرسے کے لیے جو چندہ وصول کیا گیا تھا اسے صرف کیا جائے لیکن مولانا شبلی نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا، اپنے بھائی محمد اسحاق کو لکھتے ہیں:

> "ہاں اس پہلو کو سوچ لو کہ مکان مدرسہ اپنا مکان ہے، اس لیے اس پر پبلک کا روپیہ لگایا جائے اور آئندہ مدرسہ کہیں اور اٹھ جائے تو لوگوں کو کہنے کا موقع ہو گا کہ عام چندہ سے اپنا مکان بنوایا گیا۔" (۱)

چونکہ ایسا کرنا ناجائز فائدہ اٹھانا تھا جس کو مولانا کبھی بھی گوارہ نہ کرسکتے تھے، دوسری بات یہ ہے کہ اس سے رائے عامہ ان کے خلاف ہوجاتی اس لیے ان کا یہ اصول تھا کہ کوئی کام کرنے سے قبل اس کے نقص و ہنر کو دیکھنا چاہیے۔حقیقت میں یہاں ان کے کردار کی خوبی سامنے آتی ہے کہ وہ مدرسے کے چندہ سے ایک پائی بھی ناجائزہ خرچ کرنا نہ چاہتے تھے۔خواہ اس سے ان کا ذاتی فائدہ کیوں نہ ہو رہا ہو، ممکن ہے کہ بعض کی نظر میں یہ خوبی غیر معمولی نہ سمجھی جائے لیکن موجودہ دور کے واقعات کو دیکھتے ہوئے اسے غیر معمولی کہنے میں تامل نہیں ہوتا۔

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۳۶۔

مالی اور رقمی معاملات اور حساب و کتاب میں بھی شبلی بہت حساس تھے، ندوہ کے معاملات میں وہ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ باقاعدہ حسابات رکھے جائیں۔ تعمیر کے سلسلے میں جو چندے لیے گئے تھے اس کا کام ایک مجلس کے سپرد تھا۔اس سے متعلق شبلی لکھتے ہیں کہ بجز ایک ابتدائی اجلاس کے پھر کوئی نہ ہوا اور انھیں یہ بات پسند نہ تھی کہ سب جمع خرچ محض ذاتی رائے پر ہو، انھیں اس امر کا ڈر تھا کہ کہیں ندوہ بھی دوسری انجمنوں کی طرح بدنام نہ ہو جائے۔ لکھتے ہیں:

> "ورنہ حالت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب انجمن حمایت اسلام کی طرح ندوہ کی مالی کارروائیاں بھی اخبارات کے منظر پر نظر آئیں گی، چار برس ہوئے کوئی حساب کتاب نہ مرتب ہو، انہ شائع ہوا، لوگ چاہتے ہیں کہ ماہ بماہ الندوہ میں جمع خرچ چھپے، یہاں کسی کو خبر بھی نہیں۔" (۱)

علامہ شبلی کو اس بات کا بہت احساس تھا کہ ندوہ کی امداد میں چونکہ عوام نے بھی حصہ لیا اس لیے باضابطہ حساب کتاب آمد و خرچ مرتب ہو اور الندوہ میں چھپتا رہے تاکہ عوام اسے دیکھ کر مطمئن ہوں کہ جو کچھ وہ امداد دیتے ہیں وہ جائز طریقہ پر صرف ہو رہی ہے۔ اس سے شبلی کے کردار کا ایک اور رخ سامنے آتا ہے کہ وہ معاملے کے کتنے صاف ستھرے تھے اور ان کو اپنی ذمہ داریوں کا کس حد تک احساس تھا۔ساتھ ہی ندوہ کی شہرت کا ان کو کس درجہ خیال تھا۔ انھوں نے کسی حالت میں بھی ندوہ سے ذاتی منفعت حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ دیانت داری کے ساتھ ساتھ مولانا شبلی کے اندر جذبہ خود داری بھی تھا، ذیل میں مکتوب کے ذریعہ ان کے اس وصف کو بھی پیش کیا جارہا ہے۔

جذبہ خود داری

علامہ شبلی نعمانی اپنے اصولوں کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے تھے، قومی کاموں کے سلسلے میں اگر دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی پڑے تو وہ کبھی پس و پیش نہ کرتے، لیکن جہاں تک خانگی اور ذاتی معاملات کا تعلق تھا انھوں نے کبھی بھی پسند نہ کیا کہ کسی کا احسان

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۷۴۔

لیا جائے اس لیے کہ ایسا کرنا خود داری کے منافی ہے۔ ان کے ایک دوست حکیم محمد عمر نے ان کو کسی خانگی معاملے میں لکھا تھا کہ "چند امور ضروری تھے جس کی اطلاع آپ کو دینی ضرور تھی مگر میں کچھ نہیں کرسکتا اور نہ مجھ سے ہوسکتا ہے۔" اس کے جواب میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"اوروں کے جرم میں مجھ کو ماخوذ کرنا کیا معنی؟ آپ میرے لیے کیا کرنا چاہتے تھے اور اب کس جرم کی سزا میں نہیں کرسکتے، آپ جیسے محب صادق سے یہ طرز تحریر عجیب ہے، باقی میری یہ حالت ہے کہ بجز قومی کاموں کے ذاتی معاملات میں کسی کا ایسا احسان نہیں لینا چاہتا۔" (۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شبلی اپنے اصول کے کتنے پابند تھے کہ ایک دوست کا احسان تو کیا اس کے اظہار کو بھی گوارہ نہ کرتے تھے اس لیے کہ اس بات کا تعلق ان کے خانگی معاملات سے تھا۔ حالانکہ قومی کاموں کے سلسلے میں انھوں نے دوست احباب تو کیا غیروں کے احسانات اٹھانے میں بھی پس و پیش نہ کیا۔ خانگی معاملات میں وہ موقع ہی نہ دیتے تھے کہ دوسرے ان پر احسان کرنے کی سوچیں۔ اور اگر ان کے ساتھ کوئی سلوک کرتا تو ان کی خودداری کا تقاضا ہوتا کہ اس کے احسانات سے کسی طرح سبکدوش ہوں۔ اور خود بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کوئی سلوک کرنے کی کوشش کرتے۔ ترکی کے سفر کے دوران ان کی ملاقات حسین آفندی سے ہوئی جو پہلے سفیر بمبئ تھے اور اس زمانے میں ترکی میں محکمہ پولیس کے افسر تھے۔ مولانا شبلی کے ساتھ یہ بڑی مہربانی سے پیش آتے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے والد شیخ حبیب اللہ کو ۱۵ جون ۱۸۹۲ء کے خط میں قسطنطنیہ سے لکھتے ہیں:

"ان کے اخلاق نے مجھ کو نہایت گرانبار کردیا ہے اور میں کسی قدر سبکدوش ہونا چاہتا ہوں، اس لیے عرض ہے کہ نہایت اہتمام، نہایت تلاش اور جدوجہد کے ساتھ نظام آباد کے برتن ارسال فرمائیے، کسی ہوشیار شخص کو نظام آباد بھیجئے، جو وہاں کے کسی رئیس کی معرفت

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۵۷

فرمایشی بنوا کر لائے۔"

اس سلسلے میں مزید ہدایات دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر یہ ممکن نہ ہو تو لکھنؤ کی چکن کا ایک تھان مگر نہایت عمدہ فردی بوٹیاں ہوں، نہایت باریک اور نازک کام ہو یہ بھی نہ ہو تو مراد آباد کا کوئی برتن مگر نہایت عمدہ، غرض کوئی نادر چیز ضرور بھیجئے۔" (۱)

اس میں نہایت کی تکرار سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی حسین آفندی کو کوئی نہایت عمدہ چیز دینا چاہتے تھے، اس لیے کہ وہ ان کے اخلاق سے "نہایت گراں بار" تھے اور ان جیسا نہایت حساس قسم کا شخص اس ذاتی نوعیت کے احسان کو کیسے برداشت کر سکتا تھا۔

۱۸۹۹ء میں اٹلی میں ایک اورینٹل کانفرنس منعقد ہو رہی تھی جس میں شرکت کا دعوت نامہ مولانا کے نام بھی آیا تھا، ان کے دوست نواب سید علی حسن خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ اس علمی سفر کے اخراجات اور مصارف قوم کے چندے سے ادا کیے جائیں لیکن مولانا شبلی جیسا خود دار شخص اس بات کو کیسے پسند کر سکتا تھا۔لکھتے ہیں:

"میری مالی اعانت، تو اس کی ضرورت نہیں اور اگر کسی قدر ہے تو اس کو حمیت نفس نے رفع کر دیا ہے۔"

آگے لکھتے ہیں:

"عام زبانوں پر یہ ہو گا کہ شبلی دریوزہ گری کرکے یورپ گیا۔" (۲)

جذبہ ایثار و قربانی

علامہ شبلی نعمانی کے مکاتیب میں شبلی کا ایک وصف جو نظر آتا ہے وہ ان کا جذبہ ایثار و قربانی بھی ہے مولانا شبلی کے دل میں قومی خدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔وہ قومی خدمات کے لیے ذاتی نقصانات برداشت کرتے اور عیش و آرام سب کچھ قربانی کر دیتے تھے۔

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۴ ، ۲۵

(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۴۵

سرزمین بمبئی سے انھیں جو دلی لگائو تھا۔اس کا ذکر آگے آئے گا۔اپنی لڑکی کی علالت کے باوجود وہ اس سے دور بمبئی میں رہ سکتے تھے لیکن جہاں قومی کام در پیش ہوں وہاں ان کی ذاتی خوشی اور مسرت سب یک لخت ختم ہوجاتی ہے۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

”اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں، لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا، لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے، خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کرسکتا ہوں اور بے تکلف کرسکتا ہوں۔“(۱)

ممتاز شخصیتوں میں شاید ہی چند ایک ایسی شخصیتیں ہوں گی جو ذاتی خوشی اور آرام کے مقابلے میں قومی خدمت اور ضرورت کو اہمیت دیں۔اس مکتوب سے مولانا شبلی کے سچے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔اور اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ان کو قومی خدمت بالخصوص ندوہ کے معاملات سے کس درجہ دلچسپی تھی کہ انھوں نے ایک دلچسپ ماحول کے مقابلے میں ایک خشک ماحول کو ترجیح دی اور اپنے کردار کی عظمت کا ثبوت دیا۔نہ صرف یہ بلکہ پیر سے معذور ہوجانے کے بعد بھی مولانا کے قومی کاموں میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہمت اور استقلال میں اضافہ ہوگیا اور کام کرنے کا ولولہ اور جذبہ اور بڑھ گیا، ایسے حالات میں ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید قومی کاموں سے ہمیشہ کے لیے سبکدوش ہوجاتا۔اس سلسلے میں ان کے حادثۂ پیر کا واقعہ بھی خود ان کی زبانی بیان کردینا بے محل نہ ہوگا جس سے ان کی طبیعت کا ایک اور عجیب پہلو سامنے آتا ہے۔وہی شبلی جو کبھی ایک چھوٹی سی بات پر بھی بگڑ جایا کرتے تھے اور کوئی معمولی قسم کی ناگواری بھی ان کے ماتھے پر شکن پیدا کردیتی تھی ، اس سانحۂ عظیم کے بعد جبکہ ان کے جسم کا ایک حصہ ان سے علیحدہ کردیا جاتا ہے، سخت جسمانی اذیت میں مبتلا رہتے ہیں اور کئی دن بستر علالت پر پڑے رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود انتہائی صبر و ضبط کا نمونہ بنے رہتے ہیں۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول۔ص۱۶۵

"لیکن ابھی تک تکلیف میں کوئی کمی نہیں تکلیف گو سخت ہے
لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے، جنھوں نے سر کٹوائے تھے، پائوں کٹنے پر
کیا روئوں۔صبر جمیل۔" (۱)

ایک مکتوب میں اس حادثہ کا نہایت تفصیلی حال لکھا ہے۔واقعہ سیدھے سادھے انداز میں بیان کرتے ہیں لیکن خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے وہی منظر آ جاتا ہے اور وہ ویسی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے لیکن شبلی نہایت اطمینان کے ساتھ اس واقعہ کو قلمبند کرتے ہیں۔ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر دلوں میں ان کی قدر اور وقعت اور بڑھ جاتی ہے۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:

"ایک اتفاقی تقریب سے میں اپنے وطن اعظم گڑھ میں آیا تھا اور ارادہ تھا کہ مہینہ دو مہینے یہاں قیام کروں گا، شعر العجم کے اجزا زیر تحریر تھے اور شاہنامہ پر ریویو کر رہا تھا، سترہویں مئی ۱۹۰۷ء قریباً دس بجے ہوں گے کہ میں دفتر سے اٹھ کر زنانہ کمرے میں گیا، اندر تخت بچھے ہوئے تھے، پائوں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گیا، تخت پر کارتوس بھری ہوئی بندوق رکھی تھی، میں نے ہاتھ میں اٹھالی اور پھر ایک دوسرے شخص کے ہاتھ میں دے دی، اتفاق سے گھوڑا گر گیا۔بندوق کی زد ٹھیک میرے پائوں پر تھی، بندوق کی نال سے پائوں تک صرف ایک بالشت کا فاصلہ تھا، کارتوس میں اگرچہ چھرے تھے لیکن چونکہ بڑے تھے اور فاصلہ بہت کم تھا، اس لیے ٹخنے کی ہڈی بالکل چور ہوگئی اور پائوں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے، جس وقت ضرب لگی مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ پائوں کو ایک جھٹکا سا لگا، کوئی تکلیف نہیں محسوس ہوئی۔جھٹکے کے بعد بندوق کے چھوٹنے کی آواز محسوس ہوئی، اس وقت میں نے گھبرا کر کہا یہ کیا ہوا، آواز سن کر باہر سے بعض آدمی اندر آگئے اس وقت میں اسی طرح پائوں لٹکائے بیٹھا تھا اور پائوں جوتے میں

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۵۸

تھے، ایک عزیز نے آکر میرے پائوں پر ہاتھ رکھا تو میں نے پائوں جوتے میں سے نکال لیا، اس وقت پائوں کی ایڑی جوتے میں پھنس کر رہ گئی۔ میں نے پائوں اوپر اٹھایا اور نوکروں سے کہا اس پر پانی ڈالو، پانی جب ڈالا جاتا تھا تو پائوں میں سے بھک بھک دھواں نکلتا تھا، قریباً پائو گھنٹہ تک پائوں اٹھائے بیٹھا رہا، جب پنڈلیاں دکھنے لگیں تو میں نے آدمی سے کہا کہ اب ایک تکیہ لاکر میرا پائوں اس پر رکھ دو، آدمی نے روکر کہا، کیا چیز ہے جو رکھی جائے گی، مجھ کو اس وقت تک نہ معلوم تھا کہ میری ایڑی جدا ہوکر جوتے میں رہ گئی ہے، جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ابتدا میں ایک فوری نظر کے سوا مطلق اپنے پائوں پر نظر نہیں ڈالا اور جو کچھ میں نے پائوں کے متعلق حالات بیان کیے ہیں، وہ ڈاکٹر اور دیگر حاضرین کی زبانی ہیں۔اس وقت خاص عزیزوں میں سے کوئی نہ تھا، نوکر اور ماما وغیرہ تھیں، یہ لوگ سخت زار قطار روتے تھے اور میں ان کو منع کرتا تھا، قریباً ایک گھنٹہ بعد فرزند عزیز محمد حامد آیا اور زخم کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا اور بہت بے قراری کے ساتھ گریہ وزاری کرنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد اس پر غشی سی طاری ہوگئی، میں نے نوکروں سے کہا کہ اس کے منھ پر پانی چھڑکو اور حلق میں پانی ٹپکائو، اس سے اس کو ہوش آگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میرے چھوٹے عزیز بھائی جنید سول سرجن اور اسسٹنٹ سوشل سرجن کو ساتھ لے کر آئے، بڑی غلطی یہ ہوئی تھی کہ جو رگیں کٹ گئی تھیں ان سے شدت کے ساتھ خون جاری تھا اور نہ خود مجھ کو اور نہ نوکروں چاکروں میں کسی کو خیال آیا کہ ان پر پٹی کس کر باندھ دیں جس سے خون رک جائے۔

بہر حال ڈاکٹر نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ رگوں کے منھ باندھ دئے جس سے خون رک گیا، اس کے بعد میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر پائوں جوڑنے کے قابل ہو تو خیر ورنہ سرے سے نکال ڈالئے، ڈاکٹر نے کہا کہ پائوں کاٹنے کے بغیر کوئی چارہ نہیں، غرض بے ہوشی کی

دوا پلائی گئی اور عمل جراحی شروع کیا، چونکہ ہڈیاں کچھ اوپر تک پھٹ گئی تھیں، اس لیے نصف پنڈلی جدا کردی گئی (اور متصل ہرزہ گردی کی سزا دی گئی) عمل جراحی کے پورے ہونے کے دس پندرہ منٹ بعد مجھے ہوش آیا اور زخموں کے ٹانکے اور رگوں کی کھیچاوٹ کی تکلیف محسوس ہوتی تھی، آج نواں دن ہے، ڈاکٹر ایک دن بیچ دے کر زخم کھولتا ہے، دھوتا ہے اور پھر باندھ دیتا ہے، تکلیف میں ابھی تک کوئی کمی نہیں ہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدا ئے واقعہ سے اس وقت تک طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے، سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اس کے پائوں کاٹے گئے تو کیا ہوا؟

ظاہری حالات کے لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر پائی، بہت چلا پھرا، دوڑا دھوپا، ملا جلا، آخر کہاں تک؟ خود پائوں توڑ کر بیٹھنا چاہیے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بیٹھا دیا، گر نستانی بہ ستم میرسید'' (۱)

اس میں شک نہیں کہ ان کے پیر کا حادثہ ذاتی اور نیجی حیثیت رکھتا ہے لیکن ان کے احباب، عقیدت مندوں اور شاگردوں کا اس حادثہ سے متاثر ہونا ضروری تھا، ہر طرف سے خطوط آنے لگے، بعض اشخاص نے اس حادثہ سے متاثر ہوکر اشعار لکھے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور مولانا کے پاس بھیجا مولانا نے بغرض اشاعت الندوہ کو دے دیا، یہاں یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ان عقیدت کے پھولوں سے الندوہ کا گلدستہ کیوں سجایا گیا لیکن یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے مولانا شبلی کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔غرض یہ کہ مولانا شبلی نے سید سلیمان کو ایک مکتوب میں یوں لکھا:

''احباب نے بھی رباعیاں لکھیں، الندوہ کے لیے بھیج دوں گا، ایک صاحب کو خوب مضمون ہاتھ آیا کہتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۵۵ ، ۱۵۷

کیا اس سے بھی ہوگی کوئی ساعت منحوس
زخمی ہوا جب کہ پائے شبلی افسوس
اک پائوں عدم کو کیوں نہ جاتا اقبال
تھا اہل فنا کو اشتیاق پا بوس" (۱)

مضمون ''خوب'' ضرور ہے لیکن شبلی کے پائوں کو ان کے عقیدت مند شاگرد مولوی محمد اقبال نے اتنا مقدس کردیا کہ شبلی بھی خوش ہوگئے، لیکن ایسی باتیں حریفوں کے دل کو کیسے خوش کرسکتی ہیں جبکہ شبلی کے اطراف مخالفین کا ایک سمندر تھا اور رشک و حسد کی آگ جل رہی تھی۔

شبلی کی مخالفت کے محرکات

علامہ شبلی نعمانی کے خطوط کا ایک اہم پہلو''شبلی کی مخالفت کے محرکات'' کا بھی ہے علامہ شبلی کی مخالفت میں اس دور کے بعض علماء نے بڑا حصہ لیا اس لیے کہ شبلی میں روشن خیالی تھی اور ترقی پسندانہ ذہنیت، وہ مذہب کی بنیادی باتوں پر زور دیتے تھے اور اکثر علماء مذہب کے معاملات میں ذرہ بھر بھی کوئی نئ بات سننا نہ چاہتے تھے اور رسمی باتوں کو مذہب کی بنیاد قرار دینا عین ایمان سمجھتے تھے، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ شبلی کی مخالفت کرتے۔ ان کی ہر بات اور ان کا ہر کام بعض علماء کے نزدیک قابل اعتراض ٹھہرتا، جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبیؐ کی ترتیب کا کام شروع کیا تو تقریباً ہر سمجھدار فرد اور طبقہ نے اس کو خوش آمدید کہا۔ اس کی اعانت کے سلسلے میں کافی لوگ مستعد ہوگئے۔ والیۂ بھوپال نے باقاعدہ اعانت کی اس لیے کہ ان کے دل میں عشق محمدی تھا اور وہ مولانا کی علمیت اور صلاحیتوں سے بھی ناواقف نہ تھیں، شبلی پر والیۂ بھوپال کی اس مہربانی کو دیکھ کر بعض مولوی چراغ پا ہوگئے اور کوشش شروع کی کہ کسی طرح یہ اعانت بند ہوجائے اور مولانا شبلی کو نقصان پہنچے۔اس موقع پر وہ مولانا شیروانی کو لکھتے ہیں:

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۵۸

"یہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کو تقدس کا دعویٰ ہے، مولوی دنیا
میں آتے ہیں تو ہم سے بڑھ کر دنیادار بنتے ہیں۔" (۱)

حالانکہ شبلی کا روئے سخن دو ایک مولویوں کی طرف ہوگا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بات میں کچھ لطف سا آتا تھا کہ چھیڑ چھاڑ جاری رہے، اس عبارت کے ذریعہ انھوں نے خواہ مخواہ مولویوں اور علماء کے طبقے کو دنیادار قرار دے دیا جو ظاہر ہے کہ اس طبقے کے لیے تکلیف دہ تھا۔

ایک اور موقع پر جبکہ مولانا شبلی نے بعض ارکان ندوہ کی مدد سے مولوی عبدالکریم کو الندوہ کی ایڈیٹری سے معطل کردیا تھا۔ مخالفین کو ان کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع ملا۔ مولوی عبدالکریم نے الندوہ میں ایک مضمون ایسا شایع کیا تھا جو مسلمانوں کے اس وقت کے جذبات سے ضرور مطابق تھا لیکن اسلام کے منافی۔ ظاہر ہے کہ مولانا شبلی جیسے مسلمان کے لیے یہ کب گوارہ ہوسکتا تھا۔ انھوں نے نہ صرف عبدالکریم کو معطل کرا دیا بلکہ حکومت کو بھی اس امر کی اطلاع کردی۔ اس مضمون کی تردید چونکہ عام جذبات کے خلاف تھی اس لیے مولانا شبلی کے مخالفین اس کو لے اڑے اور ان کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ایک مکتوب میں اس طرف اشارہ ہے:

"اشرار ...... کا جواب لکھنا ضرور ہے، ان منافقین نے ایک
طرف تو حکام میں یوں سرخروئی پیدا کی کہ مولوی عبدالکریم کی معطلی پر
ہم نے لوگوں کو آمادہ کیا اور مجارٹی حاصل کی، دوسری طرف مجھ کو قوم
میں سخت بدنام کیا گیا اور ہر جگہ اپنی برأت کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں اور یہ
سب کو یقین دلایا کہ ہم نے جو کچھ کیا شبلی کی دھمکی سے کیا۔" (۲)

مولانا شبلی کے مخالفین میں مسلم گزٹ لکھنؤ کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین بھی تھے جو اپنے اخبار میں شبلی کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے، ان کو حکومت نے کسی وجہ سے لکھنؤ سے نکال دیا جس پر شبلی مطمئن اور خوش معلوم ہوتے ہیں لکھتے ہیں:

---

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۰۱
(۲) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۷۴، ۷۵

> ”ہاں! وحید الدین لکھنؤ سے تشریف لے گئے اور اودھ اس کثافت سے صاف ہوگیا، اخبارات میں بھی یہ ذکر آگیا ہے، حقیقت میں اودھ نجاستوں میں آلودہ ہو رہا تھا، حریت اور آزادی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، لیکن سفاہت اور حریت مختلف چیزیں ہیں۔“ (۲)

مولانا شبلی کو حیرت اور آزادی کے علم برداروں میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن یہ عام نعرہ لگانے والوں میں سے نہ تھے۔ بلکہ یہ اسلام اور اس کے اجزاء کی صحیح اسپرٹ کو اپنانے کے قائل تھے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے شبلی ترقی پسند اور صحت مند ذہن رکھتے تھے، انھوں نے تاریخ اور مذہب کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا تھا ان کے مشاہدات بہت وسیع تھے اس لیے آج بھی ان کی تصانیف قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے افاضل آج بھی شبلی کی تصانیف کا حوالہ دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق انھوں نے کافی کام کیا اور برسوں محنت کی۔ ممالک اسلامیہ کا دورہ کرکے مختلف نصاب ہائے تعلیم کا مطالعہ کیا، سرسید کو مفید مشورے دیے اور ندوہ کی تنظیم کی طرف توجہ دی۔ ندوہ کے نصاب تعلیم میں تبدیلی کی تحریک، اعظم گڑھ کے مدرسہ کا قیام یہ سب ان کی علمی دلچسپی کا ثبوت ہیں، ندوہ کو وہ ایک آئیڈیل درسگاہ بنانا چاہتے تھے لیکن مخالفین کی کوششوں نے جس میں علماء کا ہاتھ زیادہ ہے ان کو وہ سب کچھ نہ کرنے دیا جو کچھ وہ چاہتے تھے۔ چونکہ شبلی کو ایسے کاموں سے حقیقی معنوں میں دلچسپی تھی اس لیے ان کے ارادوں میں بھی صداقت تھی، لیکن یہ شبلی کی نہیں بلکہ اس دور کے لوگوں کی بدقسمتی تھی کہ انھوں نے شبلی کو غلط سمجھا اور یہ رائے قائم کرلی کہ شبلی جو کچھ کرتے ہیں نام و نمود کی خاطر اور اپنی شہرت کے مدنظر۔ اسی رشک و حسد نے مخالفت کا سامان پیدا کیا حالانکہ شبلی کے پاس صحت مند خیالات تھے، مفید اسکیمیں تھیں اور ساتھ ہی وہ خود اعتمادی اور انفرادیت رکھتے تھے، دوسروں کے اشاروں پر چلنا انھوں نے کبھی نہ سیکھا۔ وہ خود راہ متعین کرتے اور اس پر چلتے تھے۔ نہ تو وہ حکومت کے پٹھو تھے اور نہ عوام کے لائوڈ اسپیکر، شبلی میں کچھ باتیں ضرور ایسی تھیں جس کی وجہ سے

---

(۱) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۸۲

نہ وہ دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا سکے اور نہ خود کسی کے ہم خیال بن سکے۔ اکثر ارکان ندوہ ان سے بد ظن تھے اور خود شبلی کی طبیعت کے خلاف تھا کہ ایسے ماحول میں کام کریں جہاں اکثر لوگ ان سے بد ظن ہوں، وہ اسے منافقت سے تعبیر کرتے تھے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ندوہ سے مستعفی ہوجائیں تاکہ مزید غلط فہمیوں اور مخالفتوں کو دعوت نہ دیں۔ لکھتے ہیں:

> "ندوہ کی پچھلی کارروائیوں نے مجھ کو یقین دلایا کہ ارکان ندوہ مجھ سے بد ظن رہتے ہیں اور اس لیے کسی عملی کام میں میرے شریک ہونے سے ڈرتے ہیں، میں کسی کے خیالات پر کوئی بار نہیں ڈال سکتا، لیکن خود منافق بننا اور دوسروں کا منافق بنانا کیا ضرور ہے۔" (۱)

ایک اور مکتوب میں واضح طور پر ان کے اس خیال کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ندوہ کے دیگر ارکان کی پالیسی اور ان کی اپنی پالیسی میں تضاد تھا اور یہ بھی کہ ان کو ندوہ سے اور ایسے قومی کاموں سے کتنا لگائو تھا۔ لکھتے ہیں:

> "اب آپ لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ جس کام پر میں نے برسوں غور کیا ہے، اس کے سامان بہم پہنچائے ہیں، اس کو اچھی طرح کرسکتا ہو، اس میں بھی آپ ہاتھ لگانے نہیں دیتے، رسالہ ندوہ اور نصابِ تعلیم دونوں چیزیں میرے خاص مذاق کی تھیں اور شاید میں اس کام کو کسی قدر انجام بھی دے سکتا تھا، دونوں سے آپ نے مجھ کو الگ رکھا، مجھ کو ان کی شرکت سے عزت و ناموری مقصود ہوتی تو اس کے لیے علی گڑھ سے بہتر میدان نہیں تھا، مقصود یہ تھا کہ یہ کام اچھی طرح انجام پائے لیکن آپ لوگ ایسا ڈرتے ہیں کہ میں شریک ہوا اور میں نے مذہب کو اور طرز تعلیم کو الٹ دیا، بہرحال مجھ کو کسی کے ظن اور خیال پر اعتراض نہیں، لیکن جب یہ کیفیت ہے تو بے فایدہ دخل در معقولات سے کیا حاصل ہے، مجھ کو اب ندوہ سے معاف کردیجئے، مجھ

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۳۹

سے صرف نقارچی کا کام لینا مقصود ہے تو اور بھی بہت لوگ ہیں، افسوس ہے کہ ہم مسلمانوں کے قلوب کی یہ کیفیت رہ گئی ہے، اب کی جلسہ کے لیے میں نے سامان کرلیا تھا، لیکن ایسے مجمع میں شرکت سے کیا فائدہ جہاں سب لوگ مجھ سے بد ظن ہوں۔" (۱)

زمانہ کی حق ناشناسی کی شکایت

علامہ شبلی کے مکاتیب کا مطالعہ کرتے وقت "زمانہ کی حق شناسی کی شکایت" کا زاویہ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے، یہ حقیقت ہے کہ شبلی نے مذہب، قوم اور ملک کی جو بھی خدمات انجام دیں وہ نہایت پر خلوص انداز میں دیں لیکن ان کی زندگی میں اتنی قدر نہ ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی بلکہ چند ایک پارٹیوں نے مسلسل مخالفت پر کمر باندھی جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بعض لوگوں نے والیہ بھوپال کو بھی شبلی کے خلاف کرنے کی کوشش کی حتی کہ بعض مولویوں نے کفر کے فتوے بھی لکھ کر بھوپال بھیجے، شبلی کی مخالفت میں مولویوں کے علاوہ علی گڑھ کی ایک پارٹی نے جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خان بھی شامل تھے خوب سرگرمی سے حصہ لیا، علی گڑھ پارٹی کی مخالفت کا ذکر تو آگے کے صفحات میں آئے گا لیکن قوم کی اس حق ناشناسی سے شبلی کو بڑی تکلیف پہنچی تھی۔ شبلی تو کیا ہر اس شخص کو تکلیف پہنچ سکتی ہے جو خلوص کے ساتھ بغیر کسی ذاتی مفاد کے کام کرتا ہو۔ لکھتے ہیں:

"یہ ہے ہمارا خلوص، خیر زمانہ گو حقیقت شناس نہیں ہے، تاہم سچ ہمیشہ نقاب میں نہیں رہے گا۔" (۲)

چونکہ شبلی زمانے کے ہاتھوں کافی پریشان رہے اسی لیے زمانے کی حق ناشناسیوں کے وہ ہمیشہ شاکی رہے۔ مخالفتوں کا سبب ان کی انفرادیت، ان کی طبیعت کی جذباتیت اور مذہب کے معاملے میں ان کے صحت مند نظریات کے علاوہ ان کے کام اور ان کی شہرت تھی۔

---

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۴۰، ۱۴۱

(۲) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۸۷

شبلی ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے تھے جبکہ لوگوں میں عاقبت اندیشی کی کمی تھی۔ ہر نئے اور اچھے کام پر لوگ نکتہ چینی کرتے تھے اور کام کرنے والے کی شہرت ان کے لیے رشک و حسد کا سامان فراہم کرتی تھی۔ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کی جاتی تھیں تاکہ شبلی کچھ کرنے سے باز رہیں، اگرانہیں آزادی سے کام کرنے کا موقع دیا جاتا تو پتہ نہیں شبلی قومی خدمات کے میدان میں کہاں تک پہنچ جاتے۔ صرف ندوہ ہی کو لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ شبلی نے اس کو آگے بڑھانے میں کیا کچھ نہ کیا۔ ایک طرف آغا خاں کو ہموار کرنے کی کوشش کی، دوسری طرف رام پور سے تعلقات بڑھائے، حیدر آباد اور بھوپال سے رقمی امداد جاری کروائی، گورنمنٹ کو بھی ناخوش نہ کرنے کی ہمیشہ کوشش کی، مصر کے سید رشید رضا کو ہندوستان بلایا تاکہ ندوہ سے بیرون ملک کے لوگ بھی روشناس ہوں۔ اس طرح ندوہ کے ساتھ ان کی شہرت اور مقبولیت بھی لازمی تھی جس پر مخالفین جلتے تھے حالانکہ شبلی کے مقاصد کا جائزہ لیا جائے تو یہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے کیا اس میں قوم کی بہبودی پیش نظر تھی، اس سلسلہ میں خود شبلی لکھتے ہیں:

> ”قوم میں جب نیک و بد کی تمیز ہوتی ہے تو وہ کسی چیز سے نہیں ڈرتی، اس کو خود بھروسا ہوتا ہے کہ وہ خذما صفا کرلے گی، جب علم نہیں رہتا اور حسد رشک کے سوا اور کوئی جوہر نہیں موجود ہوتا تو لوگ اس قسم کی باتیں کہہ کر اپنا دل خوش کرتے ہیں اور لوگوں کو بدگمان بتاتے ہیں۔“ (۱)

ایک اور مکتوب میں اپنے دوست سید عبدالحکیم دسنوی کو لکھتے ہیں :

> ”یقین فرمایئے زمانہ کی خربازاری دیکھ کر دنیا میں زندگی وبال معلوم ہوتی ہے، خواص تک عوام بن گئے ہیں، حق و باطل کی تمیز کا مادہ مسلوب ہوگیا ہے۔“(۲)

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۹۲
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ۲۹۱

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زمانے کی مخالفتوں کے سبب شبلی کا دل ٹوٹ گیا تھا، جب کوئی شخص دیانت داری کے ساتھ کوئی کام کرے اور لوگ اسے غلط معنی پہنائیں تو اس حق ناشناسی کے باعث اس کا ناامید ہوجانا ایک فطری امر ہے۔ خصوصاً شبلی جیسی زود حس طبیعت رکھنے والے پر ان باتوں کا زیادہ اثر ہوسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ شبلی کی سیرت کے مطالعے میں ہر جگہ ان کے احساس عظمت کے ساتھ ساتھ کچھ مایوسی اور بیزاری کی علامات پائی جاتی ہیں، عبدالباری ندوی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> "بھائی میں تو اب چراغ سحر ہو رہا ہوں، تم لوگ اب اپنی ذمہ داری کو محسوس کرو، میں اپنے عیوب کو سب سے بہتر جانتا ہوں، المر اعرف بنفسہ، لیکن علمی صحیح مذاق کا پھیلانا اپنا کام سمجھتا رہا، اگر اس میں ذرا بھی کامیابی ہوئی ہو تو مسلم گزٹ کے مصنوعی مصائب کے قبول کرنے پر آمادہ ہوں، سخت افسوس یہ ہے کہ ہر حیثیت سے زمانہ میں خربازاری بڑھ گئی ہے نیک و بد کی تمیز مطلق نہیں۔" (۱)

مکاتیب کے مطالعہ سے جہاں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی میں کام کرنے کا سلیقہ تھا وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شبلی مصلحتاً کام کے شوروغل کو مناسب خیال کرتے تھے، پروپیگنڈہ کے بغیر حقیقت میں کام کی اہمیت کا اندازہ عام طور پر نہیں لگایا جاسکتا ، شبلی کو اس کا احساس تھا ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "شورو غل فی نفسہ بیہودہ چیز ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ کوئی کام دنیا میں بے اس کے نہیں چلتا، مصلحین اور رفاو مرز دونوں کی نظیریں دیکھ لو، علیگڑھ کالج صرف شورو غل سے قائم ہوا اور اب تک اسی پر قائم ہے۔" (۲)

احساس عظمت

شبلی کو اپنی اہمیت اور عظمت کاپوری طرح احساس تھا۔اس کا اندازہ ان کے بعض خطوط سے ہوتا ہے۔زبیری کے نام ایک مکتوب میں سیرۃ النبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۳۶

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص۵۲

"ایک آنکھ میں پانی اتر رہا ہے، اس لیے جلدی بھی کرتا ہوں
کہ کچھ کرلوں ورنہ جس قدر میں کرسکتا ہوں اتنا کرنے والا بھی نظر
نہیں آتا۔" (۱)

اپنے بھائی محمد اسحاق کے نام ایک خط میں ان کے احساس عظمت کا علم ہوتا ہے۔
ملاحظہ فرمائیں:

"دسمبر میں شاید آنے کا مقصد اس لیے ہے کہ کانفرنس دہلی
میں شریک ہوسکو، لیکن میرا مقصد خود شرکت کا نہیں ہے، کانفرنس
اب کی غالباً پھیکی ہوگی، مولوی حشمت اللہ و مرزا حیرت کی، بڑ بہت سن
چکے، مولوی حالی صاحب کا کوئی پارٹ نہیں ہے، مولوی نذیر احمد بھی
غالباً چپ رہیں اور بولیں بھی تو ان کا طرز اجیرن ہوچکا۔" (۲)

معاصرین سے متعلق شبلی کی رائے اس مکتوب سے ظاہر ہوتی ہے۔اس سے یہ بات
بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شبلی کانفرنس میں ممکن ہے اس لیے شریک ہونا پسند نہ کرتے ہوں کہ
اسے اپنے معیار کی نہیں سمجھتے تھے، اس بات سے بھی اپنی اہمیت اور احساس عظمت کا اظہار
ہوتا ہے۔

مولانا حالی نے سرسید کی سوانح حیات "حیات جاوید" کے نام سے لکھی جس کو مولانا
شبلی "،محض مدلل مداحی" سمجھتے ہیں اور اس کو پڑھ کر بڑی ناامیدی کا اظہار کرتے ہیں۔مولانا
حالی، شبلی کی بڑی قدر کرتے تھے اور خود شبلی کے دل میں ان کی بڑی عزت تھی۔حالی نے
"یادگار غالب" اور "حیات سعدی" لکھ کر ادب میں دو گراں قدر اضافہ کیا ہے، خود شبلی نے
بھی متعدد معیاری مشہور سوانح عمریاں لکھیں، اور چاہتے تھے کہ دوسرے بھی اسی معیار اور
انھی اصولوں پر کام کریں "حیات جاوید" جب منظر عام پر آئی تو شبلی نے کھل کر اس پر
اظہار خیال کیا۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

---

(۱) مکاتیب شبلی حصہ اول، ص۲۲۶
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۳۸

"حیات جاوید میں مولانا نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے، اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بدطینتی ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہو تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہوجائیں۔" (۱)

اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا شبلی حیات جاوید میں محاسن اور معائب دونوں رخ دیکھنے کے متمنی تھے لیکن یہ کتاب انھیں امید کے برخلاف نظر آئی۔ حالیؔ کی قدر و منزلت ان کے دل میں جتنی تھی اپنی عظمت کا احساس اس سے بھی زیادہ تھا، سرسید نے سوانح حیات لکھنے کی خواہش کا اظہار پہلے مولانا شبلی سے کیا تھا لیکن انھوں نے انکار کردیا ،اس خیال سے کہ وہ جس انداز پر لکھتے وہ "حیات جاوید" سے بالکل مختلف ہوتی۔ سوانح نگاری دراصل ایک فن ہے اور شبلی چاہتے بھی تھے کہ سرسید کی جو سوانح سامنے آئے وہ تمام فنی خوبیوں کی حامل ہو، ان کا خیال تھا کہ ہر کوئی اس میدان کا شہسوار نہیں ہوسکتا۔

افتخار صاحب نے مولانا سے خواہش کی کہ وہ ان کی لائف لکھنا چاہتے ہیں لیکن مولانا ٹال گئے اور ابوالکلام آزاد کو لکھا:

"افتخار عالم صاحب مولوی نذیر احمد کی لائف لکھ کر انہی آلودہ ہاتھوں سے حیات شبلی کو چھونا چاہتے ہیں، اجازت اور حالات مانگے ہیں، میں نے لکھ دیا ہے کہ ظاہری حالات تو ہر جگہ سے مل جائیں گے لیکن عالم السرائر خدا کے سوا ایک اور بھی ہے وہاں سے منگوایئے، بھئی بتا تو نہ دوگے ایسے لوگ لاکھ لکھیں تو کس کو خوشی ہوگی۔" (۲)

اس سے نذیر احمد کی توہین مقصود نہیں تھی بلکہ شبلی اونچے معیار کے قائل تھے۔ "حیات النذیر" کو وہ ایک معیاری سوانح خیال نہیں کرتے تھے، بلکہ جب افتخار عالم صاحب نے نذیر احمد کی لائف لکھنے کا عزم شبلی سے ظاہر کیا تھا اس وقت ایک مکتوب میں شبلی نے یہ لکھا تھا:

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۳۳

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۲۵۱ ، ۲۵۲

"یہ عناصر اربعہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے سوانح نگار بنتے
تو سوانح نگاری کا حق ادا ہوتا۔"

حیات شبلی سے متعلق بھی ان کا یہ خیال تھا کہ وہ پایہ کی سوانح ہو اور حقیقت یہ ہے کہ وہی شخص ان کی لائف بہتر لکھ سکتا تھا جو ان سے قریبی تعلق رکھتا ہو اور ان کی طبیعت اور فطرت سے پوری طرح واقف ہو، چاہے وہ ابوالکلام ہوتے یا سید سلیمان۔ خود شبلی کی خواہش بھی یہی تھی، چنانچہ سید سلیمان کو ایک مکتوب میں اس طرح لکھا:

"کبھی تم اور دنیا کے تمام کاموں سے فارغ ہونا تو تمہیں
لکھنا۔" (۱)

چنانچہ سید سلیمان ندوی نے اس خواہش کو پورا کیا لیکن وہ بھی غالباً اپنے استاد کے بتائے ہوئے اصولوں پر پوری طرح کار بند نہ رہ سکے۔ "حیات شبلی" کی حیثیت بھی بڑی حد تک مداحی ہوکر رہ گئی ہے جو شبلی کو منشاء کے مطابق نہیں۔

جس شخص کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہو اور اپنی عظمت کا احساس تو وہ کسی حالت میں بھی سستی شہرت کی طرف نہیں دوڑتا اور نام و نمود کی اسے ہوس نہیں ہوتی۔ شبلی سے متعلق ان کے مخالفین کا خیال تھا کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں نام ونمود کی خاطر کرتے ہیں اور ہر کام میں اپنا دخل چاہتے ہیں۔ حالانکہ مختلف کاموں میں شبلی اپنا نام محض اس لیے رکھتے تھے کہ کام کسی طرح تکمیل پائے۔ ان کی قدر و منزلت جو تھی وہ ظاہر ہے پھر یہ کس طرح شبہ کیا جاسکتا ہے کہ شبلی کو شہرت کی ہوس تھی، سید سلیمان نے انھیں یہ مشورہ دیا تھا کہ "دوسرے لوگوں کے نام سے کام لیا جائے" اس لیے کہ لوگ "ہر کام کی ابتدا ان کے (شبلی کے) نام سے دیکھ کر جلتے ہیں" اس کے جواب میں شبلی لکھتے ہیں:

"لکھتے ہو کہ لوگ میرے نام کی تکرار سے گھبرا گئے، بھائی یہ
کاغذات دوبرس سے چھپے پڑے ہیں، بیسیوں ضروری فرائض آنکھ سے

---

(۱) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۹۳

دیکھتا ہوں اور زبان سے ہر وقت ہائے پکارتا ہوں اسی اشاعت کے متعلق الہلال میں خط تک چھپوا دیا، جب کوئی نہ کرے تو کیا کروں، واللہ اب نام و نمود اور افسری کا شوق نہیں، کوئی کرے، اس کے ساتھ ہوں اور پیرو بن سکتا ہوں۔" (۱)

حقیقت یہ ہے کہ نام، رسوخ اور شہرت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، بہت سارے کام محض ذاتی تعلقات اور اثر و رسوخ سے بن جاتے ہیں، شبلی کے بجائے اگر کوئی اور ان کاموں کو انجام دینے کی کوشش کرتا جو شبلی نے انجام دئے تو شاید اتنی بھی کامیابی نہ ہوتی۔ شبلی نے خود ایسے تجربات کر کے دیکھے۔ لکھتے ہیں:

"تم کہتے ہو کہ بجائے اپنے مشیر حسین یا نواب علی حسن کا نام لکھوں، وقف اولاد کے متعلق ابتداء میں نے خود اشتہار دیا تھا کہ جو چندہ بھیجا جائے منشی احتشام علی کے پاس بھیجا جائے، صرف ۸/ روپیے ان کے پاس آئے تھے، پھر اچھے صاحب کے نام سے انگریزی کاغذات بھیجے، ایک شخص نے الٹ کر جواب نہیں دیا، مشیر حسین وغیرہ کا نام لکھ کر دیکھ لو، ایک درجن آدمی بھی جواب نہ دیں گے، تجربہ کرو تو معلوم ہوجائے گا، تم سمجھتے ہو کہ میں اپنے نام کے لیے ہر کام میں اپنا نام رکھتا ہوں، لیکن سب تجربہ کر کے ایسا کرنا پڑتا ہے۔" (۲)

ایک شخص جو صاف صاف حقیقت کا اظہار کرتا ہو اس پر یہ الزام لگانا کہ وہ نام و نمود کی خواہش رکھتا ہے محض ذاتی مخاصمت پر مبنی ہے۔

سادگی اور قناعت پسندی

علامہ شبلی نعمانی کے مکاتیب میں ان کی سادگی اور قناعت کا پہلو بھی ابھر کر سامنے آتا ہے ، اپنے زمانے میں شبلی نے نہ صرف شہرت حاصل کی بلکہ نہایت باوقار انداز میں

(۱) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۷۱

(۲) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۷۱ ، ۷۲

زندگی گزاری اس لیے ان کے نزدیک دنیاوی متاع و دولت اور جاہ و حشمت کی کوئی اہمیت تھی اور نہ ہوس، ان کی اس صفت کا اندازہ ان کی درج ذیل تحریر سے ہوتا ہے۔لکھتے ہیں:

"واقعی اب متاع دنیوی کی بالکل ہوس نہیں رہی، قوم کی کچھ خدمت ہوسکے تو زندگی نیک لگ جائے۔" (۱)

ظاہری ٹیپ تاپ محض دکھاوے اور اونچے معیار پر زندگی بسر کرنے کو مولانا شبلی نے کبھی پسند نہ کیا، ان کی طبیعت میں جھوٹی شان نہ تھی بلکہ وہ بہت زیادہ قناعت پسند واقع ہوئے تھے۔حیدرآباد سے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میں نے یہ عزم کرلیا ہے، کوئی معقول بات نکل آئے تو خیر ورنہ دنیاوی خواہشوں سے صاف دست بردار ہوتا ہوں، سو روپیے ہیں، چھاونی، عالیہ، اسکول وغیرہ کے چالیس پچاس نکل جائیں گے، باقی جس قدر بچے گا اس سے غریبانہ زندگی خاصی طرح بسر ہوسکتی ہے۔" (۲)

دنیاوی خواہشات سے عدم دلچسپی اور قناعت پسندانہ طبیعت کے علاوہ شبلی کو دنیاداری سے بھی نفرت تھی۔دنیاوی فائدے حاصل کرنے کے لیے کچھ دنیاداری بھی کرنا پڑتی ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ان میں چونکہ خودداری بھی تھی اس لیے وہ ملازمت کے معاملے میں بھی زیادہ کامیاب نہ رہ سکے۔علی گڑھ کا آخری زمانہ انھوں نے کانٹوں پر گذارا، حیدرآباد سے بہت جلد بیزار ہوکر واپس آگئے اس لیے کہ وہ خود کو وہاں کے ماحول میں ڈھال نہ سکے۔اپنے ایک عزیز محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

"عمر کا بڑا حصہ صرف ہوچکا، چند برسوں کے لیے دامنِ زندگی کو کیا آلودہ کروں، دعا کرو کہ جو گردن ہمیشہ بلند رہی بلند ہی رہے، گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا ورنہ میں اپنے گوشہ عافیت کو فلک

---

(۱)مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۲۰
(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۴۹

نما سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔" (۱)

حقیقت یہ ہے کہ شبلی کی طبیعت ملازمت کے ماحول کے لیے موزوں نہ تھی، خوشامد انھیں آتی نہ تھی، دوسروں کو بلاوجہ بڑا ماننا انھوں نے سیکھا نہیں پھر وہ ملازمت میں خوش رہتے تو کس طرح ؟ ملازمت دراصل انھوں نے چند مجبوریوں کے تحت اختیار کی تھی، ان کے والد نے کافی قرضہ چھوڑا تھا اس لیے اس کی ادائیگی کے سلسلے میں شبلی نے حیدرآباد کی ملازمت کو قبول کیا تھا۔ محولہ بالا تحریر کا آخری جملہ "گھر کے مصائب نے یہاں تک بھی پہنچایا۔" خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ شیروانی صاحب کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"ایک راز کی بات کہتا ہوں اپنے ہی تک رکھئے گا، آپ کو معلوم ہے، والدقبلہ نے تیس ہزار قرض چھوڑا تھا، اس میں سے اب چھ ہزار اور رہ گئے ہیں، اس کے مارے میں غربت کی خاک چھانتا پھرتا ہوں اور کس کمبخت کو نوکری کی غرض ہے۔" (۲)

حیدرآباد میں شبلی کی یافت معقول تھی لیکن وہاں کے اخراجات اور اونچے معیار زندگی کی وجہ سے پریشان تھے اس لیے کہ ان کی طبیعت میں قناعت پسندی اور کفایت شعاری تھی۔ لکھتے ہیں:

"یہ سچ ہے کہ لوگ بد حیثیت کی وقعت نہیں کرتے، لیکن یہ ان لوگوں کے لیے جن کو دوچار دن کا تجربہ ہو، جن لوگوں میں برسوں آدمی رہ چکا ہے اور رہے گا، وہاں ظاہری ٹیپ ٹاپ محض بے کار ہے۔" (۳)

شبلی کو ظاہری ٹیپ ٹاپ کی زیادہ فکر نہ تھی، ان کی سادگی اور قناعت پسندانہ طبیعت کا اندازہ اس تحریر سے بھی کیا جاسکتا ہے:

"میں اپنے مصارف برابر گھٹا رہا ہوں، سرمائی کچھ نہیں بنوائی، پرانی چھینٹ کی اچکن اس سال کو بھی ختم کرلے گی اور ان شاء اللہ

---

(۱)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ۱۰۳،۱۰۴

(۲)مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۴۵

(۳)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۲۱

اخیر سادگی تک آجائوں گا۔ بھائی ظاہری ٹیپ ٹاپ سے کیا ہوتا ہے۔" (۱)

شبلی کا خیال تھا کہ ترقی کی راہ میں مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے اور دوسروں کے آگے بڑھ جانے کی بڑی وجہ مسلمانوں کا اونچا اور گراں معیار زندگی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد ہندوستانوں کا رہن سہن بڑی حد تک متاثر ہوا، اس کے ساتھ ہی معیار زندگی بھی اونچا ہو گیا اور زندگی گراں ہوتی گئی۔ ہندوئوں نے خود کو سنبھال لیا لیکن مسلمانوں نے نئے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی نتیجتاً ان کی اقتصادی حالت گرتی گئی۔ شبلی لکھتے ہیں:

"میں تیس برس سے مسلمانوں کی حالت پر غور کر رہا ہوں، خوب دیکھا، اصلی ترقی کا مانع وہی گراں زندگی ہے جو سید صاحب سکھا گئے۔" (۲)

ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رہن سہن کے معاملے میں شبلی کس قدر قناعت پسند اور سادگی کے دلدادہ تھے اور حقیقت میں سادگی وقناعت ہی ایک مسلمان کا شعار ہونا چاہیے۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ سادگی پسند تھے، شروانی اور بوٹ کے مقابلہ میں علماء کی وضع کے مطابق لباس کو پسند کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں وہ چاہتے تھے کہ وہاں کے طلباء وضع و لباس و فرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہیں اور شروانی اور بوٹ سے احتراز کریں، لکھتے ہیں:

"مقصود زندگی کیا ہے۔ وضع ولباس وفرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں، گویا جزئی بات ہے لیکن میں شروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں، قص لحیہ تو سخت ناگوار ہے۔"

اس خط میں آگے لکھتے ہیں۔

"میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں، ایسے لوگ

---

(۱) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۲۱
(۲) مکاتیب شبلی جلد دوم، ص ۱۲۱

درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو۔" (۱)

اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مولانا شبلی کے خیالات بھی پرانے علماء سے زیادہ مختلف نہ تھے بلکہ ان کا منشاء یہ تھا کہ ندوہ کے طلبہ کامیاب اور مکمل انسان بن کر نکلیں، وہ انگریزی کے بھی مخالف نہ تھے بلکہ انھوں نے اس امر کی کوشش کی کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی بھی پڑھائی جائے لیکن وہ اس بات کو بھی گوارہ نہ کرسکتے تھے کہ نئ پود صرف انگریزی تعلیم کے پیچھے اور انگریزوں کی تقلید میں اسلامی طریقوں اور اصولوں سے منہ موڑے اور مذہبی تعلیم سے بے بہرہ رہے۔مذہبی اور اسلامی تعلیمات ان کا اولین مقصد تھا۔سید سلیمان ندوی کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں جو کہ کسی وفد کے بھیجنے کے سلسلے میں ہے کہ:

"صرف وہ طلبہ بھیجے جائیں جن کی وضع قطع اسلامی ہو اور احکام شرعیہ کے پابند ہوں یعنی نماز و جماعت وغیرہ کے اگر طلبہ اچھا نمونہ دکھائیں گے تو قطعی کامیابی ہوگی۔" (۲)

روشن خیالی

مکتوبات کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی روشن خیال عالم تھے۔وہ ہندوستان کے علماء کی صف اول میں شمار ہوتے تھے اور بیرون ملک کے علماء بھی ان کی عزت کرتے تھے یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ وہ اپنے ہم عصر علماء میں سب سے زیادہ روشن خیال اور حقیقت پسند تھے۔اس دور میں دوطبقے قوم کی قیادت کا دعویٰ رکھتے تھے۔ایک وہ طبقہ جو پرانی مذہبی تعلیم سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہونا کفر سمجھتا تھا اور دوسرا وہ طبقہ جو مغرب زدگی کے جنون میں اپنا گریباں چاک کرنے کی فکر میں تھا۔ایک وہ جو صرف دین کا امانت دار تھا اور دوسرا وہ جو دنیاوی ترقی کا کلید بردار تھا۔لیکن چند افراد ایسے بھی تھے جو مسلمانوں کی ذہنی وفکری صلاحیت کا رخ موڑنا چاہتے تھے جس کے پیچھے کوئی قوت نہ تھی بلکہ صرف پروگرام تھا،

(۱)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۱۳
(۲)مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۴۹

ولولہ تھا، کام کرنے کا جذبہ تھا، قوم اور مذہب سے محبت تھی، ان ہی میں ایک شبلی نعمانی کی ذات بھی تھی جس کو ان کی منفرد سوچ اور فکر کے سبب ہر دو گروہوں اور طبقوں نے غلط سمجھا، مولانا شبلی کو حقیقت میں مسلمانوں کی دنیا و آخرت دونوں کی فکر تھی۔

مخالفت کے باوجود مولانا شبلی نے یہ کوشش کی کہ دارالعلوم ندوہ میں انگریزی کو نصاب تعلیم میں شامل کیا تاکہ دارالعلوم کے فارغ التحصیل اپنی آئندہ زندگی کے ہر میدان میں کامیاب رہ سکیں لیکن بیشتر ارکان ندوہ کے نزدیک یہ سوچ منفی اورنا قابل قبول تھی اس لیے کہ وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ طلباء کتب درسیہ سمجھ کر پڑھ لیں اور بس، "اس پر کچھ اضافہ یا اس میں کچھ کمی ان لوگوں کو سخت بدگمان کرتی تھی"۔ شبلی لکھتے ہیں:

"انگریزی کے نام سے ان لوگوں کی روح نکل جاتی ہے۔" (۱)

ایک اور مکتوب میں تحریر کرتے ہیں:

"جلسۂ انتظامیہ میں میں نے باقاعدہ انگریزی کے داخل کرنے کی تحریک کی تھی اور اصرار کیا تھا کہ تحریک درج کی جائے، البتہ اس پر بحث نہیں ہوسکی، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ کارروائی میں میری تحریک لکھی بھی نہ جائے۔" (۲)

یہ مکتوب مولانا شیروانی کو لکھا گیا ہے۔ شیروانی صاحب مولانا شبلی کے عزیز دوست وہم خیال تھے، ان کی کوشش تھی کہ جہاں تک ہوسکے شبلی کی مخالفت کم ہو۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ شبلی کی طرف سے ایسی کوئی تحریک سامنے آئے جس کی ارکان ندوہ مخالفت کریں اور شبلی کے خلاف آگ اور تیز ہو، وہ اس جلسہ کی صدارت کر رہے تھے جس میں شبلی نے یہ تحریک پیش کی تھی۔ مولانا شیروانی چاہتے تھے کہ اس مسئلہ پر بحث ہی نہ ہو، اس بات کا علم شبلی کے ایک مکتوب سے ہوتا ہے جس میں لکھتے ہیں:

"جلسہ کے بعد میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر اس بحث سے کتراتے ہیں، آپ نے کہا تمہاری بدنامی کے ڈر سے ہے، باوجود ان تمام باتوں کے اگر آپ کو یہ تمام معرکہ بھول گیا تو نظیری کا

---

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۲۱
(۲) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۲۲

یہ مصرع سمجھ میں آگیا

آنکہ نسیاں آورد خاصیت با و من است

مجھ کو اس تمام بے اعتنائی پر واقعی رنج و افسوس ہے۔" (۱)

مولانا شبلی جب کسی موقف کو اختیار کرتے تھے تو اس پر جم جاتے تھے، جب کسی بات کا ارادہ کرلیتے تھے تو اس کو کسی طرح بھی ہو پورا کرنے کی جدوجہد اور مسلسل کوشش کرتے رہتے۔ انگریزی کے مسئلہ کو مصلحتاً مولانا شیروانی نے ٹالنے کی کوشش کی لیکن مولانا شبلی اپنی تحریک پر بضد تھے۔ لکھتے ہیں:

"ایک ہمارے روشن خیال شیروانی ہیں، جن کو میں اپنا امام کہتا ہوں، مشکل سے مسلمانوں کے پھسلانے کو تجویز پر راضی ہوئے تو عمل در آمد حیران ہیں، حالانکہ تمام طالب العلموں کو انگریزی پڑھانا مقصود نہیں، نہ میرا یہ خیال ہے، صرف اس قدر مقصود ہے کہ دوچار لڑکے انگریزی بھی پڑھیں، اتنی ذرا سی بات ان کے نزدیک اتنی عظیم الشان ہے، جس قدر محسن الملک کی فرضی یونیورسٹی۔" (۲)

آخر اس میدان میں کامیابی شبلی ہی کو ہوئی اور اس کے نتیجے میں ندوہ کے بعض فارغ التحصیل علماء نے اعلیٰ ترین مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی مہارت پیدا کی اور اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ مندرجہ بالا مکاتیب سے مولانا شبلی کے اس نظریہ کی وضاحت ہوتی ہے کہ مسلمان مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم سے بھی بہرہ ور ہوں۔ زمانے اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف مذہبی تعلیم ہی کافی نہیں، اور مذہب سے بے بہرہ رہ کر صرف مغربی علوم کی تحصیل بھی سودمند نہیں۔ شبلی اس صحت مند نظریہ کے قائل تھے کہ مسلمانوں کو مذہبی تعلیم کے علاوہ ایسی تعلیم دی جائے جس میں مشرقی اور مغربی علوم کا امتزاج ہو کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں روشن خیالی پیدا ہو اور وہ مغربی علماء کو نیچا دکھا سکیں

---

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۲۳

(۲) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۱۲۶

اور ان کے جوابات دے سکیں، بالخصوص ان کو جنھوں نے مذہب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔اس کے لیے انگریزی سیکھنا اور اس سے واقفیت پیدا کرنا ضروری تھا۔ شبلی علم کو محض ملازمتوں کے حصوں کا ذریعہ بھی بنانا نہ چاہتے تھے بلکہ صحیح معنوں میں علم سے محبت اور اس سے دلچسپی پیدا کرنا ان کا مقصد تھا۔ وہ مسلمان جنھوں نے صرف انگریزی تعلیم حاصل کی تھی ان کے دیکھنے کے بعد شبلی کا یہ خیال تھا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے۔مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی اور بلند ہمتی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے۔" (۱)

علی گڑھ کے قیام اور ان تمام باتوں کے مطالعے سے شبلی کے ذہن پر جو تاثرات مرتب ہوئے وہ یہ تھے کہ صرف انگریزی کی تعلیم مسلمانوں کے دماغوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرسکتی یا صرف مذہبی تعلیم ان کو زمانے کے ساتھ نہیں چلا سکتی۔

شبلی اور خواتین

علامہ شبلی نعمانی نے اپنے مکتوبات میں مسئلہ خواتین پر بھی روشنی ڈالی ہے،بالخصوص عطیہ فیضی، زہرا فیضی اور نازلی کے نام جو مکتوب لکھے ہیں ان میں تو کچھ ذاتی نوعیت کے ہیں اور کچھ عورتوں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں، مولانا شبلی کے اس زمانے کے خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں، اس دور کے خطوط کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ عورتوں کے تعلیمی اور دیگر مسائل سے متعلق شبلی کے خیالات کا پتہ چلتا ہے،اور شبلی کے یہاں آئیڈیل عورت کے نقوش ابھرتے ہیں اور ان تمام باتوں سے ان کی روشن خیالی کا ثبوت بھی ملتا ہے عطیہ کو لکھتے ہیں:

> "ایک لمبا چوڑا خط کل لکھ چکا ہوں، لیکن ابھی بھی سیر نہیں‌ہوا، اس لیے کچھ اور باتیں سن لو، نصاب تعلیم کے متعلق میں سرے (سے) اس کا مخالف ہوں کہ عورتوں کے لیے الگ نصاب ہو، یہ

---

(۱) مکاتیب شبلی، حصہ اول، ص ۵۰ ، ۵۱

ایک اصولی غلطی ہے، جس میں یورپ بھی مبتلا ہو رہا ہے۔کوشش ہونی چاہیے کہ ان دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہوگیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ بڑھتا جائے اور بات چیت، رفتار گفتار، نشست برخاست، مذاقِ زبان سب الگ ہوجائیں۔ یوں ہی تفرقہ بڑھتا رہا تو دونوں دو مختلف نوع ہوجائیں گے۔ آگے لکھتے ہیں البتہ بعض چیزیں مثلاً رضاعت، پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے نصاب میں اضافہ ہونے چاہئیں۔" (۱)

اس مکتوب سے شبلی کی روشن خیالی کا پتہ چلتا ہے کہ وہ عورتوں کا بھی وہی نصاب چاہتے تھے جو مردوں کا ہے، اس طرح وہ عورت کو گھریلو عورت کے بجائے تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے، اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس حالت میں اردو کا پورا لٹریچر جو کچھ کم نہیں ہے، عورتوں کے قابوں میں آجائے گا۔ سرسید، حالی اور تمہارے حقیر دوست کی تصنیفات ناقدری کے قابل نہیں۔"

علامہ شبلی نعمانی نہ صرف نصاب کے معاملے میں عورتوں اور مردوں کی مساوات چاہتے تھے ان کا خیال تھا کہ عورت اس قابل ہوجائے کہ مرد اسے اپنا دست نگرنہ سمجھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"عورتوں کے متعلق تمہاری رائے ہے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کم پڑھیں، اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں، لیکن یاد رکھو! مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کیے اس بل پر کیے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔" (۲)

علامہ شبلی عورتوں کو دلیرحوصلہ مند اور بہادر دیکھنا چاہتے تھے "دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا" نہیں۔

---

(۱)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ئ، ص ۱۲۰
(۲)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ئ، ص ۱۲۳

ان کا خیال تھا کہ "جمال اور حسن، نزاکت پر موقوف نہیں"۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مرد نما عورت زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہوسکتی ہے۔"

ایک اور مکتوب میں ورزش کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس سے جمال اور دوبالا ہوجاتا ہے، یہ صرف میری رائے نہیں بڑے بڑے اہل نظر کا یہی فیصلہ ہے۔" (۱)

اسی مکتوب میں کافی ہمدانی کے چند اشعار بھی تحریر کیے ہیں، اس کے علاوہ اپنے خیال کی تائید میں امین الرشید کی کنیزوں، تیموروں کے حرم کے چوکی پہرے اور حیدرآباد کی زنانہ پلٹنوں کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے:

"جب تک عورتیں نازک بنی رہیں گی مرد ان کو پورے حقوق نہ دیں گے۔" (۲)

اس مسئلہ پر دونوں میں کافی بحث رہی اور آخر کار شبلی کو یہ لکھنا پڑا۔

"مردانہ تعلیم میں میں ہارا اور تم جیتیں، لیکن یہ بھی مردانہ پن ہے اور عطیہ میں تو تم میں تمام خوبیاں مردانہ ہی پاتا ہوں گو تم اس کو اپنی توہین سمجھو"۔(۳)

شبلی اس خوبی سے ہار مانتے ہیں کہ ہار بھی جیت معلوم ہوتی ہے اور اس نزاکت سے اس متنازعہ مسئلہ کا رخ بدل دیتے ہیں کہ عطیہ بھی داد دیتیں ہوں گی۔ ایک مکتوب میں اپنے مجموعۂ کلام "بوئے گل" سے بعض اشعار انتخاب کرکے لکھ بھیجے اور ساتھ ہی اس کا مطلب سمجھاتے ہوئے تشریح کی تاکہ عطیہ بھی فارسی اشعار کو اسی انداز میں سمجھیں ،عطیہ نے اشعار کی تشریح کو اور خود اشعار کو پسند کیا جس کے شکریہ میں لکھتے ہیں:

(۱)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ئ، ص ۱۲۴
(۲)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ء ص۱۲۴۔
(۳)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ئ، ص ۱۲۶ ، ۱۲۷

”ان اشعار کی داد دینے کا تم سے بڑھ کر کس کو حق ہے۔“ (۱)

اس سے قبل کے ایک مکتوب میں عطیہ کی شعر فہمی پر یوں داد دی تھی:

”تم شعر خود کہتی نہیں، لیکن شعر کہنے سے شعر سمجھنا زیادہ مشکل ہے اور یہ وصف تم میں موجود ہے۔“ (۲)

شبلی ویسے تو عطیہ کی کسی نہ کسی خوبی کا اکثر صاف صاف اظہار کردیتے تھے لیکن بعض مواقع پر کنایہ سے بھی کام لیا ہے۔”خاتون“ میں ایک شعر چھپوایا تھا جس میں عطیہ کے افراد خاندان کا نام آیا تھا لیکن کنایۃً اس سے متعلق عطیہ نے انھیں لکھا، اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

”شعرا اور اہل ادب عموماً کنایہ سے نام لینا نہایت بلاغت اور لطافت خیال کرتے ہیں۔ جو لوگ جہانگیر بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھتے تھے، عموماً نور جہاں بیگم کا نام لاتے تھے، لیکن ہمیشہ کنایتاً، کبھی کسی نے تصریح نہیں کی۔“

اس کے بعد یوں رقم طراز ہیں:

”یوں تو صراحتاً تمہارے لیے وداعیہ غزل، خیر مقدم وغیرہ سب لکھ چکا ہوں اور عطیہ لکھنے پڑھنے کی کیا بات ہے میرا ہر رونگٹا اور ہر موے بدن تمہاری توصیف اور تعریف کا ایک شعر ہے“۔(۳)

علامہ شبلی نعمانی کے مکتوبات کے اور بہت سے ایسے پہلو ہیں جن کا احاطہ ایک باب میں کرنا مشکل ہے،یہاں صرف ان کی نشاندہی کی جاتی ہے جیسے شبلی اور موسیقی، عطیہ کی قدردانی، عطیہ کی شادی، مہمان نوازیاں وغیرہ۔ البتہ یہاں یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ اس میں تنقیدی نقطۂ نظر سے اظہار خیال کے لئے الگ باب درکار ہے۔

---

(۱)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ئ، ص ۱۲۷
(۲)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ئ، ص ۱۱۲
(۳)خطوطِ شبلی بنام خواتین فیضی، مولف : محمد امین زبیری، مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اشاعت ۲۰۲۰ئ، ص ۱۲۹

5th Chapter

باب پنجم

اردو کے مکتوباتی ادب میں شبلی کا مرتبہ

علامہ شبلی نعمانی نے تنقید، تاریخ، ادب، تحقیق، سوانح، ان تمام اصناف میں اپنے جوہر دکھائے، ان کی اکثر کتابیں اردو کے ادب عالیہ میں شامل سمجھی جاتی ہیں۔ان اصناف کے علاوہ مکتوباتی ادب میں ان کا مقام ومرتبہ اور حیثیت مسلم ہے۔انھوں نے مکتوبات میں مکالماتی خصوصیت تو پیدا ہی کی ساتھ ہی ان کو ذاتی اور نجی معلومات کے حصار سے نکال کر علمی وادبی رنگ وآہنگ عطا کیا اور ان میں انشاء پردازی کی چاشنی بھی بھردی، یہی وجہ ہے کہ ان کے مکاتیب کا مطالعہ کرنے والا ان میں عجب طرح کی رعنائی ولذت محسوس کرتا ہے۔

موضوعوں اور مضمونوں کی رنگارنگی کے علاوہ اسلوب بیان کی شگفتگی کے باعث بھی وہ اردو کے ایک بہت بڑے ادیب مانے گئے ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ زبان کی رنگینی اور طرز بیان کی دلکشی ان کی بڑی سے بڑی کتاب سیرۃ النبی سے لے کر ان کے چھوٹے مضمون بلکہ ایک مختصر سے خط میں بھی جھلکتی ہے۔وہ ایک صاحب طرز انشا پرداز اور ان کی ذات مجمع الصفات تھی اور اگر یہ کہا جائے مولانا شبلی اردو کے صاحب طرز مکتوب نگار تھے توغلط نہ ہوگا۔مولانا شبلی کی مکتوب نگاری کی رنگارنگی، دلفریبی، جذباتیت، ذاتی گھریلو معاملات، قوموں کی فکر، برادری سے لگائو، دینی و مذہبی مسائل، سیاسی سرگرمیاں، ندوۃ العلماء کی

ناقدری، اسکول کی ترقی اور دارالمصنّفین کے قیام کے علاوہ مولانا شیروانی اور عطیہ سے مکاتبت کے دوران خاص طور پر ادبی مباحث سے تعرض وغیرہ کی جھلک صاف طور نظر آتی ہے۔ علامہ شبلی کے مکتوب کی ادبی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے، خورشید الاسلام رقم طراز ہیں:

"شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمالنامہ ہیں۔ ان میں شبلی کی خانگی زندگی نمایاں نہیں ہے لیکن پس پردہ جلوئوں کی ایسی کمی بھی نہیں ہے۔ بہرحال ان خطوط میں ندوہ کے نقوش ہیں، سیرت پر مکالمات ہیں۔ شعرالعجم کے مباحث پر گفتگو ہے، نادر کتابوں کی دریافت پر خوشی کا اظہار ہے، تبصرے ہیں، تنقیدی اشارات ہیں، دوستوں سے سرگوشیاں ہیں۔ عزیزوں کی سفارش ہے، اپنی عظمت کا شعور ہے اور وہ لطائف ہیں جو روح و بدن کو مخمور کئے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔" (۱)

ایک دوسری جگہ ڈاکٹر خورشید الاسلام مولانا شبلی کے خطوط پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شبلی کے خطوط میں ان کی زندگی، ان کی ظرافت، ان کا ظرف سب کچھ ہے دوستوں سے دل لگی اور چھیڑ چھاڑ ہے۔ بزرگوں کا ادب ہے۔ مذہبی کاروبار ہے۔" (۲)

ڈاکٹر خورشید الاسلام، شبلی کا موازنہ، حالی اور غالب کی مکتوب نگاری سے کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"انسان کی تکمیل یہ ہے کہ وہ فرشتہ بھی ہو اور شیطان بھی۔ اس کو آپ کسی خاص نام سے نہ پکار سکیں۔ یہ بات نہ حالی میں تھی نہ شبلی میں البتہ شبلی میں زندگی سے حظ اٹھانے کی صلاحیت حالی سے کہیں زیادہ تھی۔ وہ نسبتاً زیادہ بیدار تھے، ان میں متضاد جذبات ابھر سکتے تھے، ان کی زندگی میں ایک حد تک صبح کی سپیدی اور شام کا سلوناپن دونوں

---

(۱)تنقیدیں، ڈاکٹر خورشید الاسلام، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سن اشاعت، طبع اول، اکتوبر ۱۹۵۷ئ، ص ۵۲

(۲)تنقیدیں، ڈاکٹر خورشید الاسلام، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سن اشاعت، طبع اول، اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۵۷

دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ ان میں وہ سر شاری نہیں جو غالب میں تھی۔
غالب کی شاعری، ان کی زندگی اور ان کے خطوط سب کے سب رچے
ہوئے ہیں۔ وہاں کوئی گوشہ ایسا دکھائی نہیں دیتا جو خام رہ گیا ہو۔ شبلی کی
زندگی اس منزل تک نہیں پہنچی، مگر پھر بھی بہت سی منزلوں سے
گزری۔" (۱)

ایک اور جگہ خورشید الاسلام تحریر کرتے ہیں:

"لیکن ان میں دو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہیں، رنگینی مزاج
اور وسعت مطالعہ، حالی کے مکاتیب میں کہیں بھی ان کا اظہار نہیں
ملتا۔ شبلی کے خطو میں مزاح کا عنصر بھی حالی سے کہیں زیادہ ہے۔" (۲)

علامہ شبلی نعمانی کے مکتوب کی اہمیت و افادیت کا احاطہ کرتے ہوئے مولانا شاہ معین
الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا نے جس میدان میں بھی قدم رکھا ان کی امتیازی شان
قائم رہی، یہی امتیازی شان ان کے خطوط میں بھی ہے۔" (۳)

ایک دوسری جگہ مولانا شاہ معین الدین، شبلی کے خطوط پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر
کرتے ہیں:

"وہ مذہبی علوم کے عالم بھی تھے اور جدید علم سے آشنا اور نئے
رجحانات کے واقف کار بھی پرانے علماء کی بھی صحبت اٹھائی تھی اور جدید
تعلیم کے ارکان کے ہمنشیں بھی رہے تھے۔ علمی میدان میں ناقد و محقق
بھی تھے اور شاعر و ادیب بھی، مورخ بھی تھے اور متکلم بھی مصلح بھی
تھے اور سیاسی بھی اس لیے ان کا ذوق بڑا متنوع تھا۔ اور ان کے
کارنامے بڑے گوناگوں ہیں، ان سب کا عکس ان کے خطوط میں نظر آتا

---

(۱) تنقیدیں، ڈاکٹر خورشید الاسلام، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سن اشاعت، طبع اول، اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۵۳
(۲) تنقیدیں، ڈاکٹر خورشید الاسلام، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، سن اشاعت، طبع اول، اکتوبر ۱۹۵۷ء ص ۵۸
(۳) ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۰

ہے جس سے ان کی پوری سیرت مرتب کی جاسکتی ہے۔" (۱)

مولانا شبلی کے مکاتیب کا موازنہ غالب سے کرتے ہوئے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی تحریر کرتے ہیں:

"اردو میں مکتوب نگاری کی اصل تاریخ مرزا غالب سے شروع ہوتی ہے، انھوں نے اپنی جدت و اختراع سے مکتوب نگاری کو ادب کی ایک اہم صنف بنا دیا اس وقت سے اب تک بہت سے مشاہیر کے خطوط شائع ہوچکے ہیں۔ مگر غالب کے بعد جو جدت و لطافت اور تازگی و بے ساختگی ادب و انشاء مولانا شبلی کے خطوط میں ہے وہ کسی کے خط میں نہیں ہے۔" (۲)

واقعہ یہ ہے کہ شبلی ایک کثیر الجہات ادبی شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک زبردست عالم دین، نقاد اور مورخ تھے اور اس کے پہلو بہ پہلو ایک باکمال شاعر بھی تھے۔اسی لیے ان کے مکاتیب میں بھی ان کی شخصیت کے مختلف رنگوں کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔شبلی کی مکتوب نگاری کی اہمیت اور ادبی مقام پر روشنی ڈالتے ہوئے احرار نقوی لکھتے ہیں:

"شبلی کی شخصیت کے مطالعہ میں سہ نفسیاتی رجحان زیادہ اغلب معلوم ہوتے ہیں۔ انا جذباتیت اور اڈونچر (Adventure) انا جو ان کو راجپوتوں کی وراثت سے ملی تھی۔ یہ وہی رجحان تھا جو رذیلوں کے داخلے میں تذبذب پیدا کرتا تھا اور معاصرین میں اپنے کو سب سے اونچا رکھتا تھا اور موقع پڑنے پر شبلی ان کی تنقیص اور تنقید سے بھی نہیں چوکتے تھے، شبلی کے خطوط آج بھی اس کے شاہد ہیں۔" (۳)

---

(۱)ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۵۰

(۲) ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۵۰

(۳)ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۶۲

احرار نقوی فنی اعتبار سے مولانا شبلی کے خطوط کو زیادہ اہم نہیں قرار دیتے، ان کا کہنا ہے کہ فن کار کے فن کو فن کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے ، ان کے خطوط کا خاصہ صرف ابوالکلام آزاد اور عطیہ فیضی کی محبت کا رنگ ہے، جس کو بڑی اہمیت دی ہے۔اس کے متعلق احرار نقوی تحریر کرتے ہیں:

”اکثر موقعوں پر شبلی بے نقاب ہوئے ہیں، کبھی مولانا آزاد کی محبت کے رنگ میں کبھی عطیہ فیضی کی رسم و راہ میں حالانکہ فنکار کو جب ہم دیکھتے ہیں تو فن کی تہذیب سے اس کا جائزہ لیتے ہیں مگر شبلی کے سلسلے میں قطعی یہ ممکن ہی نہ تھا۔ شبلی ندوے کے محرک، الفاروق کے منصف اور امام ابو حنیفہ کے مورخ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، اسی لیے عطیہ فیضی کے خطوط ہمارے لیے خاصہ کی چیز بن گئے ورنہ شبلی کے خطوط اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے جتنی انھیں دی جاتی ہے۔“ (۱)

ایک دوسری جگہ شبلی ہی کے مکتوب کے فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے احرار نقوی لکھتے ہیں:

”خط کا معائنہ دو طرح سے کیا جاتا ہے۔ایک تو فن کے اعتبار سے دوسرے خط نگار کی شخصیت اور اس کے مزاج اور انداز کا جائزہ لینے کے لیے اور اسی میں لگے ہاتھوں اس دور کے کچھ نقش و نگار بھی سامنے آ جاتے ہیں مگر خط کا فن جس کو کہتے ہیں وہ تو یہ نہیں ہوا۔ اس کے اصول کا معیار قطعی دوسرا ہے۔یوں تو شبلی کیا ہر شخص کے خط کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔حالی، نذیراحمد، سرسید، امیرمینائی، اقبال اور ڈاکٹر تاثیر کے خطوط اس نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان مکاتیب میں تو بالخصوص علمی بصیرت ملتی ہے مگر فن کے اعتبار سے جب خط کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو کچھ فنی اصول ہمارے خط کے تجزیہ میں

---

(۱)ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۶۵

رہنمائی کرتے ہیں۔ان کے پیش نظر ہم خط کے فن کا احاطہ کرتے ہیں۔
اس اعتبار سے شبلی کے خطوط کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ہیں، بہت
تھوڑے خطوط ایسے ہوں گے جن کو ہم فنی کہہ سکتے ہیں۔ شبلی کو خود
اس کا اندازہ تھا، شیخ رشید الدین صاحب انصاری نے جب اردو مکاتیب
کو طبع کرانے کی تحریک شروع کی تو مولانا شبلی نے کہا "میرے خطوط
بالکل بیمزہ ہوتے ہیں ان کو کیا جمع کرتے ہو مجھ کو خود مزہ نہیں آتا
اوروں کو کیا آئے گا۔" (۱)

احرار نقوی کا یہ بھی ماننا ہے کہ غالب کے بعد سب سے بڑے مکتوب نگار شبلی ہی ہیں، اس کے متعلق یہ لکھتے ہیں:

"اب اس ستم ظریفی کو کیا کیجئے کہ اردو ادب میں غالب کے
بعد چودھری محمد علی اور مہدی کے کچھ خطوط کو چھوڑ کر کوئی اچھا
خط نگار نہیں پیدا ہوا اس لیے غالب کے بعد شبلی کا نام لیا جاتا
ہے۔" (۲)

ایک دوسری جگہ احرار نقوی شبلی کی مکتوب نگاری کا مقام متعین کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"شبلی صرف اپنے خطوں میں اپنی ظرافت کا روپ دکھاتے ہیں،
مگر ان کی یہ ظرافت خطوں میں ہمہ گیر نہیں ہے ناہموار ڈھنگ سے
آئی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بہت تھکا ہارا کہیں ذرا دیر ٹھہر کر
جمائی لے کر مسکرا دیا ہو۔" (۳)

علامہ شبلی کے اکثر خطوط مبالغہ اور تکلف سے محروم ہیں لیکن اس کے باوجود ان کا اسلوب شگفتہ اور شائستہ ہے، ان سے ان کے حالات زندگی کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہے۔

---

(۱)ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۶۵
(۲)ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۶۵
(۳)ماہنامہ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، مدیر، ابن فرید، سن اشاعت، ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۲۶۶

بقول سلیمان ندوی:

"انسان کی بڑی سے بڑی لائف اگر مرتب کی جائے اور حالات کے استقصا کا خاص اہتمام کیا جائے، تاہم سوانح نگار کو اس کی زندگی کے بہت سے اوراق سادہ چھوڑ دینے پڑیں گے، بیچ بیچ میں ہفتوں، مہینوں بلکہ سالہا سال کے حالات ناواقفیت کی تاریکی میں مخفی رہ جاتے ہیں، لیکن اکابر رجال اور خصوصاً اہل قلم اور مصنّفین کے بہت کم دن ایسے گذرتے ہیں کہ ان کو خود خطوط لکھنا اور دوسروں کے خطوط کا جواب دینا نہ پڑتا ہو، اس لیے اس مسالہ سے اگر ان کی سوانح نگاری کا فرض ادا کیا جائے تو ان کی زندگی کے روزنامچہ کا خانہ خالی نہ رہ سکے گا۔" (۱)

مکتوباتی ادب میں علامہ شبلی کا مرتبہ ومقام اس میں کوئی شبہہ نہیں‌کہ بہت بلند ہے۔ اس موضوع کے مطالعہ وتنقید کا ایک دور گذر گیا اور اس عنوان کے تحت کافی تحریریں لکھی گئیں۔ گویا ادبی دنیا میں ہلچل سی مچ گئی، "مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی" پر تنقیدیں بھی ہوئی پسندو ناپسند کا اظہار بھی کیا گیا اور ایک طوفان آیا اور گذر گیا۔ لیکن زرخیز مٹی بھی چھوڑ گیا، جب جب یہ مٹی نم ہوتی ہے ہریالی نظر آنے لگتی ہے، جس طرح بوڑھی گنگا کی لہریں ہمیشہ جوان رہتی ہیں۔ جو کچھ ہوا اس کا اندازہ بھی نہیں تھا۔ جذبات اور خیالات خطوط کے اندر اسیر ہوجاتے ہیں، جو کبھی مرتے نہیں بلکہ زندگی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ مکتوب نگاری میں علامہ شبلی کا مرتبہ متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر شباب الدین لکھتے ہیں:

"ان سب باتوں کے علاوہ شبلی کے خطوط میں ان کی انشا پردازی بھی اپنے تمام جلووں کے ساتھ نمایاں ہے، علاوہ بریں ان کے خطوط کا اسلوب دلچسپ و دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ فصیح و بلیغ بھی ہے، اور جدت و لطافت اور سادگی و پرکاری کا نمونہ بھی، شبلی اپنی بات کو سیدھے سادے انداز میں بلا تکلف

---

(۱)مکاتیب شبلی حصہ اول، مرتبہ، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص ۶

اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں اور ہر موقع و محل کے لحاظ سے اسی کے مطابق طرز تحریر کا انتخاب کرتے ہیں، اسی وجہ سے ان کے خطوط میں عبارت کی صفائی، سلاست و روانی اور نزاکت و شگفتگی ملنے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لطیف و نازک تشبیہ و استعارہ بھی دکھائی دے جاتے ہیں، جن سے ان خطوط کا ادبی حسن اور نکھر جاتا ہے، بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''ان کا ہر خط ایک زعفران کا پھول ہے، جس میں باغ فردوس کی خوشبو ہے''، گو کہ یہ خطوط اشاعت کے لیے نہیں لکھے گئے تھے اور ان کی نوعیت محض ذاتی تھی، لیکن اپنے دلکش طرز تحریر اور بے تکلف انداز بیان کی وجہ سے یہ نجی کے خطوط بھی ادب پارہ بن گئے ہیں۔" (۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"شبلی کے خطوط علمی و ادبی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں، انھوں نے ہندوستان کے تمام مشہور کتب خانوں کو کھنگال ڈالا تھا، جب اس سے بھی پیاس نہ بجھی تو ترکی کا سفر کیا اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا، ان کے خطوط میں نایاب و نادر کتابوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، اکثر کے متعلق انھوں نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اس کی اہمیت اور افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس لحاظ سے ان کے خطوط بڑے اہم ہیں، ان کے مطالعہ سے شائقین علم و ادب کے ذوق کی محض تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ نئی نئی معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔" (۲)

مولانا شبلی کے مکاتیب پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا، لیکن جو بھی ہوا ان کی اہمیت

---

(۱) دارالمصنّفین کی ادبی خدمات کا تعارف (۱۹۸۰ء تک) ڈاکٹر شباب الدین، اشاعت ۲۰۰۸ئ، مطبع اصیلہ آفیسٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ص ۵۲

(۲)دارالمصنّفین کی ادبی خدمات کا تعارف (۱۹۸۰ء تک) ڈاکٹر شباب الدین، اشاعت ۲۰۰۸ئ، مطبع اصیلہ آفیسٹ پرنٹرز، نئی دہلی، ص ۵۱

ومعنویت اور جامعیت سے انکار مشکل ہے۔شبلی علم و تحقیق اور ادب وشعر کے میدان میں جس معیار کے قائل تھے، وہ ان کے خطوط کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے، ان کے مکاتیب کے موضوعات میں بڑی رنگارنگی ہے، دلفریبی دلکشی ولطافت پائی جاتی ہے، ادبی، قومی، علمی، سیاسی مباحث ہیں، ان کی افادیت وخصوصیت سے پردہ اٹھاتے ہوئے رفیق دارالمصنّفین کلیم صفات اصلاحی تحریر کرتے ہیں:

> ”مکاتیب میں ان موضوعات و مباحث کے وجود سے یہ بات یقینا پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ مکاتیب شبلی واقعی قومی اعمال نامہ ہیں جن سے عہد شبلی کے ہندوستان کی علمی، تعلیمی، ادبی، ملی، قومی، سیاسی، دینی اور تحریکی سرگرمیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔روشن مستقبل اور نئے ہندوستان کی تعمیرو ترقی کے دوران یہ خطوط مشعل راہ کے طور پر پیش نظر رکھے جاسکتے ہیں:
>
> ان خطوط میں ولیم میور، ولہائو سن، نیکلسن، مارگولیتھ جیسے نامور مستشرقین کے افکار کا ناقدانہ جائزہ اور کرشن پرساد، کمار سوامی، گریس، سندر لال، سرتیج بہادر سپرواور راجندرپرساد وغیرہ جیسے ممتاز ہندو دانشوروں کا تذکرہ ہے۔اس سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ باہمی اتحاد، قومی یکجہتی، گنگا جمنی تہذیب کی جو روایت ہمارے ملک کے پیش رو بزرگوں نے قائم کی تھیں، مکاتیب شبلی میں ان کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔شبلی کی مکتوب نگاری کا یہ ایک اہم وصف ہے جو ہمیں مکاتیب شبلی کے مطالعہ کی جانب خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔(۱)

علامہ شبلی کے مکاتیب سے اتنے سرچشمے پھوٹے ہیں جن سے ان کے افکار و خیالات کی تازگی، فرزانگی اور آگاہی حاصل ہوتی ہے ، شبلی نے بہت سے طلسم کو توڑا اور ایک نئ دنیا آباد کرنے کی کوشش کی، جس میں یہ کامیاب بھی رہے، اسی لیے ان کے خطوط کو ”قومی

---

(۱)حروف بازگست، کلیم صفات اصلاحی رفیق دارالمصنّفین، ناشر مصنف، مطبع اصلاحی ہیلتھ کیئر فائونڈیشن نئ دہلی، سن اشاعت، ۲۰۲۰ئ، ص ۱۴۲

اعمالنامہ" سے تعبیر کیا گیا، زعفران کے پھول سے تشبیہ دی گئی اورانھیں قومی روزنامچہ بھی کہا گیا، لیکن ان تمام ناقدین کی توجہ اعظم گڑھ کی سوندھی مٹی جس کی خوشبو ان کے مکاتیب میں بسی ہے اور جس سے اعظم گڑھ کا خاکہ تیار کیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ ان کے مکاتیب میں خاندان کے حالات اور بہت سی راز کی باتیں بھی موجود ہیں جن کی مدد سے الگ شبلی کو تلاش کیا جاسکتا تھا۔ جو نہیں کیا گیا۔ بقول اخلاق احمد:

"شبلی کے خطوط کے اندر ذاتی گھریلو زندگی کا عکس، چہل پہل، کتابوں کی لکھائی چھپائی، درستی اور تکمیل ہونے کی بے کلی، عرب اور عجم کی داستان سیاسی مسائل کی دھمک، دارالمصنّفین قائم کرنے کی بے چینی، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی سے ادبی اور مذہبی مسائل پر تبالۂ خیال، ندوۃ العلماء کی اتھل پتھل اور عطیہ کے نام خطوط کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔" (۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"شبلی کے خطوط میں ان کی گھریلو زندگی کا پس منظر ان کی ذاتی زندگی پر سایہ فگن ہے۔" (۲)

اردو کے مکتوب نگاروں کا دائرہ اگرچہ بہت وسیع ہے مگر مولانا شبلی کانام ان میں بعض خصوصیات کے سبب سرفہرست ہیں، ان کے مکاتیب کی سادگی، اپنائیت، جذبات اور خیالات کا بے دریغ اظہار اور مراسلے کو مکالمہ بنانے کی خصوصیت قارئین کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ علامہ شبلی کے مکاتیب کے اوصاف بیان کرتے ہوئے پروفیسر ریاض الرحمن خاں شیروانی تحریر کرتے ہیں:

"علامہ کے خطوط حسن انشا کا بھی شاہکار ہیں اور ہماری رائے میں اردو کے بہترین خطوط کی اگر کوئی مختصر سے مختصر فہرست تیار کی جائے تو اس میں ان خطوط کو ضرور شامل کرنا ہوگا، ان میں اپنائیت بھی ہے،

---

(۱) نقوش تابندہ، اخلاق احمد، مطبع انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، سن اشاعت، ۲۰۰۴، ص ۲۹

(۲) نقوش تابندہ، اخلاق احمد، مطبع انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڑھ، سن اشاعت، ۲۰۰۴، ص ۲۹

سادگی بھی ہے، جذبات کا بے دریغ اظہار بھی ہے اور مراسلے کو مکالمہ بنا دینے کی صلاحیت بھی، یہ خصوصیات ان خطوط میں جابجا بکھری ہوئی ہیں اور ان کا مجموعی تاثر اعلا درجے کی خطوط نویسی کا ہوتا ہے، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے"۔(۱)

مولانا شبلی کے خطوط یقیناً ہمارے دل و دماغ کو معطر کر دیتے ہیں، اور ان کا مطالعہ کرتے وقت ہم اس آباد خرابے سے نکل کر بہشت کی سیر و تفریح کرنے لگتے ہیں اور جب اس وادی سے لوٹتے ہیں تو ایک عجب قسم کا سرور ہوتا ہے جس میں ہم بہے چلے جاتے ہیں شبلی کے مکاتیب طوطا مینا کی دنیا نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے جس سے شبلی ہم کو روبرو کراتے ہیں، ان کی اہمیت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"ان سب میں شبلی کے مکاتیب اپنی تازگی، طرفگی، ندرت، ایجاز اور اپنے ادیبانہ اور لطیف انداز کے باعث مستقل قدرو قیمت کے مالک ہیں ان میں مقصد کا وجود اور پیغام کا اختصار تو ہے مگر مخاطبوں کے رتبے اور مقام کا لحاظ، ان کے جذبات و نفسیات کا پورا پورا شعور بھی موجود ہے۔ سرسید کا دور اپنے بے تکلف انداز بیان کے لیے امتیاز رکھتا ہے۔ طرز بیان میں خاص لطیف روح اگر کہیں جلوہ گر ہے تو شبلی کے خطوط و مکاتیب میں، ان کے خطوط میں ذوق و شوق اور دل و دماغ کو سیر اب و شاداب رکھنے کی پوری پوری صلاحیت موجودہے، کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر خط گویا زعفران کا پھول ہے۔ جس میں باغ بہشت کی خوش بو ہے، اس پر طرہ یہ کہ ان کے خط بالکل مختصر ہوتے ہیں، ایجازیوں بھی شبلی کی تحریر کا خاصہ ہے مگرجو ایجاز ان کے خطوط میں ہے اس کو جان اعجاز ہی کہا جاسکتا ہے، ان کی مکتوب نگاری فرصت اور وقت گذاری کا مشغلہ نہیں، ان کا ہر خط کسی جمیل باجزیل مقصد

---

(۱)علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت خطوط کی روشنی میں، پروفیسر ریاض الرحمن شروانی، معارف، دسمبر ۲۰۰۶ئ، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ص ۴۱۷

سے وابستہ ہے۔" (۱)

ایک دوسری جگہ شبلی کی مکتوب نگاری کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی اہمیت جانتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں، لہٰذا زندگی کا ایک لمحہ بھی ان کے نزدیک رائیگاں نہیں، اس نقطۂ نظر سے ان کے خط کا شاید ایک لفظ بھی بے کار اور بے ضرورت نہیں، جچا تلا، ضروری ضروری، مگر اس میں عجیب طرح کی تاثیر ہوتی ہے اور ان کے چھوٹے سے خط میں بھی ایسی تسکین ملتی ہے گویا کسی نے کوئی دلچسپ داستان ورق در ورق پڑھ ڈالی۔ ایک ہی چبھتے ہوئے فقرے سے، ایک ہی مصرعے سے، ایک ہی استعارے یا ترکیب سے، ایک ہی طنزیہ چھیڑ سے ان کا خط لذتوں سے معمور ہوجاتا ہے۔" (۲)

مرزا غالب کو تاریخ ادب اردو میں خطوط نگاری کا سب سے بڑا فن کار اور منفرد طرز کا موجدمانا جاتا ہے ، ان کی اس اختراع سے اردو نثر کو بقائے دوام ملا اور سادگی، روانی، سلاست اور برجستگی کے جوہر اردو نثر میں پیدا ہوئے، صحیح یہ ہے کہ خطوط نگاری میں غالب کا کوئی مد مقابل نہیں۔ان کے بعد علامہ شبلی نے اس فن کو آگے بڑھایا اور مکاتیب کے وافر ذخیرے چھوڑے ، اسی تعلق سے ڈاکٹر الیاس الاعظمی لکھتے ہیں:

"در اصل غالب اور شبلی دونوں اپنے عہد کے اردو کے بڑے مکتوب نگار ہیں اور دونوں نے مکتوباتی ادب کا بڑا قیمتی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، عودہندی اور اردوئے معلی اگر غالب کی یادگار ہیں تو مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی، شبلی کی یادگار ہیں، زبان کے لحاظ سے، ادبی لطافت کے اعتبار سے، اپنے عہد کی مصوری کے لحاظ سے، علمی، تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے مکاتیب کا یہ سرمایہ اردو کا بڑا قیمتی ذخیرہ ہے، غالب کے خطوط سے

(۱)میرا حسن عبدالحق تک، ڈاکٹر سید عبداللہ، ناشر، چمن بکڈ پو اردو بازار، دہلی، ص ۳۷۷
(۲) میرا من عبدالحق تک، ڈاکٹر سید عبداللہ، ناشر، چمن بکڈ پو اردو بازار، دہلی، ص ۳۷۸)

شبلی کے خطوط تک، نثری ادب نے ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں، ان کی آواز بازگشت بھی شبلی کے خطوط میں سنائی دیتی ہے۔ دراصل شبلی کے خطوط غالب کی مکتوب نگاری کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔" (۱)

ڈاکٹر صاحب کے خیالات اپنی جگہ لیکن مولانا شبلی کے خطوط کے الگ رنگ اور ان کی انفرادیت کے شواہد بھی کچھ کم نہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ شبلی کا دل قوم و ملت، علم و ادب، دین و مذہب، تعلیم و تربیت، فکر و فن، تحقیق و تنقیدی، تصنیف و تالیف، سیاست و معیشت، اصلاح و دعوت کے مسائل کے حل کے لیے جس طرح دھڑکتا تھا، غالب اس سے محروم تھے، بقول اقبال سہیل:

"علامہ مرحوم کے جتنے خطوط ہیں ان کے پڑھنے سے یہ محسوس ہوگا کہ مولانا کی زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا ہے جس میں ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا خیال یا اس کی کوئی اسکیم مولانا کے پیش نظر نہ رہی ہو یا کسی علمی مسئلہ کا حل یا حریفوں کی غلط تغیرات کا ردپیش نظر نہ رہا ہو۔" (۲)

ایک دوسری جگہ اقبال سہیل غالب کے خطوط اور مولانا شبلی کے خطوط میں فرق ظاہر کرتے ہوئے مولانا شبلی کے خطوط کی افادیت اور اہمیت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"استاذ الامام علامہ شبلی نعمانی کے مکاتیب، غالب کے خطوط کی طرح محض تفریح طبع یا مکالمہ کی غرض سے نہ تو لکھے گئے ہیں اور نہ اس حیثیت سے ان پر نگاہ ڈالی جاسکتی ہے، ان کے خطوط زیادہ سے زیادہ محض ان کی بایوگرافی یا سوانح حیات کا سامان ضرور فراہم کرتے ہیں اور جو نظریات، علمی مباحث یا علمی مسائل میں ان کے نصب العین تھے، ان کے خطوط سے کافی طور پر واضح ہوجاتے ہیں اور مختلف ادوار میں ان کی رائیں قومی اور ملی مسائل میں کیا تھیں وہ بھی انھی خطوط سے

---

(۱) آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اکیڈمی، اعظم گڑھ، سن اشاعت، جنوری ۲۰۱۳ئ، ص ۵۸۸

(۲) شبلی شناسی کے اولین نقوش، مرتبہ ظفر صدیقی، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، سن اشاعت، جنوری ۵۹۰

کافی طور پر پیش نظر ہو جاتی ہیں، مولانا بھی علمائے ہند کی طرح پہلے خط و کتابت فارسی زبان میں کیا کرتے تھے، دوچار خطوط عربی میں بھی ہیں مگر بعد کو صرف اردو زبان کو یہ شرف حاصل رہا۔" (۱)

مذکورہ بالا تحقیقات اور ناقدین کے آرا سے مکتوباتی ادب میں علامہ شبلی کے مقام ومرتبہ کا اندازہ یقینا ہو گیا ہو گا۔ ان کے بیشتر مکاتیب کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں، ان کو پیش نظر رکھ کر علامہ شبلی کی الگ علمی وادبی شخصیت اور ان خطوط میں پوشیدہ شبلی کی منفرد عظمت کو تلاش کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ اس سے ایک طرف تو شبلی کے خطوط کی اہمیت ومعنویت اجاگر ہوگی اور دوسری جانب نئی نسل ایک الگ شبلی سے متعارف ہوگی۔

مولانا شبلی مرحوم کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مکتوبات کو جاننے کے لئے ان کے وہ خطوط جو "مکاتیب شبلی، حصہ اول، دوم" میں شامل ہیں ان کے مکتوب الیہ کے نام جو انھوں نے خطوط تحریر کیے ہیں ان کی تعداد اور مکاتیب شبلی اول، دوم کی اشاعت کا کام کب سے شروع ہوا، ان تمام سوالوں کا جواب الیاس الاعظمی کے حوالے سے نقل کیا جارہا ہے:

"علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ئ، ۱۹۱۴ء) کے مکاتیب کی ترتیب و تدوین کا کام ان کے شاگرد رشید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ - ۱۹۵۳ء) کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ یہ کام انھوں نے علامہ شبلی کی زندگی میں شروع کیا تھا مگر پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ علامہ شبلی کی وفافت (۱۸نومبر ۱۹۱۴ء) کے بعد جب دارالمصنّفین میں معارف پریس قائم ہوا اور کتابوں کی اشاعت کا آغاز ہوا تو مولانا سید سلیمان ندوی نے سب سے پہلے مکاتیب شبلی کو دو جلدوں میں شائع کیا۔ پہلی جلد ۱۹۱۶ء میں اور دوسری جلد ۱۹۱۷ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے طبع ہوئی۔" (۲)

ڈاکٹر شمس بدایونی نے بھی پہلی طبع کے متعلق اسی تاریخ کی نشاندہی کی وہ رقم طراز ہیں:

---

(۱)شبلی شناسی کے اولین نقوش، مرتبہ ظفر صدیقی، دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، سن اشاعت، جنوری ۲۰۱۶ء، ص ۵۸۹

(۲)مکتوبات شبلی، از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ناشر، مرتب، مطبع، اصیلہ پریس نئی دہلی۔ ص۸

”جلد اول ۱۹۱۶ء میں اور جلد دوم ۱۹۱۷ء میں پہلی بار دارالمصنّفین اعظمگڑھ سے شائع ہوئی، بعد میں ان کے متعدد ایڈیشن نکلے، جلد دوم میں سید صاحب نے مکاتیب شبلی کے عنوان سے مقدمہ تحریر فرمایا۔ جس میں خطوط کی اہمیت، خطوط شبلی کی جمع آوری، ان کی خصوصیات اور تالیف کے طریقہ کا پر گفتگو کی ہے، بعد کے ایڈیشنوں میں یہ مقدمہ جلد اول میں شامل کردیا گیا۔“ (۱)

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم کو جمع کرنے کا کام ان کی زندگی ہی میں شروع کردیا گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں ان مکاتیب کو جو ادھر اُدھر بکھرے تھے اور ان تمام دوستوں سے جن کے پاس علامہ شبلی نعمانی کے خطوط تھے ، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان سے منگوا کر محفوظ کرنا چاہا اور اس کام کے لیے (اکتوبر ۱۹۰۹ء) الندوہ میں ایک اشتہار بھی دیا اس اشتہار کو دیکھ کر مولانا شبلی کے معاصرین، احباب اور شاگردوں نے علامہ شبلی نعمانی کے خطوط سید صاحب کو ارسال کرنے شروع کیے۔ بقول ڈاکٹر شمس بدایونی:

”مکاتیب شبلی کی جمع و ترتیب کا کام مولانا شبلی کی زندگی ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا سید سلیمان ندوی کو انھیں محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا، انھوں نے الندوہ لکھنؤ (اکتوبر ۱۹۰۹ء) میں ایک اشتہار شائع کیا۔ اشتہار دیکھ کر مولانا شبلی کے احباب، معاصرین اور تلامذہ نے شبلی کے خطوط، سید صاحب کو بھیجنا شروع کردیے، بہ قول سید صاحب ان کے پاس ہزاروں خطوط جمع ہوگئے، (مقدمہ مکاتیب شبلی، ص ۳) لیکن اس اشتہار کی اشاعت پر مولانا شبلی نے یک گونہ برہمی کا اظہار کیا۔ بعد میں احباب و معاصرین اور تلامذہ کی خواہش پر وہ ان کی ترتیب و اشاعت پر راضی ہوگئے، اس سلسلے کے تین حوالے مولانا شبلی کے خطوط ہی میں ملتے ہیں“۔

---

(۱) مکتوباتی ادب۔ ڈاکٹر شمس بدایونی، ناشر: ڈاکٹر شمس بدایونی، سال اشاعت ۲۰۱۰ء ص۵۳

(۱) ”جو خط کسی قدر خاص ہوں ان کو سید سلیمان کے پاس نہ بھیجو، فرصت کے وقت میں خود دیکھ کر فیصلہ کرلوں گا۔

(۲) ”سید سلیمان میرے خط جمع کر رہے ہیں کیا آپ کے پاس میرے کچھ ہفوات غلطی سے محفوظ ہوگئے۔

(۳) ”مولوی شیروانی صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ انھوں نے میرے تمام خطوط محفوظ رکھے ہیں۔“ (۱)

مولانا شبلی نعمانی کے خطوط کی ترتیب و تدوین کا کام ان کی زندگی ہی میں مولانا سید سلیمان ندوی نے شروع کیا تھا، لیکن یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کے خطوط کو دو حصوں میں مکاتیب شبلی کے نام سے شائع کیا۔

مکاتیب شبلی حصہ اول

اس میں علامہ شبلی نعمانی کے وہ خطوط شامل ہیں جو علامہ شبلی نعمانی نے اپنے معاصرین اور بزرگوں کے نام لکھے تھے، اس کی تفصیلی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

دیباچہ طبع جدید: اشتیاق احمد ظلی (ڈائریکٹر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ)

دیباچہ طبع ثانی: سید سلیمان ندوی ۱۸ دسمبر ۱۹۲۸ء

دیباچہ مکاتیب شبلی: سید سلیمان ندوی ۷/اکتوبر ۱۹۱۷ء

(۱)	سرسید احمد خان	۳- خط
(۲)	نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان	۲-خط
(۳)	شیخ حبیب اللہ صاحب	۴- خط
(۴)	شیخ حبیب اللہ صاحب	۳- خط

(۱) مکتوباتی ادب۔ڈاکٹر شمس بدایونی، ناشر: ڈاکٹر شمس بدایونی، سال اشاعت ۲۰۱۰ء ص ۵۲،۵۱

(۵) ماموں (مولانا محمد سلیم صاحب وکیل) ۳-خط

(۶) مسٹر محمد اسحاق صاحب بی اے، ایل ایل بی ۲۶- خط

(۷) مولوی حکیم محمد عمر صاحب ۳-خط

(۸) مولوی محمد سمیع صاحب ۵۷- خط

(۹) مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی ۱۱۸- خط

(۱۰) پروفیسر عبدالقادر صاحب ۳۰- خط

(۱۱) منشی محمد امین صاحب ۳۱-خط

(۱۲) مولانا ابوالکلام صاحب آزاد ۴۰- خط

(۱۳) مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی ۲۱- خط

(۱۴) ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی ۷- خط

(۱۵) مولانا سید عبدالحی صاحب ناظم ندوہ ۴-خط

(۱۶) مولانا سید نواب علی صاحب پروفیسر بڑودہ کالج ۵-خط

(۱۷) مولانا محمد علی صاحب ناظم ندوہ ۲-خط

(۱۸) مولانا عبدالقیوم صاحب حیدر آبادی ۳- خط

(۱۹) شیخ رشید الدین صاحب انصاری فراہی ۳-خط

(۲۰) حکیم غلام غوث صاحب بھاول پوری ۴-خط

(۲۱) چودھری سید نظیر الحسن صاحب رضوی ۲-خط

(۲۲) طلبائے دارالعلوم ندوہ ۱-خط

(۲۳) مولانا مفتی عبداللہ صاحب مہتمم ۱-خط

(۲۴) منشی سید افتخار عالم صاحب مارہروی ۲-خط

(۲۵) سید محمد محسن خاں بلگرامی ۲-خط

(۲۶) احمد مرتضیٰ صاحب نذر سر رشتہ دار ریاست ٹونک ۲-خط

(۲۷) منشی شرف الدین صاحب رامپوری ۱-خط

(۲۸) مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی ۱-خط

(۲۹) مولوی عبدالغنی صاحب بہاری ۱-خط

(۳۰) مولانا خلیل الرحمن صاحب سہارنپوری ۱-خط

(۳۱) ایڈیٹر صاحب جرائد اسلامیہ ۱-خط

(۳۲) مولوی عبداللہ بلوچی بی اے علیگ ۱-خط

(۳۳) مہتمم صاحب دارالاخبار انجمن اسلامیہ، مظفر نگر ۱-خط

(۳۴) ایڈیٹر صاحب الناظر لکھنؤ ۱-خط

(۳۵) مسٹر شاکر صاحب ایڈیٹر رسالہ ادیب الہ آباد ۱-خط

(۳۶) مولوی ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر روزنامۂ زمین دار، لاہور ۱-خط

(۳۷) جرائد اسلامیہ ۱-خط

(۳۸) فاطمہ خانم (صاحبزادی مولانا مرحوم) ۳-خط

(۳۹) حامد حسن صاحب نعمانی ۱-خط

(۴۰) مولوی حسین عطاء اللہ صاحب حیدرآبادی ۲-خط

(۴۱) مولوی حامد حسن صاحب قادری ۳-خط

(۴۲) نواب وقار الملک صاحب ۱-خط

(۴۳) ماسٹر محمد شفیع صاحب ۱-خط

(میزان) = ۴۰۱)

جلد اول پہلی بار ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی، اس وقت سے لے کر اب تک شائع ہوتی چلی آ رہی ہے، اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں:

(۱) ۱۹۱۶ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع اول، ص۲۶۰

(۲)۱۹۲۸ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع دوم، ص۳۴۹

(۳) ۱۹۵۶ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع سوم، ص۳۴۹

(۴) ۱۹۶۶ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع چہارم، ص۳۵۰

(۵) ۲۰۱۰ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع جدید، ص۳۶۷

مکاتیب شبلی حصہ دوم

اس میں مولانا شبلی نعمانی کے وہ خطوط ہیں جو علامہ شبلی نعمانی نے اپنے احباب اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۴۴) مولانا حمید الدین صاحب بی اے ۷۶-خط

(۴۵) مولانا سید سلیمان ندوی ۸۲-خط

(۴۶) مولوی مسعود علی ندوی ۳۳-خط

(۴۷) مولوی ضیاء الحسن صاحب ایم اے، ندوی ۱۰-خط

(۴۸) مولوی عبدالسلام ندوی ۸-خط

(۴۹) مولوی عبدالباری ندوی ۸-خط

(۵۰) مولوی حاجی معین الدین ندوی ۲-خط

(۵۱) مولوی سید ابوظفر ندوی ۹-خط

(۵۲) صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں ۱۴-خط۔ضمیمہ مکاتیب، جلد اول۔

(۵۳) مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس رسولپور، ضلع مظفر پور ۲۳- خط

(۵۴) ایم مہدی حسن صاحب ۷۹-خط

(۵۵) ایڈیٹر رسالہ زمانہ کانپور ۱-خط

فارسی کے خطوط

(۵۶) شیخ حبیب اللہ صاحب (مولانا کے والد) ۲-خط

(۵۷) اپنے چچا کے نام ۱-خط

(۵۸) مسٹر مہدی حسن صاحب (مولانا کے منجھلے بھائی) ۳-خط

(۵۹) مولوی حکیم محمد عمر صاحب ۳-خط

(۶۰) مولانا حمید الدین صاحب ۲-خط

(۶۱) مولوی محمد عمر صاحب ۸-خط

(۶۲) مولوی محمد سمیع صاحب ۱۱- خط

(۶۳) جناب اکبر صاحب ۱-خط

(۶۴) جناب فرحت احمد صاحب ۱-خط

(۶۵) ہنر ہائنس آغا خان ۱-خط

عربی خطوط

(۶۶) نامعلوم الاسم ۱-خط

(۶۷) صفی الملک حسام الملک نواب سید علی حسن خاں ۱-خط

(۶۸) مولوی سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلمائ، لکھنؤ ۱-خط

(میزان = ۳۸۱)

دارالمصنّفین سے اب تک 'مکاتیب شبلی حصہ دوم' کے مندرجہ ذیل ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں:

(۱) ۱۹۱۷ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع اول، ص ۲۹۴

(۲) ۱۹۲۷ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع دوم، ص ۲۶۱

(۳) ۱۹۳۲ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع سوم، ص ۲۷۷

(۴) ۱۹۷۱ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع چہارم، ص ۲۶۲

(۵) ۲۰۱۲ء- دارالمصنّفین، اعظم گڑھ طبع جدید، ص ۲۲۷

مکاتیب شبلی حصہ اول اور جلد دوم میں اردو، فارسی اور عربی خطوط کی کل تعداد ۷۸۲ ہے اور دونوں حصوں میں اردو، فارسی، عربی کے مکتوب الیہ کی کل تعداد ۶۸ ہے۔جن میں سے اردو کے کل خطوط کی تعداد ۷۴۶ ہے اور اس کے مکتوب الیہ کی کل تعداد ۵۵ ہے۔فارسی کے خطوط کی کل تعداد ۳۳ ہے اور اس کے مکتوب الیہ کی کل تعداد ۱۰ ہے اورعربی کے کل خطوط کی تعداد ۳ ہے اور اس کے مکتوب الیہ کی کل تعداد ۳ ہے، جن میں ایک نامعلوم شخص کا بھی نام شامل ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر الیاس الاعظمی اور ڈاکٹر شمس بدایونی نے مکاتیب شبلی حصہ اول اور دوم میں شائع کل خطوط کی تعداد ۷۸۴ بتائی ہے لیکن خطوط شماری میں دونوں سے غلطی ہوئی ہے کیونکہ مکاتیب شبلی حصہ اول میں نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خان مرحوم کے نام صرف دو خط ہی شامل ہیں لیکن عدد ۲کے بجائے ۳لکھ گیا ہے۔اسی طرح ’مکاتیب شبلی حصہ دوم‘ میں مولانا حمید الدین فراہیؒ کے نام بھی کل ۷۷ خط درج ہیں لیکن میرے مطابق وہ کل ۷۶ خط ہیں ،اس لیے کہ۱۴کے بجائے ۱۵ لکھ گیا ہے۔اس لیے میرے لحاظ سے خطوط کی کل تعداد ۷۸۴ کے بجائے ۷۸۲ ہے۔

یہاں ایک بات واضح کردی جائے کہ وہ خطوط جو مکاتیب شبلی کی دونوں جلدوں میں شامل ہیں ان کی کل تعداد ۷۸۲ ہے، ان کے علاوہ دوسرے مجموعوں اور رسالوں میں شائع شدہ مکاتیب شبلی کی تفصیل ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی نشاندہی کے مطابق اس طرح ہے۔یہ تفصیل انھوں نے آثار شبلی میں فراہم کی ہے۔

(۱) خطو شبلی ۱۰۰- خط

(۲) خطوط مشاہیر ۲۱-خط

(۳) باقیات شبلی ۷۶-خط

(۴) خطوط شبلی بنام آزاد ۱۸-خط

(۵) مکتوبات مشاہیر ۱۵-خط

(۶) خطوط شبلی بنام مزمل اللہ خان ۴-خط

(۷) خط بنام نظام حیدر آباد ۱-خط

(۸) مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے نام ۸-خط

(۹) مکتوب شبلی بنام شاکر میرٹھی ۱-خط

(۱۰) حکیم اجمل کے نام ۱-خط (معارف ج ۵۰، ش ۶)

(۱۱) حافظ احمد علی خاں شوق کے نام ۱-خط

(۱۲) غیر مطبوعہ خطوط نقدش مکاتیب نمبر ۱۴-خط

(۱۳) سرسید کے نام مشاہیر کے خطوط ۷-خط

(۱۴) نام شبلی بنام مولانا شاہ محمد علی ۱-خط

(۱۵) خطوط شبلی بنام وقار الملک ۱۳/خط (نقوش خطوط نمبر)

(۱۶) نام شبلی بنام مولوی بشیر الدین صاحب ۲-خط (معارف دسمبر ۱۹۱۹ء)

(۱۷) نام سرسید و شبلی ۲-خط (معارف اگست ۱۹۱۹ء)

(۱۸) مکاتیب شبلی بنام مرزا سلیم وکیل ۶-خط (ایضا جنوری ۱۹۵۶ء)

(۱۹) علامہ شبلی کے غیر مطبوعہ مکاتیب ۴-خط (ایضاً مئی، ۱۹۳۰ء)

(۲۰) غیر مطبوعہ خطوط ۱-خط (ادیب شبلی نمبر ۱۹۶۰ء)

(۲۱) مکتوب بنام نواب وقار الملک ۱-خط (خطوط وقار الملک)

(۲۲) بنام ملا عبدالقیوم ۱-خط (مجلہ نظامیہ حیدرآباد ۱۹۴۰ء)

(۲۳) بنام مولوی مسیح الزماں ۲-خط (حیات مسیح، مظفر حسین ۱۹۱۱ء، لکھنؤ)

(۲۴) بنام منشی امیر احمد ۱-خط (خطوط منشی امیر احمد، ۱۹۱۰ء)

(۲۵) بنام خواجہ حسن نظامی ۱۸- خط (اتالیق خطوط نویسی، دہلی ۱۹۱۱ء)

(۲۶) نامعلوم ۳-خط (محفوظ سرسید اکیڈمی، علی گڑھ)

(۲۷) بنام احسن اللہ ثاقب ۶-خط (گوہرین نامہ، اعظم گڑھ، ۱۳۴۱ھ)

(۲۸) بنام سرسید احمد خاں ۲-خط (اردو ادب، ش۱، ۱۹۷۰ء)

(۲۹) بنام قاضی محمد خلیل ۱-خط (مکتوبات مشاہیر)

(میزان= ۳۳۱ خطوط (۱)

مندرجہ بالا خطوط مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی بشیر الدین، وغیرہ اصحاب فضل و کمال کے نام ہیں۔ان خطوط سے علامہ شبلی نعمانی کی حیات زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے، جوہر پہلو سے بڑا اہم ہے۔ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے ان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> ”یہ ۳۳۱ وہ خطوط ہیں جو ایک نظر میں سامنے آگئے ہیں، اگر تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو مزیدخطوط دریافت ہوسکتے ہیں، اس میں چند خطوط بے حد اہمیت کے حامل ہیں، مثلاً مولانا حبیب الرحمن خان شروانی کے نام کے وہ خطوط جو انھوں نے مکاتیب شبلی کی اشاعت کے وقت احتیاطاً روک لیے تھے اور جنھیں بعد میں ان کے پوتے محترم پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، (ستمبر ۱۹۷۱ء) میں شائع کرادیے۔

آگے لکھتے ہیں:

> ”مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی بشیر الدین اٹاوہ اور مفتی شیر علی کے نام کے خطوط سے علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کی کاوشوں کے کئی اہم پہلو واضح ہوکر سامنے آتے ہیں، بہرحال یہ خطوط اس قدر اہم ہیں کہ ان کو نظر انداز کرکے شبلی کی پوری

(۱) آثار شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ناشر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی ،اعظم گڑھ۔طبع اول جنوری ۲۰۱۳ء ، ص۶۴۴،۶۴۵

شخصیت اور ان کے بعض علمی و تعلیمی کاموں کی اہمیت اجاگر نہیں ہوسکتی۔" (۱)

ڈاکٹر الیاس الاعظمی صاحب نے ان شائع شدہ خطوط کے علاوہ اور بھی خطوط دستیاب کرکے ایک کتابی شکل میں "مکتوبات شبلی" کے نام سے شائع کردیا ہے، آئندہ سطور میں ان کا جائزہ پیش ہے۔

ڈاکٹر صاحب مکتوبات شبلی کے آغاز میں تحریر کرتے ہیں:

"علامہ شبلی" کے ان خطوط کا مجموعہ جو مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی میں شامل نہیں۔" (۲)

مکتوبات شبلی

(۱)	سرسید احمد خاںؒ	۱۳-خط
(۲)	نواب محسن الملک	۱-خط
(۳)	مولانا مسیح الزماں خاں	۱-خط
(۴)	نواب وقار الملک	۲- خط
(۵)	عزیز صفی پوری	۱-خط
(۶)	مولانا محمد علی مونگیری	۲-خط
(۷)	مولوی عبدالقادر	۱-خط
(۸)	ملا عبدالقیوم حیدرآباد	۱-خط
(۹)	مفتی شیر علی حیدرآبادی	۱۴-خط
(۱۰)	مولوی بشیر الدین، اٹاوہ	۸-خط
(۱۱)	مولوی سید ممتاز علی	۱۰-خط

---

(۱) آثار شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ناشر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی ،اعظم گڑھ۔طبع اول جنوری ۲۰۱۳ء ، ص۶۴۵
(۲)مکتوبات شبلی۔از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی،مرتب وناشر اصیلہ پریس۔نئ دہلی ،طبع اول دسمبر ۱۲۱۲

(۱۲)	مولانا حمید الدین فراہیؒ	۳-خط
(۱۳)	مولاناسید ولی الحق	۱۳-خط
(۱۴)	مولوی احسن اللہ خاں ثاقب	۶-خط
(۱۵)	احمد علی شوق رامپوری	۱-خط
(۱۶)	نواب سرمزمل اللہ خاں	۵-خط
(۱۷)	حکیم اجمل خاں	۱-خط
(۱۸)	مولوی قیام الدین نجیب جونپوری	۳-خط
(۱۹)	میر محبوب علی خاں، نظام حیدرآباد	۱-خط
(۲۰)	مولاناحبیب الرحمن خاں شروانی	۲۴-خط
(۲۱)	نواب سید علی حسن خاں	۵-خط
(۲۲)	مرزا محمد سلیم	۶-خط
(۲۳)	مولانا سید عبدالحییٔ	۱-خط
(۲۴)	سید ہمایوں مرزا	۲-خط
(۲۵)	مولوی عبدالحق	۱-خط
(۲۶)	ابن مرتضی بلگرامی	۱-خط
(۲۷)	مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ	۸-خط
(۲۸)	خواجہ حسن نظامی دہلوی	۲۰-خط
(۲۹)	حامد حسن نعمانی	۲-خط
(۳۰)	ڈاکٹر سید محمود	۳-خط
(۳۱)	شاکر میرٹھی	۱-خط
(۳۲)	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۹-خط

(۳۳) ضیاء الدین احمد برنی ۱-خط

(۳۴) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ۱۸-خط

(۳۵) ڈاکٹر محمد سلیم ۱-خط

(۳۶) قاضی محمد خلیل ۱-خط

(۳۷) طیبہ بیگم بلگرامی ۲-خط

(۳۸) ایڈیٹر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱-خط

(۳۹) میر مجلس دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۳-خط

(۴۰) ایڈیٹر اودھ اخبار ۲-خط

(۴۱) نامعلوم ۱-خط

میزان = ۲۱۰

عکس تحریر علامہ شبلی نعمانی

"مکتوبات شبلی" میں مجموعی طور پر خطوط کی کل تعداد ۲۱۰ ہے اور مکتوب الیہ کی تعداد ۴۱ ہے ، بقول ڈاکٹر الیاس الاعظمی:

> "۱۹۸۸ء میں سید محمد حسنین نے خطوط شبلی بنام آزاد مرتب کیا جسے بہار اردو اکیڈمی پٹنہ نے شائع کیا، اس میں انھوں نے علامہ شبلی کے ۱۷/ خطوط کا اضافہ کیا، غرض علامہ شبلی کے سیکڑوں خطوط کتب و رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ تمام خطوط مکاتیب شبلی کی دونوں جلدوں اور خطوط شبلی میں شامل خطوط کے علاوہ ہیں، زیر نظر کتاب ان ہی کا مجموعہ ہے، اس میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں طرح کے ۲۱۰/ خطوط شامل ہیں۔(۱)

(۱) مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی ص۱۲۔

مکتوبات شبلی کے مکاتیب پر روشنی ڈالتے ہوئے مرتب خود رقم طراز ہیں:

> ”یہ مکاتیب کئی لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔مثلاً اس میں وہ خطوط شامل ہیں جو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے مکاتیب شبلی کی اشاعت کے وقت مصلحتاً روک لیے تھے اور جنھیں بعد میں ان کے پوتے پروفیسر ریاض الرحمن خاں شروانی نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (نومبر ۱۹۷۱ء) میں شائع کرایا۔اس میں ندوۃ سے متعلق بعض ایسے آراء و خیالات ملتے ہیں جو مکاتیب شبلی کے خطوط میں نہیں ملتے، اسی طرح اس میں چند ایسے مکتوب ہیں جو مکاتیب شبلی کے خطوط میں نہیں ملتے، اسی طرح اس میں چند ایسے مکتوب ہیں جو مکاتیب شبلی میں شامل نہیں ہیں۔“ (۱)

مکتوبات شبلی کے بیشتر مکتوب الیہ نمایاں انشا پرداز، ادیب اور شاعر بھی ہیں اس کے علاوہ سیاست داں، علم و ادب کے شیدائی،فن تحقیق کے رازداں اور فیاض و سخی فقیر اور درویش بھی ہیں، اگر ان مکتوب کو تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو ان میں علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کے وہ پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں جو اُن کی سوانح عمری میں بڑے مددگار ثابت ہوں ان کے علاوہ ندوہ کی تاریخی جدوجہد اور مولانا شبلی نعمانی کی گونہ گوں، ہمہ جہت خدمات کا یک جامع خاکہ ان مکتوبات میں آگیا ہے، ان سے ایسی نئی معلومات سامنے آتی ہیں جن سے ہم قوم و ملت کے تئیں ان کے احساسات کو سمجھ سکتے ہیں، مثلاً علامہ شبلی نعمانی نے ندوہ کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر وہ اقدام کیا جو ہماری دست رس سے باہر ہیں اورانھوں نے کن کن مشکلات کا سامنا کیا، اسی طرح ان کی دوسری بیوی، کم سن بیٹے اور دادا حسن علی کی تاریخ وفات کی تعیین انھی مکتوب سے ہوتی ہے۔

مکتوبات شبلی میں شامل خطوط سے ایک اور واضح بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ان خطوط سے مکاتیب شبلی میں شامل بعض مکتوب الیہ سے خط و کتاب کی تاریخیں بدل گئی

---

(۱) مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی ص۱۳۔

ہیں، مثلاً سرسید احمد خاں کے نام کے مکتوب کی ابتدا علامہ شبلی کے علی گڑھ کے زمانہ قیام ۱۸۹۲ء سے ہوئی جبکہ نو دریافت خطوط واضح کرتے ہیں کہ سرسید سے ان کی خط و کتابت علی گڑھ جانے سے ۴؍سال قبل ۱۸۷۹ میں ہوچکی تھی، اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے مکمل خطوط، جو مکاتیب شبلی میں شامل نہیں تھے، بعد میں ان میں اضافے ہوئے جن سے ان کی بھی نوعیت بدل گئی ہے، مجموعی طورپر مکاتیب شبلی کا یہ مجموعہ سوانح شبلی کے چند نئے گوشوں اور پہلوئوں کو پیش کرتا ہے اور علامہ شبلی کی حیات کے نئے سرے سے مطالعہ و تحقیق کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

"مکتوبات شبلی" کی تدوین وترتیب میں کن باتوں کاخاص طورپر خیال رکھاگیا ہے، اس سلسلہ میں سفیر اختر لکھتے ہیں:

"(۱) ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے مکتوبات ہیں، انھیں تاریخی ترتیب سے یکجا رکھا گیا ہے اور مکتوب اہم کی ترتیب میں ان کے سالِ ولادت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

(۲) ممکن حد تک مکتوب الیہ، اور مکتوبات میں مذکور اشخاص کے تعارف لکھے گئے ہیں، تعارف میں یہ پہلو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ مکتوب نگار علامہ شبلی کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے۔

(۳) ہر مطبوعہ مکتوب جہاں جہاں چھپا ہے، ممکنہ معلومات کی حد تک بقید صفحات مآخذ کی نشان دہی کی گئی ہے، اور غیر مطبوعہ مکتوبات کی صورت میں ان افراد کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے یہ مکتوبات فراہم کیے ہیں۔

(۴) مکتوبات میں علامہ شبلی کے طرزِ املا اور ان کے، استعمال رموز اوقاف کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ غیر مطبوعہ مکتوبات جن کے عکس سامنے تھے، انھیں متعین طرز املا اور رموز اوقاف کے ساتھ نقل کرنے میں کوئی دقت نہ تھی، البتہ مطبوعہ مکتوبات (جن کے اصل متون

سامنے نہ تھے) کے حوالے سے جناب مرتب نے اپنے بقول: "کوشش کی ہے کہ وہی رموز استعمال کیے جائیں (کذا: جو) علامہ شبلی نے اپنے دیگر خطوط میں استعمال کیے ہیں۔"

(۵)"مکتوباتِ شبلی" میں اشخاص، کتب و رسائل اور مقامات کے الگ الگ اشاریے شامل کیے گئے ہیں۔(۱)

مجموعہ "مکتوبات شبلی" میں کتابت کی نادرستیوں کے ساتھ نقل در نقل منتقل ہونے والی بھی بعض نادرستیوں کی طرف روشنی ڈالتے ہوئے سفیر اختر لکھتے ہیں:

"مثال کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک مکتوب میں یہ اطلاع ہے: "حجۃ اللہ شیر ستانی نے ہیئت میں ایک کتاب لکھی ہے"۔

مکتوب کی یہ قرأت (Reading) "خطوط شبلی بنام آزاد (بقلم شبلی)" کے مرتب کی ہے، انھوں نے ہیئت کی کتاب کے مصنف کا نام غلط پڑھا ہے، ان کو فراہم کردہ عکس سے یہ نام ہبۃاللہ شہرستانی پڑھا جاتا ہے۔

"مکتوبات شبلی" کے مرتب نے "خطوط شبلی بنام آزاد (بقلم شبلی)" کی فراہم کردہ قرأت پر انحصار کیا ہے۔(۲)

مجموعہ "مکتوبات شبلی" کے بعض حواشی میں یہ بات درج ہے کہ بعض اشخاص کی تفصیل دریافت نہ ہوسکی، لیکن ان میں بعض اشخاص غیر معروف بھی تھے۔بقول اختر سفیر:

"غیر معروف اشخاص کے بارے میں معلومات کا نہ ملنا چنداں پریشاں کن نہیں، لیکن بعض بہت ہی معروف اشخاص مثلاً مولوی یوسف کلکتوی (ص۱۱۰) شیخ عَلام صادق (ص ۱۱۱)، مولانا عبدالجبار غزنوی (ص۱۱۱)،

---

(۱) جہات الاسلام (ششماہی تحقیقی مجلہ) مدیر اعلیٰ حافظ محمود اختر۔مدیر۔محمد عبداللہ۔شائع کردہ کلیہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔جولائی - دسمبر ۲۰۱۳ء ص ۱۹۹۔

(۲) جہات الاسلام (ششماہی تحقیقی مجلہ) مدیر اعلیٰ حافظ محمود اختر۔مدیر۔محمد عبداللہ۔شائع کردہ کلیہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔جولائی - دسمبر ۲۰۱۳ء ص ۱۹۹۔

مولوی ناصر حسین (ص۲۰۰)، نور الدین قادیانی (ص۲۰۲) اور فارسی شاعری ناصر علی سرہندی (ص۹۲) کے بارے میں معلومات کی عدم دستیابی کی اطلاع کوئی اچھا تاثر قائم نہیں کرتی۔(۱)

ترتیب اور حواشی کے متعلق سفیر اختر آگے لکھتے ہیں:

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب مرتب کے پاس کتاب کی ترتیب اور اس کے حواشی کے لیے مناسب وقت نہیں تھا۔ روا روی کے نتیجے میں سہو ہائے قلم کی تعداد بڑھ گئی ہے۔ نواب سید محسن الملک کو "راجہ مہدی علی خاں محسن الملک" لکھا گیا ہے۔ آرنلڈ کی ایک کتاب کے نام "سواء السبیل الی معرفۃ المعرب والدخیل" میں لفظ "معرب" کو "مغرب" پڑھ لیا گیا ہے۔ رواروی کی ایک مثال یہ ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے انجمن ترقی اردو کے لیے مختلف کتابوں کے اردو تراجم کو جانچنے کے لیے جو پینل (Panel) بنایا تھا اس میں ایک نام مولوی مسعود علی کا تھا۔ جناب مرتب نے "مولوی مسعود علی" سے دارالمصنّفین، اعظم گڑھ کے منتظم مولانا مسعود علی ندوی (م ۱۹۶۷ء) مراد لیے، اور ان پر تقریباً ایک صفحے کا سوانحی حاشیہ لکھ دیا، ان کا ذہن اس جانب نہ جاسکا کہ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہونے والے مسعود علی ندوی، ۱۹۰۴ء میں (جب یہ پینل بنایا گیا تھا) بہ مشکل پندرہ سال کے لڑکے تھے، اور ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ ندوۃ العلماء میں بغرض تعلیم گئے تھے، نیز مولانا مسعود علی ندوی، عالم و فاضل ہوجانے کے بعد بھی لکھنے پڑھنے سے زیادہ انتظام و انصرام کی خوبیوں کے سبب معروف تھے، مولوی مسعود علی جنھیں علامہ شبلی نعمانی نے ترجموں کو جانچنے کے لیے پینل میں شامل کیا تھا،

---

(۱) جہات الاسلام (ششماہی تحقیقی مجلہ) مدیر اعلیٰ حافظ محمود اختر۔ مدیر۔ محمد عبداللہ۔ شائع کردہ کلیہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔ جولائی - دسمبر ۲۰۱۳ء ص ۱۹۹، ۲۰۰۔

وہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن کے معروف مترجم تھے، جنھوں نے دوسری کتابوں کے ساتھ سر عبدالرحیم کی Principles of Mohammedan Jurisprudence کو "اصولِ فقہ اسلام" کے نام سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ان منفرد دوسرے تراجم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی طرف سے شائع ہوئے ہیں"۔

آگے لکھتے ہیں:

"۱۹۱۱ء میں ندوۃ العلماء کے ارکانِ انتظامیہ کا انتخاب ہو رہا تھا، علامہ شبلی نے ایک مراسلے میں پنجاب سے "مسٹر محمد شفیع" کا نام تجویز کیے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ "مکتوبات شبلی" کے فاضل مرتب نے اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے معروف استاد مولوی محمد شفیع (م ۱۹۳۶ء) کو "مسٹر محمد شفیع" کا مصداق سمجھا ہے۔ مولوی محمد شفیع اپنے علم و فضل کے باوجود کبھی عوامی رہنما نہیں رہے۔ "مسٹر محمد شفیع" سے مراد سرمیاں محمد شفیع (م ۱۹۳۲ء) ہیں، جو اپنے وقت کے معروف سیاست داں تھے اور ۱۹۲۰ء کے عشرے میں، جب آل انڈیا مسلم لیگ دو حصوں میں بٹ گئی تھی، تو وہ ایک حصے کے سربراہ تھے، اور یہ حصہ انھیں کے نام سے "شفیع لیگ" کے طور پر معروف ہوا تھا۔"

اس اقتباس کے بعد والے اقتباس میں بھی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سید ہمایوں مرزا (م ۱۹۶۲ء) کے نام ایک مکتوب میں کتاب "مشیر نسواں) کا ذکر ہے اس پر یہ حاشیہ لکھا گیا ہے: "شیر نسواں: یہ رسالہ مولوی سید ممتاز علی کی تصنیف ہے۔" (۱۳) حیرت ہے کہ جس کتاب کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا ہے: "مجھ کو ہرگز توقع نہ تھی کہ ہمارے زمانہ کی مخدرات ایسی قابلانہ، مفید، دلچسپ اور فصیح کتابیں

تصنیف کرسکتی ہیں۔" (۱۴) اسے کسی مخدرہ (پردہ نشین خاتون) کے
بجائے مولوی سید ممتاز علی (م ۱۹۳۵ء) کی کتاب قرار دے دیا جائے: یہ
کتاب غالباً مکتوب الیہ سید ہمایوں مرزا کی اہلیہ صغریٰ ہمایوں بیگم کی
تالیف ہے۔" (۱)

مجموعہ "مکتوبات شبلی" کی ترتیب و تدوین میں کن طریقوں کو بروئے کار لایا گیا ہے ان کی نشاندہی خود مرتب نے کی ہے۔ان کے لیے عموماًدو معروف طریقے رائج ہیں، ایک مکتوب الیہ کے لحاظ سے اور دوسرا تاریخی ترتیب کے لحاظ سے۔کیا مرتب نے اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے؟ اس سوال کا جواب بقول مرتب خود دیکھ لیں۔لکھتے ہیں:

"مکتوبات کی ترتیب و تدوین کے دو معروف طریقے رائج ہیں،
ایک مکتوب الیہ کے لحاظ سے اور دوسرا تاریخی ترتیب سے، یہ اصول کسی
شخصیت کے تمام خطوط کی ترتیب و تدوین میں پیش نظر رکھے جاتے ہیں
اور بلا شبہ یہ اصول اپنی افادیت کے لحاظ سے بڑے اہم ہیں۔مکتوبات
شبلی کی ترتیب و تدوین میں ان دونوں اصولوں کو مکمل طور پر بروئے کار
لانا مشکل تھا کیوں کہ مکاتیب شبلی کی دونوں جلدیں اول الذکر طریقہ
پر مرتب کی گئی ہیں۔ دوسرے طریقہ پر یہ کام ہمارے دوست ڈاکٹر
شمس بدایونی انجام دے رہے ہیں، اس لیے پہلے ہی طریقہ کو مناسب
خیال کیا گیا تاہم اس میں ایک مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط شامل
نہیں ہیں بلکہ اس میں مکاتیب شبلی اور خطوط شبلی کے بعد کے نو دریافت
خطوط شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مکتوبات شبلی محض لئے خطوط کا
مجموعہ ہے۔(۲)

مجموعہ "مکتوبات شبلی" میں وہ خطوط جو ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے یا کسی وجہ سے

---

(۱) جہات الاسلام (ششماہی تحقیقی مجلہ) مدیر اعلیٰ حافظ محمود اختر۔مدیر۔محمد عبداللہ۔شائع کردہ کلیہ علوم اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔جولائی - دسمبر ۲۰۱۳ء ص ۲۰۰،۲۰۱۔

(۲) مکتوبات شبلی۔از ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔مطبع اصیلہ پریس، نئ دہلی، طبع اول دسمبر ۲۰۱۲ء ص۱۴۔

شائع نہ ہوسکے تھے، ان تمام خطوط کو جمع کرکے نئے سرے سے شائع کیا گیا ہے علامہ شبلی نعمانی کے کارنامۂ حیات کی تحقیق و تفحص کے حوالے سے اُن کا شمار یقینا اہم مآخذ میں ہوگا اور جن کا مطالعہ شبلی پر کام کے دوران ناگزیر سمجھا جائے گا۔ڈاکٹر صاحب کا یہ کام بلاشبہہ بڑی اہمیت کا حامل اور شائقین سیرت شبلی کے لئے افادیت کا باعث ہے۔

خطوط شبلی

"خطوط شبلی" ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا شبلی نے عطیہ بیگم اور زہرا بیگم فیضی کے نام لکھتے تھے،انھیں مولوی محمد امین زبیری و منشی سید یوسف قیصر نے مرتب کرکے ۱۹۲۶ء میں شمسی مشین پریس آگرہ سے شائع کیا، اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے، بقول ڈاکٹر شمس بدایونی:

> "خطوط کا یہ مجموعہ محمد امین زبیری و سید یوسف قیصر نے ترتیب دیا تھا جو شمسی پریس آگرہ سے بدون تاریخ طبع ہوا۔اکبر علی خاں عرشی زادہ (ف ۱۹۹۷ء) نے رضا لائبریری رام پور میں مخزونہ نسخے کے سرورق پر اپنے قلم سے اس کا سال اشاعت ۱۹۲۶ء درج کیا ہے اور اس نسخے کو طبع اول قرار دیا ہے۔"(۱)

"خطوط شبلی" کا دوسرا ایڈیشن تنہا محمد امین زبیری کا مرتب کردہ ہے، اسے تاج کمپنی لاہور نے شایع کیا ہے، اس پر بھی سنہ اشاعت درج نہیں ہے، امین زبیری کے دیباچہ پر ۱۲ر مئی ۱۹۳۵ء کی تاریخ لکھی ہے، ظاہر ہے اس کے بعد ہی شائع ہوا ہوگا، بقول ڈاکٹر شمس بدایونی:

> "اس کا دوسرا ایڈیشن باسم "خطوط شبلی عورتوں کے نام" تنہا محمد امین زبیری کی ترتیب سے تاج کمپنی لاہور کی جانب سے شائع ہوا، اس

(۱)مکتوباتی ادب۔ڈاکٹر شمس بدایونی،ناشر، مصنف۔ بروڈکشن۔اردوبک ریویو،سال اشاعت ۲۰۱۰ء صفحہ نمبر ۵۴

پر سال اشاعت درج نہیں، دیباچہ پر ۱۲/ مئی ۱۹۳۵ء تاریخ درج ہے،
لہٰذا یہ مئی ۱۹۳۵ء کے بعد شائع ہوا ہوگا۔" (۱)

مجموعہ "خطوط شبلی" کا سر ورق یوں ہے:

خطوط شبلی

بنام

محترمہ زہرا بیگم صاحبہ فیضی وعطیہ بیگم صاحبہ فیضی

مرتب

مولوی محمد امین صاحب زبیری و منشی سید محمد یوسف صاحب قیصر

ظل السلطان بک ایجنسی، بھوپال

نے

شمسی مشین پریس آگرہ میں باہتمام محمد بشیر الدین خاں طبع کرائے

قیمت فی جلد ایک روپیہ (حقوق طبع محفوظ ہیں)

دوسرے ورق پر مضامین کی فہرست یوں درج ہے:

فہرست مضامین

(۲)مکتوباتی ادب۔ڈاکٹر شمس بدایونی،ناشر، مصنف۔بروڈکشن۔اردوبک ریویو،سال اشاعت ۲۰۱۰ء ص۵۴

اس کے بعد صفحہ نمبر ۵ سے مولوی عبدالحق صاحب کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے علامہ شبلی نعمانی کے لیے نازیبا کلمات استعمال کئے ہیں۔ مقدمہ ۲۴/ صفحہ نمبر پر ختم ہوتاہے۔ اس کے بعد یوں تحریر ہے ''خطوط بنام عطیہ بیگم فیضی صاحبہ پھر اگلے صفحے سے خطوط کا آغاز ہوتا ہے، اور عطیہ فیضی کے نام کل ۵۵ خطوط ہیں جو ۱۷/ فروری ۱۹۰۸ء سے ۲۸/ مئی ۱۹۱۱ء کے دوران لکھے گئے ہیں۔ اس کے فوراً بعد خطوط بنام زہرا بیگم فیضی صاحب تحریر ہے ان کے نام کل خط کی تعداد ۴۵ ہے اور یہ ۱۷/ فروری ۱۹۰۸ء سے ۱۳/ جون ۱۹۱۴ء کے دوران لکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد آخری صفحہ پر علامہ شبلی نعمانی کی نظم عدل جہانگیری ہے اس مجموعے میں مکمل خطوں کی تعداد ۱۰۰ ہے، یہی مجموعہ میرے پیش نظر ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن جو مجھے نہ ملا سکا اس کے متعلق ڈاکٹر شمس بدایونی نے یوں لکھا ہے:

> ''خطوط شبلی'' کا دوسرا ایڈیشن بہ اسم ''خطوط شبلی عورتوں کے نام'' تاج کمپنی لمیٹیڈ لاہور سے شائع ہوا، یہ اشاعت ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے، مرتب کی حیثیت سے اس پر تنہا محمد امین زبیری کا نام درج ہے، کتاب کا ٹائٹل رنگین کارڈ شیٹ پر ڈیزائن کیا گیا ہے، جس پر صرف کتاب، مرتب اور ناشر کا نام مندرج ہے، اس کی پشت پر ''نہایت ضروری التماس'' عنوان سے کتابوں کی خریداری سے متعلق ناشر نے ایک عبارت دی ہے، ٹائٹل کے تیسرے اور چوتھے صفحے پر تاج کمپنی لاہور کے اشتہارات ہیں۔ اس اشاعت کا سرورق یہ ہے:
>
> 'جملہ حقوق محفوظ/ خطوط شبلی/ بنام عطیہ بیگم صاحب فیضی و زہرا بیگم صاحب فیضی/ مرتبہ، مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی، وظیفہ یاب بھوپال/ تاج کمپنی لمیٹیڈ لاہور نے طبع کر کے شائع کیا۔

صفحہ ۲ پر فہرست مضامین ہے، جو حسب ذیل ہے:

مقدمہ، از مولوی عبدالحق صاحب بی اے سیکریٹری انجمن ترقی اردو (ص:۱۴ تا ۳۶) خطوط بنام عطیہ بیگم فیضی صاحب (ص:۳۹ تا ۹۹) خطوط بنام زہرا بیگم صاحب فیضی (ص:۱۰۰ تا ۱۲۸) عدل جہانگیری (نظم) (ص: ۱۴۰) آگے تحریر کرتے ہیں:

> ”فہرست میں دیباچے کا اندراج نہیں، جو صفحہ ۳/ سے صفحہ ۱۳ کو محیط ہے، یہ نیا دیباچہ ہے جس پر ۱۲/ مئی ۱۹۳۵ء تاریخ مندرج ہے، کتاب پر قیمت بھی مذکور نہیں۔ طبع اول کی طرح طبع دوم پر بھی سال اشاعت کا اندراج نہیں۔ طبع اول کے سال اشاعت کا اندراج طبع دوم کے دیباچے میں خود مرتب نے کیا ہے، (ص:۱۲) لیکن وہ تبصرۂ حیات شبلی، میں مرتب نے دونوں کے سال اشاعت بالترتیب ۱۹۲۶ء اور ۱۹۳۵ء درج کردیے ہیں،(ص:۹) بار اول کا سالِ اشاعت، شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں ۱۹۲۵ء (ص:۲۰) اور عطیا زجر نیز میں، ۱۹۳۰ء (ص: ۵۶، ۶۲) لکھا ہے، جو غلط ہے۔ دیباچے و مقدمے کے علاوہ متن ص:۳۹ سے ص :۱۲۸ کو محیط ہے، لیکن یہ ناقص الآخر ہے۔ یعنی زہرا بیگم کے نام خط نمبر ۲۷ کے مکمل ہونے سے پیشتر ہی یہ مجموعہ تمام ہوگیا۔ آگے کے ۲۰ خط اس میں شامل ہونے سے رہ گئے اور یہ ناقص لآخر مجموعہ اسی طرح جاری کردیا گیا۔“ (۱)

ان دونوں اشاعتوں میں فرق ہے، پہلے ایڈیشن میں کل ۱۰۰/ خطوط ہیں جبکہ دوسرے ایڈیشن میں ۸۱/ خط۔ گویا پہلے ایڈیشن کے ۲۰/ خط نکال دئے گئے ہیں، پہلے ایڈیشن میں صرف مولوی عبدالحق کا مقدمہ ہے جبکہ دوسرے میں مرتب کا دیباچہ بھی شامل ہے ان دونوں اشاعتوں کے بعد خطوط شبلی کی کسی اشاعت کا علم نہیں۔

”خطوط شبلی“ محمد امین زبیری کے مجموعے کو نئے سرے سے ۲۰۲۰ء میں ڈاکٹر شمس بدایونی ترتیب دے کر ”خطوط شبلی بنام خواتین فیضی“ کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کے متعلق مختصراً معلومات اس طرح سے ہیں۔

---

(۱) خطوط شبلی بنام خواتین فیضی، مرتب ومدون: ڈاکٹر شمس بدایونی۔ ناشر: اپلائڈبکس، دریاگنج نئی دہلی۔ اشاعت ۲۰۲۰ء ص۱۰، ۱۱۔

"خطوط شبلی" بنام خواتین فیضی،مولف محمد امین زبیری مرتب و مدون، ڈاکٹر شمس بدایونی، اپلائڈ بکس اس کے بعد والے صفحے پر جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ،اس کے نیچے نام کتاب... مولف ... مرتب... اشاعت ۲۰۲۰ء صفحات ۲۵۸ قیمت ... مطبع ... ناشر... ملنے کا پتہ۔ تحریر ہے اس کے بعد والا صفحہ یوں ہے ترتیب جو حسب ذیل ہے۔

ابتدائیہ ڈاکٹر شمس بدایونی، تقدیم، ڈاکٹر شمس بدایونی،التماس و انتساب (دیباچہ طبع اول) محمد امین زبیری، دیباچہ (طبع دوم مع حواشی) محمد امین زبیری، تصویر مولانا شبلی ... عکس خط مولانا شبلی نعمانی ...،مقدمہ (مع حواشی) مولوی عبدالحق، خطوط شبلی بنام عطیہ بیگم فیض (مع حواشی) مرتب، خطوط شبلی بنام زہرا بیگم فیضی (مع حواشی) مرتب، خط بنام نازلی رفیعہ سلطان بیگم (مع حواشی) مرتب، کتابیات، مرتب، اشاریہ، مرتب، عکس نوادر، مرتب، ایک اہم مکتوب، پروفیسر شمس الرحمن فاروقی، اس کے بعد والا صفحہ جس پر فہرست عکسی نوادر تحریر ہے جو حسب ذیل ہے:

۱، تصویر شبلی نعمانی بہ عمر ۳۰ سال (تقریباً ۱۸۸۷ئ) ۲، تصویر عطیہ بیگم فیضی ۳، عکس تحریر عطیہ بیگم فیضی ۴، تصویر فیضی رحمین، عطیہ بیگم، زہرا بیگم اور نازلی بیگم ۵، پورٹریٹ امیر افسا (والدۂ عطیہ بیگم) ۶،پورٹریٹ شبلی نعمانی، عمل: فیضی رحمین۷،تصویر نواب جنجیرہ سید احمد خاں ۸، تصویر قصر احمد یعنی قلعۂ جنجیرہ۹، تصویر آخری آرام گاہ عطیہ و نازلی۱۰، تصویر محمد امین زبیری، ۱۱، سرورق خطوط شبلی (بار اول)۱۲۔ سرورق خطوط شبلی (بار دوم) ۱۳۔ ٹائٹل خطوط شبلی (بار سوم) ۱۴۔ سرورق حیات شبلی (بار اول) ۱۵۔ ٹائٹل تبصرۂ حیات شبلی (بار اول) ۱۶۔ سرورق شبلی کی حیات معاشقہ۱۷۔ سرورق ذکر شبلی (بار اول) ۱۸۔ سرورق شبلی نامہ (بار اول)۱۹۔ سرورق شعر العجم (بار اول) ۲۰۔سرورق بوئے گل (باراول)۲۱۔ سرورق دستہ گل (بار اول)۲۲۔ ہندوستانی موسیقی پر عطیہ بیگم فیضی کی مطبوعات۔ ۲۳۔ سرورق زمانۂ تحصیل (باراول) ۲۴۔ ٹائٹل اقبالس لیٹرس ٹو عطیہ بیگم (بار اول)۲۵۔ سرورق اقبال از عطیہ بیگم (بار اول) ۲۶۔ سرورق سرگذشت از زہرابیگم (بار اول)

۲۷۔ سرورق سیر یورپ از نازلی رفیعہ سلطان بیگم (بار اول) یہ خطوط شبلی "بنام خواتین فیضی" کی فہرست کا خاکہ تھا، یہاں اس کتاب کے تعارف کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ خطوط جو علامہ شبلی نعمانی نے عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کو لکھے تھے اس کا علم ہوسکے جن کا تذکرہ اس سے پہلے آچکا ہے۔ یہاں یہ بات ذکر کے قابل ہے کہ پہلے ایڈیشن میں صرف دو مکتوب الیہ ہیں اور اس مجموعہ میں شمس بدایونی نے ایک اور مکتوب الیہ جن کا نام نازلی زہرا ہے کا ایک خط بھی شامل کیا ہے۔ اس لیے اس مجموعہ میں تین مکتوب الیہ ہوجاتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں شمس الرحمن فاروقی صاحب کا ایک خط بطور تعارف صفحہ نمبر ۲۵۷ پر درج ہے۔

شمس الرحمن فاروقی کے خط کا کچھ حصہ ملاحظہ فرمائیں:

"میرا خیال ہے شبلی اور خاندان جنجیرہ کی خواتین کے روابط اور ان کی 'اصل حقیقت' پر آپ سے زیادہ منصفانہ اور معروضی انداز میں کسی نے نہیں لکھا ہے۔ مجھے تو اس بات پر افسوس ہے اور رہے گا کہ سوبرس سے زیادہ گزر جانے پر بھی ہم لوگوں کا یہ شوق نہ گیا کہ کسی بڑے ادیب کی کمزوری اور خاص کر جنسی معاملات میں کمزوری کو کرید کرید کر دیکھا اور مزہ لیا جائے۔ امید ہے آپ کی یہ کتاب اس مریضانہ شوق کا اگر کلیتاً نہیں تو ایک حد تک تدارک کرسکے گی۔ شبلی انسان تھے اور ان کے مزاج میں اللہ نے کچھ حسن پرستی کے ساتھ قوم کی اصلاح اور اس کی تعلیمی اور ذہنی پستی کی اصلاح کا بھی وافر جذبہ دیا تھا، اور عام مولویوں کے علی الرغم شبلی کو عورتوں کی تعلیم اور ترقی کی اہمیت کا احساس تھا اگر ان کو عطیہ اور زہرا میں ایسی عورتیں نظر آئیں جو ان کے تمام معیاروں پر پوری اترتی تھیں تو اس میں کیا برائی ہے؟ جب اقبال جیسے شخص کو مسولینی جیسے احمق اور بے ضمیر اور مشرق دشمن اور جابر سیاسی انسان میں بھی مرد مومن کی صفات نظر آ گئیں تو شبلی نے تو اقبال کے مقابلے میں بہت کم دنیا دیکھی تھی، بہت کم لوگوں کو برتا تھا، اگر وہ عطیہ سے متاثر ہوگئے تو کیا گناہ ہوا؟ اور اگر عطیہ ان سے شادی بھی کرلیتی تو کیا عیب تھا؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے، شبلی نے شادی کی

> تجویز عطیہ یا ان کے بزرگوں کے سامنے کبھی رکھی بھی نہیں،صرف دور سے تصور کرتے رہے تو اس میں کون سا گناہ تھا؟اب یہ اور بات ہے کہ مدتوں بعد عطیہ نے ان باتوں سے برأت چاہی اور کہا کہ ہم تو ان کو صرف ایک شریف مولوی اور اسلامی عالم سمجھتے اوراسی حیثیت میں ان سے ملتے تھے اور ہمیں کیا معلوم کہ ان کے دل میں کیا (خبث؟) تھا تو ٹھیک ہے،امین زبیری نے کیچڑ اچھالی تو اس کا جواب عطیہ سے نہ بن پڑا، یہ ان کی کمزوری تھی۔

آپ نے عطیہ،زہرا اور فیضی کی تفصیلات بہت مفصل بیان کی ہیں، اس سے زیادہ شاید ممکن نہ تھا۔اتنی معلومات شاید کہیں بھی یکجا نہ مل سکیں۔اسی طرح حواشی بھی آپ نے غیر معمولی جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ لکھے ہیں۔کچھ بہت ہی نادر تصویریں اورکتابوں کی اول اشاعتوں کے سرورق کی تصویریں بھی آپ کی کتاب کی افادیت اوردلکشی میں اضافہ کررہی ہیں۔(۱)

اگراس خط کے تناظر میں ہم اس کتاب کودیکھیں تویہاں بات صاف طور سے واضح ہو جاتی ہے کہ مرتب نے اس پر بڑی جانفشانی کی ہے، اس کتاب کی ایک اہم کڑی، عطیہ فیضی زہرافیضی، نازلی فیضی اور ان کے خاندان کا تعارف اس کتاب میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ یہ کتاب اردومکتوب نگاری کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔اور علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کے بہت سے وہ پہلو جو ہمارے سامنے نہ آسکے تھے کھل کر سامنے آئے ہیں۔

مراسلات شبلی

مراسلات بھی ایک طرح سے مکاتیب ہی ہوتے ہیں۔البتہ اس میں زیادہ تر قومی و ملی مسائل پر اظہار خیال ہوتا ہے۔اگر بغور دیکھا جائے تو شبلی ہی اس سلسلہ کے بانی وموجد ہیں۔ یہ مراسلات بنیادی طور پر قوم کی علمی و تعلیمی ترقی اور اسلام کی حفاظت و اشاعت کی غرض سے لکھے گئے۔مراسلات لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ عام ہوجائیں، قوم کے

(۱)خطوط شبلی بنام خواتین فیضی۔مرتب ومدون : ڈاکٹر شمس بدایونی، ناشر، اپلائڈبکس، دریاگنج ، نئی دہلی، اشاعت ۲۰۲۰ء ص۲۵۷

ممتاز افراد و اشخاص بالخصوص ارباب نظر تک پہنچ جائیں اور ان پر بحث و مباحثہ ہو، ان کی اہمیت و افادیت اجاگر ہو، اس کے بعد جو لائحہ عمل سامنے آئے اس کو عملی جامہ پہنایا جاسکے، مولانا شبلی نعمانی نے مختلف موضوعات پر ۲۶/ مراسلے لکھے جو اس زمانہ کے اہم علمی وادبی رسائل واخبارات کی زینت بنے، اور ان میں صرف قوم و ملت کے مختلف مسائل پر بحث ہے۔بقول ڈاکٹر الیاس الاعظمی:

"علامہ شبلی نے مختلف موضوعات پر ۲۶/ مراسلے لکھے ہیں، ان میں وہ ملت کو درپیش مختلف مسائل کے سلسلہ میں جو کچھ کرنا چاہتے تھے ان کی توضیح و تفصیل پیش کی ہے اور زیر بحث موضوعات سے متعلق نہایت ہی دل سوزی کے ساتھ اپنے خیالات پیش کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اہل علم اور ارباب نظر نے ان کی طرف نہ صرف بھرپور توجہ دی بلکہ اس میں حصہ بھی لیا، یہ حصہ داری مفید مشوروں کے لحاظ سے بھی ہے اور عملی جدوجہد کے لحاظ سے بھی گویا دامے درمے، قدمے، سخنے ہر لحاظ سے ملت کے بہی خواہوں نے ان منصوبوں میں حصہ لیا۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی کے مراسلات کے تعلق سے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی تحریر کرتے ہیں:

"قومی اور ملی مسائل پر مراسلہ نگاری علامہ شبلی کی اولیات میں شامل ہے، یہ روایت انھوں نے شروع کی اور انھی کے ساتھ یہ ختم بھی ہوگئی،اہم ملی مسائل کے سلسلے میں رائے عامہ بنانے اور عوامی بیداری پیدا کرنے کے مقصد سے نیز کسی خاص معاملہ میں وسیع تر حلقوں سے تعاون حاصل کرنے کے لیے علامہ شبلی نے اخبارات میں مراسلے لکھنے کی طرح ڈالی، یہ مراسلات نہایت اہم امور و رسائل سے متعلق ہیں اور ان کی ملی دردمندی کے مظہر ہیں، جو ان کی

---

(۱) مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ طبع اول اپریل ۲۰۱۶ء ص۹۔

شخصیت کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی، ان میں سے کئی مراسلے
مقالات شبلی اور بعض دوسرے مجموعوں کی زینت بن چکے ہیں۔البتہ کئی
نہایت اہم مراسلے ایسے ہیں جو گذشتہ دنوں دریافت ہوئے ہیں۔(۱)

علامہ شبلی نعمانی کے مراسلے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس میں زیادہ تر اپنے وقت کے نہایت اہم قومی وملی مسائل پر توجہ دی، بالخصوص انھوں نے وقف علی الاولاد کے تعلق سے جو مراسلہ لکھا، مولانا ابوالکلام آزاد نے ''ندوۃ العلما کا اجلاس دہلی اور قوم کی شاہ راہ مقصود'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں اس پر رائے زنی کرتے ہوئے الندوہ کے اپریل ۱۹۱۰ء کے شمارہ میں لکھا:

''جی چاہتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی اس سعی و محنت کا شکریہ ادا کریں جو وہ دو تین سال سے وقف الاولاد کے لیے فرمارہے ہیں لیکن جو ذات یکسر وقف خدمت ملت ہو اس کے کس کس احسان کا شکریہ ادا کیا جائے؟ وہ ہماری زبان، ہمارے لٹریچر اور ہمارے علوم و فنون کی ایسی گراں قدر اور عدیم النظیر خدمت انجام دے رہے ہیں جس کے احسان سے تمام عالم اسلامی سبکدوش نہیں ہوسکتا پھر انھوں نے ایک ایسی عظیم الشان خدمت اپنے ذمہ لے لی ہے جس کی نسبت مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ صرف ان ہی کے دم سے قائم ہے، ان کے یہی احسانات کیا کم تھے مگر ان کا دل ملت خواہ جو سر تا سر درد اور محبت ہے، ہمارے دیگر ضرور ملت کو محسوس کرنے میں بھی اسبق و اقدم رہتا ہے اور جب محسوس کرلیتا ہے تو جوش ملت پرستی کو ضبط نہیں کرسکتا۔'' (۱)

''مراسلات شبلی'' کا ذکر اس باب میں اس لیے کیا جارہا ہے کہ ان کو خطوط کی حیثیت حاصل ہے، ڈاکٹر الیاس الاعظمی صاحب مراسلات شبلی کی اہمیت ومعنویت وافادیت پر اس طرح گفتگو کرتے ہیں:

---

(۱) مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ طبع اول اپریل ۲۰۱۶ء ص۷۔
(۱) مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ طبع اول اپریل ۲۰۱۶ء ص۸۔

”علامہ شبلی نے جو مراسلات لکھے ہیں ان میں چند غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور بعض کا شمار ان کے اولیات میں ہونا چاہیے کہ یونیورسٹی کی تجویز، دارالمصنّفین کی تجویز، سیرۃ النبیؐ کی تجویز وغیرہ سے متعلق مراسلوں میں انھوں نے نہ صرف تجاویز پیش کی ہیں بلکہ ان میں اپنی عملی شرکت کا اظہار و اعلان بھی کیا ہے۔ مثلاً مکہ یونیورسٹی کی تجویز میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

”میں بہ ایں ضعف اور شکستہ پائی یہ کرسکتا ہوں کہ اس تحریک کے لیے تمام ہندوستان کا دورہ کروں اور پھر ہجرت کرکے مکہ معظمہ چلا جائوں اور اس مبارک جامعہ میں جاروب کشی کی خدمت انجام دوں۔“ (۱)

ان مراسلات پر بحثیں ہوئیں اور اہل علم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، مثلاً مکہ یونیورسٹی کی تجویز کی، بہت سے لوگوں نے جہاں حمایت کی وہیں بہتوں نے مخالفت بھی کی اور اس سلسلے میں مراسلے اور مضامین بھی لکھے گئے، خود علامہ شبلی نعمانی کے ایک شاگرد مولانا ظفر علی خاں نے مکہ یونیورسٹی تجویز کی شدید مخالفت کی اور اس کے خلاف روزنامہ زمیندار لاہور میں تین قسطوں میں مضمون لکھا۔ ان مراسلوں سے ترکوں اور ارتداد کے فتنہ کی وضاحت بھی ہوتی ہے، ترکوں کے تعلق سے ڈاکٹر الیاس الاعظمی تحریر کرتے ہیں:

”علامہ شبلی کو ترکوں سے بڑی محبت تھی، ۱۸۷۷ء میں روس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا اس وقت علامہ شبلی نوجوان تھے، جوش حمیت میں ترکوں کے تعاون کے لیے اپنے وطن اعظم گڑھ سے تین ہزار کی رقم جمع کی اور ترکی سفیر بمبئی کے ذریعہ اسے ترکی بھیجا، پھر دوبارہ ترکی پر حملہ ہوا تو انھوں نے ترکوں کے تعاون کے لیے یہ فتوی دیا کہ اس سال قربانی نہ کی جائے اور اس طرح بچنے والی رقم ترکوں کی اعانت کے لیے بھی جائے، اس کا انھوں نے ایک مراسلہ کے ذریعہ تمام ہندوستان میں

---

(۱) مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ طبع اول اپریل ۲۰۱۶ء ص ۱۰۔

اعلان کیا،مولانا ظفر علی خاں نے اس میں بھی ان کی حمایت نہ کی۔" (۱)

ارتداد کے فتنہ کے متعلق بھی ڈاکٹر الیاس الاعظمی تحریر کرتے ہیں:

"ارتداد کے فتنہ نے علامہ شبلی کی حمیت اسلامی کے جذبہ کو برانگیختہ کیا تو انھوں نے حفاظت و اشاعت اسلام کی تحریک کا آغاز کیا اور یہ تحریک اس قدر وسعت کے ساتھ برپا کی کہ اس میں مسلمانوں کے مختلف مسالک و مذاہب کے لوگ شامل تھے۔غرض ان کے تصور حفاظت و اشاعت اسلام میں بڑی وسعت تھی۔ندوہ سے استعفا اور پھر موت کی وجہ سے یہ اہم کام تشنہ تکمیل رہ گیا۔"

ان دونوں اقتباسات سے علامہ شبلی نعمانی کے جذبہ ایثار اور قوم و ملت کے لیے فکرمندی کے احساسات ملتے ہیں اور قوم کو زوال کے بھنور سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ یہ سب تنہا کرنے کے بھی خواہاں نہ تھے بلکہ ان کی خواہش تھی وہ تمام لوگ جو ملت کا درد رکھتے ہیں اس میں شامل ہوں اور تمام ملی و رفاہی کاموں کو مشترکہ اور متفقہ طور پر انجام دیا جائے۔ذیل میں ان مراسلات کے عناوین نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ایک نظر میں مراسلات کے موضوعات کا اندازہ ہوجائے۔

(۱) اظہار تشکر

(۲) الف لیلہ ولیلہ

(۳) عبداللہ ابن المقفع کا قبول اسلام

(۴) ابن رشد

(۵) المامون

(۶) رسالہ المعارف

---

(۱) مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔طبع اول اپریل ۲۰۱۶ء ص۱۱۔

(۷) اشاعت کتب قدیمہ

(۸) وقف اولاد کے مسئلہ کے متعلق ایک نہایت ضروری تحریک

(۹) اجلاس ندوہ

(۱۰) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مفصل اور مستند سوانح عمری

(۱۱) نو مسلموں کو دوبارہ ہندو ہوجانے سے بچانے کے لیے تمام برادران اسلامی کی خدمت میں فریاد

(۱۲) مجلس علم الکلام

(۱۳) سیرت نبوی

(۱۴) تعطیل جمعہ

(۱۵) حرم محترم میں جامعہ اسلامیہ (یونیورسٹی) کی تجویز

(۱۶) مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم

(۱۷) مولانا عبدالباری کی شہادت

(۱۸) مولوی عبدالکریم صاحب کی معطلی اور مولانا عبدالحی صاحب

(۱۹) مولوی عبدالکریم کی معطلی

(۲۰) اوقاف اسلامی

(۲۱) ایک اہم تجویز دارالمصنّفین

(۲۲) ایک مذہبی مدرسہ اعظم کی عمارت کے لیے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست

(۲۳) اسٹرایک کا سبب کون تھا؟

(۲۴) اصلاح ندوہ اور ہمدرد

(۲۵) جلسہ دہلی کے متعلق ایک عام غلط فہمی کی تردید

(۲۶) ترکوں کی اعانت

ان چھبیس مراسلوں سے علامہ شبلی کی شخصیت کے ایک نئے گوشے کا آغاز ہوتا ہے ان تمام کو اگر خطوط کے زمرے میں شامل کردیاجائے تو علامہ شبلی نعمانی کے مدوّن خطوط کی تعداد اگیارہ سو اٹھارہ ہوجاتی ہے۔

کتابوں اور مضامین شائع شدہ خطوط کے بعد اب ان خطوط کا تذکرہ کیاجاتا ہے جو ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی حالیہ کتاب "نقوش شبلی" اور "بیان شبلی" میں شامل ہیں۔ ان نو دریافت کل خطوط کی تعداد ۳۶ ہے اور ان کے مکتوب الیہ چار ہیں:

(۱) میر ولایت حسین	آدھا / خط
(۲) پروفیسر زماں مہدی	۳/ خط
(۳) محمد اسحاق ایڈوکیٹ	۳/ خط
(۴) حامد حسن نعمانی	۲۹/ خط

میزان= ۳۶

ان مکاتیب میں میر ولایت حسین کا صرف آدھا خط ہی دستیاب ہوا ہے اور یہ مکتوب بغیر القاب و آداب کے لکھے گئے ہیں، ایک خط میں حامد حسن کو "عزیزی" لکھا ہے۔اور یہ تمام خطوط پوسٹ کارڈ پر لکھے گئے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کے یہ نودریافت خطوط گھریلو اور ذاتی قسم کے ہیں لیکن ان کی اہمیت سے انکار نہیں۔ان سے بہت سے ذاتی حالات پر روشنی پڑتی ہے، متعدد خطوط سے شبلی کی زندگی کا احاطہ بھی ہوتا ہے، اور شبلی کے تعلق سے بعض گوشے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ متعدد تاریخوں کا بھی تعین ہوتا ہے اور ان سب سے بڑھ کر حامد حسن نعمانی کی تعلیمی زندگی کے نشیب و فراز اور اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی کی فکر مندی سے آگاہی ہوتی ہے۔علامہ شبلی کی متعدد مصروفیات کا بھی علم ہوتا ہے اور خاص طور سے علی گڑھ سے علاحدگی کے فوراً بعد کی زندگی اور بعض دیگر واقعات ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ مزید ۱۳/خط کی دریافت بھی ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی ہے جس کو انھوں

نے ”بیان شبلی“ میں ”علامہ شبلی کے چند نو دریافت غیر مدون خطوط اور ان کے مکتوب الیہ“ کے عنوان سے شامل کیا ہے، جن کے مکتوب الیہ اور ان کے خطوط کی تعداد درج ذیل ہے:

(۱)	قاضی سراج الدین احمد کے نام	۲/ خط
(۲)	نواب غلام احمد کلامی کے نام	۱/ خط
(۳)	مولانا رحمن علی کے نام	۱/ خط
(۴)	مولانا مفتی شیر علی کے نام	۹/ خط

(میزان ۱۳)

یہ ۱۳/ خطوط اگرچہ علامہ شبلی نعمانی کی سوانح کی مستقل کڑی نہیں ہیں تاہم گم شدہ کڑیوں کو باہم ملانے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔بقول ڈاکٹر الیاس الاعظمی:

”تاہم یہ سوانح شبلی کی مستقل کڑی نہ ہونے کے باوجود گم شدہ کڑیوں کے ملانے میں ان سے ضرور مدد مل سکتی ہے۔مزید جو ۱۴/ خطوط ”مکتوباتِ شبلی“ میں شامل ہیں، ان کے ساتھ تسلسل سے ان کا مطالعہ کیا جائے تو ان خطوط کی اہمیت پورے طور پر سامنے آتی ہے۔“ (۱)

ان کے علاوہ ابھی متعدد اصحاب علم وادب کے نام بہت سے خطوط ہیں جو سامنے نہیں آسکے ہیں، مثلاً حیدرآباد میں مفتی شیر علی کے نام متعدد خطوط ادارہ ادبیات حیدرآباد میں محفوظ ہیں، اسی طرح جنجیرہ ممبئ میں بہت سے خطوط جو عطیہ فیضی اور ان کی دو بہنوں کے نام بھی محفوظ ہیں جو ان کے خاندان والوں نے محفوظ کر رکھے ہیں جن کو متعدد بار حاصل کرنے کی کوشش کی جاچکی ہے میں نے خود اس متعلق ممبئ میں بہت سے لوگوں سے باتیں کی لیکن وہ خطوط دستیاب نہ ہوسکے ، ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ خطوط اب اندور لائے جاچکے ہیں اور ان کا حاصل کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ ان کے خاندان والے وہ کسی کو دینا نہیں چاہتے، اس کی کیا وجہ ہے مجھے معلوم نہیں لیکن ابھی تک ان خطوط پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

اب تک میرے مطالعے میں جتنے خطوط آئے ان چھتیس اور تیرہ کو ملا کر ان کی کل

---

(۱) بیان شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔زیراہتمام ادبی دائرہ اعظم گڑھ۔مطبع روشان پرنٹرس، دہلی۔سن اشاعت ۲۰۲۰ء ص۱۰۱،۱۰۲۔

تعداد اگیارہ سو سرسٹھ ہوتی ہے ان تمام خطوط کے مطالعہ کے بعد یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کے مکاتیب ومراسلات میں قومی ہمدردی، جذبہ ایثار و قربانی اور دیانت داری کے علاوہ اصلاح پسندی، روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کی خصوصیات بھی موجود تھیں، علمی، قومی اور مذہبی خدمات انجام دینا شبلی نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا، اگر ۱۸۸۲ء ہی سے دیکھا جائے تو ۱۹۱۴ء تک ۳۲ سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی۔علامہ شبلی کا یہ سارا زمانہ مختلف خدمات اور مسلسل مصروفیات میں بسر ہوا اور خطوط کے مطالعے سے یہ تمام باتیں واضح ہوجاتی ہیں۔

اختتامیہ Conclusion

مولانا شبلی نے اردو میں خط لکھنا ۱۸۸۲ء میں شروع کیا اور وفات (۱۹۱۴ء) تک یہ سلسلہ جاری رہا،ان کے ابتدائی خط کو پیش نظر رکھا جائے تو شبلی عین جوانی کے عالم میں ہمارے سامنے آتے ہیں جبکہ ان کی عمر پچیس سال تھی۔علی گڑھ کے اس نوجوان پروفیسر کی علمی سرگرمیوں اور اس نوعمر عالم کی مذہبی اور قومی خدمات اور اس جوان اورپرجوش ہمت مصنف کی تصنیفی مصروفیات کو دیکھ کر واقعی اس کو ایک عظیم اور وقار شخصیت تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔

۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک ۳۲ سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی، شبلی کا یہ سارا زمانہ مختلف خدمات اور مسلسل مصروفیات میں بسر ہوا۔خطوط کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں قومی ہمدردی، جذبۂ ایثار و قربانی اور دیانت داری کے اوصاف تھے۔

اصلاح پسندی، روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کی خصوصیات ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں، قدامت پسند علماء کی طرح انھوں نے اپنی زندگی خلوتوں میں نہیں گذار دی بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا کا مقابلہ کیا۔طبیعت چونکہ جدت پسند تھی، جدید رجحانات کو اپنایا اس لیے رجعت پسند مولویوں کی نظر میں کھٹکنے لگے۔نئے دور کے نمائندوں اور مغربی تعلیم یافتہ اشخاص کی صحبت میں رہنے کے باوجود مذہبی اصولوں اور مشرقی طریقوں سے منحرف نہیں ہوگئے اس لیے اس طبقے میں بھی مقبول نہ ہوسکے اور ہر دو طرف سے مخالفت کی جانے لگی۔

مولانا شبلی نے خوداپنے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ اس پر قائم رہے اور دوسروں کی پیروی نہ کی۔یہ مجتہد تھے مقلد نہ تھے۔انھوں نے چاہا کہ قوم کے سامنے ایک ایسا راستہ پیش کریں جو نئے اور پرانی راہوں کو ملا دے لیکن ان کے خیالات اور نظریات کو کون سمجھتا، اس کو سمجھنے کے لئے تو ایک مخصوص پیمانہ درکار اورایک ایسی نظر کی ضرورت تھی جو ان گہرائیوں تک پہنچ سکے، اس لیے چند ایک کے سوا کوئی ان کا ہم خیال نہ بن سکا۔ہم خیالی تو

بڑی بات ہے انھوں نے جس کام کا آغاز کیا زیادہ تر لوگوں نے مخالفت کی اور ان کی راہ میں دشواریاں پیدا کیں، ایسے حالات میں شبلی کا زمانہ کی حق ناشناسی کی شکایت کرنا بے جا نہ تھا۔ ان کی طبیعت میں مایوسی اور زود رنجی کا پیدا ہوجانا بھی اسی سبب سے تھا۔البتہ ان کی طبیعت میں جو زود حسی اور جذباتیت تھی اسے ان کی فطرت کی کمزوری کہیں تو غلط نہ ہو گا، ان سے اگر کوئی بات قابل اعتراض سرزد بھی ہوتی، تو وہ محض اسی جذباتیت اور زود حسی کا نتیجہ تھا، مخالفوں کو انھوں نے برا بھلا بھی کہا اور سخت الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔بے شک یہ شبلی کی فطرت کے کمزور پہلو ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ اورنگ زیب عالمگیرؒ سے متعلق لکھا تھا وہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔"یہ کہنا بھی بالکل مبالغہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھا" لیکن مولانا شبلی کی ان کمزوریوں پر ان کی فطرت کی خوبیاں ہمیشہ غالب رہیں۔شبلی بیحد خود دار واقع ہوئے تھے اور ساتھ ہی ان میں خود شناسی کا جذبہ بھی تھا، اپنی اور اپنے کاموں کی برتری اور اہمیت کا اندازہ بھی۔مخالفتوں کے باوجود وہ اپنی راہ سے ہٹ نہیں گئے۔ان کے خیالات اور عزم و ارادے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی بلکہ مزید استحکام پیدا ہوگیا۔وہ جو کام بھی کرتے عمدہ اور اعلیٰ پیمانہ پر کرتے۔غرض یہ کہ ان ساری باتوں کی یکجائی نے شبلی میں ایک انفرادیت پیدا کردی تھی۔اگر مولانا شبلی کو مکتوب کے آئینے میں دیکھاجائے تو وہ تقریباً ہر فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔البتہ یہ ضروری ہے کہ بزرگوں کا احترام لازم ہے اور مولانا شبلی ہمارے بزرگ ہیں، جن کا احترام فرض ہے اوروہ ہمارے لئے قابل فخر بھی ہیں، زندگی کی دشواریوں اور رنگینوں کے باوجود علم کی پناہ میں جیتے رہے، جس چیز کو دیکھا گہری اور بھرپور نظر سے دیکھا۔اپنے خیالات اور جذبات پر قائم رہتے ہوئے عملی زندگی میں قدم بڑھاتے رہے۔سماج کی دہکتی ہوئی آنکھوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائے، نہ شکنجے میں رہنے کے قائل تھے۔خط کے اندر اظہار خیال بے تکلف اور بے دھڑک ہوتا ہے۔اپنے ماموں محمد سلیم کے نام ایک خط میں اپنے خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں: "میرا اصول ہے کہ انسان ہرکام

کے نقص و ہنر کا خود فیصلہ کرسکتا ہے اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً عوام کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔" شبلی پرستی اور شبلی شناسی میں بڑا فرق ہے۔ شبلی شناسی میں ممکن ہے کہ کڑوا پن محسوس ہو لیکن انصاف ہوتا ہے اور شبلی فہمی آسان ہوجاتی ہے۔ خط لکھتے وقت انسان کو مطلق خیال نہیں ہوتا ہے کہ آنے والے کل میں یہ کیا شکل اختیار کر جائے گا۔ اس لیے وہ سیدھے سیدھے سچی اور دل کی لگی ہوئی باتیں لکھ جاتا ہے۔ مکتوب نگارادبی نوک پلک کی جانب بہت توجہ بھی نہیں کرپاتا۔ کبھی کبھی ذاتی معاملات خط کے اندر لطف پیدا کرنے کے بجائے کساؤ پیدا کردیتے ہیں جس طرح اصلی شہد کے اندر ملا ہوا موم مزے میں فرق پیدا کردیتا ہے، کچھ خطوط محض ادبی خطوط ہوتے ہیں جن کے اندر ادبی چاشنی پائی جاتی ہے، اس کی مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبار خاطر" ہے۔ مولانا شبلی کے خطوط کے اندر ذاتی گھریلو زندگی کا عکس، چہل پہل، کتابوں کی لکھائی چھپائی، درستی اور تکمیل ہونے کی بے کلی، عرب اور عجم کی داستان، سیاسی مسائل کی دھمک، دارالمصنّفین قائم کرنے کی بے چینی، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی سے ادبی اور مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال، ندوۃ العلماء کی اتھل پتھل اور عطیہ کے نام خطوط کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، غالباً اسی لئے خورشید الاسلام نے اس کو "قومی اعمال نامہ" سے تعبیر کیا ہے۔

مولانا شبلی کے خطوط سے برادری کی خوشبو بھی آتی ہے، یہ برادری عام برادری کی طرح نہیں بلکہ خاص برادری ہے جو اعظم گڑھ کے ایک خاص علاقے اور خطے میں پائی جاتی ہے جس کو روتارہ کہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جب مولانا شبلی علی گڑھ، حیدرآباد اور ندوہ سے واپس ہوئے تو ناموری کے ساتھ ساتھ نامرادی بھی ساتھ لائے، پھر برادری اور وطن کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یہ اثرات ان کے خطوط میں نمایاں ہیں۔

۷/ دسمبر ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد سے اپنے بھائی محمد اسحاق کے نام خط میں لکھتے ہیں: "تم

نے کانفرنس تسلیم کرلی، لیکن اس کے لیے ایک عمدہ پراسپکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور رؤسا دیہات کے پاس بھیجنا ضروری ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلاء، منصب، عُہدہ دار جو اچھی حالت رکھتے ہیں، وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پروا ہے۔ نیشنل اسکول، سرائمیر کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں۔ تم پرائیویٹ خطوط لکھ کر بہ اصرار اور تقاضا ان لوگوں کو جمع کرو۔ ۳۱/ جولائی ۱۹۰۳ء کے خط میں اپنے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں: "میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے وجود کو اپنی تمام برادری کے لیے تاج سمجھتا ہوں۔" اور بہت سے خطوط سے علمی، مذہبی، برادری، تعلیمی ادارے وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کے مکاتیب پر تحقیقی وتنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

(۱) مولانا شبلی کے خطوط میں غالب کے خطوط جیسی شگفتگی ہے۔

(۲) مولانا شبلی کے بعض خطوں میں مکالموں کا بھی وہی انداز ہے جو غالب کے خطوط میں پایا جاتا ہے۔

(۳) شبلی کے خطوط میں سرسید کی طرح قوم اور مذہب سے محبت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

(۴) شبلی کے خطوط میں اقبال کے خطوط کی طرح علمی مسائل پر گفتگو اور مختلف مشاغل کا حال ملتا ہے۔

(۵) شبلی کے خطوط میں ابوالکلام آزاد سے تعلق کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

(۶) شبلی کے خطوط زیادہ طویل نہیں ہوتے۔

(۷) شبلی کے خطوط میں سادہ اور موزوں عبارتیں خوب ملتی ہیں۔

(۸) شبلی بھی غالب کی طرح القاب کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

(۹) شبلی ہر خط کا جواب بہت جلد دیتے تھے لیکن لکھنے میں پہل نہیں کرتے تھے۔

(۰۱) شبلی کے خطوط میں چوٹیں اور طنزیاتی فقرے خوب ملتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ کو درج ذیل ابواب یا جلی عنوانات کے تحت تقسیم کرکے معلومات کو مرتب کیا گیا ہے۔مثلاً

پہلا باب "اردو میں مکتوب نگاری کی روایت"

دوسرا باب "مکتوبات شبلی کے موضوعات کا جائزہ"

تیسرا باب "مکتوبات شبلی کے مکتوب الیہ کا مختصر تعارف"

چوتھا باب "مکتوبات شبلی کا تنقیدی جائزہ"

پانچواں باب "اردو کے مکتوباتی ادب میں شبلی کا مرتبہ" کے عنوان سے معنون ہے۔

پہلے باب میں مکتوب کی لغوی واصطلاحی تعریف، دوسرے میں خطوط شبلی کے موضوعات، تیسرے میں مکتوب الیہ کے خطوط کی تعداد اور ان کا تعارف، چوتھے میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ مکتوبات ومراسلات اور ساتھ ہی مکاتیب شبلی کے مجموعوں اور پانچویں میں مکتوباتی ادب میں شبلی کے مقام و مرتبہ کے تعین کے متعلق تفصیلات ہیں۔

اس کے علاوہ بعض مکتوبات شبلی کا موازنہ دیگر خطوط نگاروں کے ساتھ کیا گیا ہے، اور شبلی کے مکتوب کی معنویت اور ادبی اہمیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بات بھی پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے خطوط کی عہد حاضر میں کیا افادیت اور انفرادیت ہے اس کی طرف نشاندہی کردی جائے۔مقالے کے سب سے آخر میں کتابیات کی فہرست کو پیش کیا گیا ہے۔

خلاصہ Summary

مکتوبات شبلی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

زیر نظر مقالہ میں علامہ شبلی پہلودار شخصیت کو ان کے مکاتیب کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے خطوط کی مدد سے ان کی سیرت اور اخلاق و کردار کا مطالعہ کیا گیا اور ان کے خیالات اور نظریات، خدمات اور مصروفیات کا جائزہ لیا گیا ہے تا کہ شبلی کی شخصیت خطوں کے آئینہ میں صاف طور پر نظر آسکے۔ یہ ایک مکمل سوانح حیات تو نہیں ہے تاہم اس میں ان کے خطوط کے اقتباسات کو اس طرح باہم مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مولانا شبلی کی خودنوشت سوانح بن جائے۔ اس بات کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے کہ اس میں جو مواد پیش کیا جائے وہ مستند ہو۔ اور جو کچھ لکھاجائے اس کی توثیق وشہادت میں خود مولانا کی تحریروں میں مل جائے۔

کسی شخصیت کے حالات اور سوانح عمری کا خطوں کی روشنی میں اس طرح پیش ہونا اردو ادب میں ایک ابتدائی کوشش سمجھی جاسکتی ہے اور پھر ایسے شخص کے حالات کا پیش کرنا حقیقت میں مشکل ہے۔ جو ایک طرف ادب اور مذہب میں ایک خاص مقام رکھتا ہو اور جس کے تقدس اور علمیت کے لوگ معترف ہوں اور جو دوسری طرف مخالفتوں میں گھرا ہوا ہو اور جس پر "مختلف جرائم کے سرزد ہونے کا الزام لگایا جائے۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالہ کے ضبط تحریر میں آنے سے قبل ہمارا قلم نہ تو شبلی کا مخالف تھا اور نہ ان کی شخصیت سے مرعوب تھا۔ مکاتیب کے مطالعہ نے ذہن میں جو تاثرات پیدا کئے، قلم نے صرف ان کی ترجمانی کی، اگر اس کے باوجود ان کی عظمت کا اعتراف ہوتا ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ شبلی حقیقت میں اس کے مستحق ہیں۔

Bibliography / Reference

کتابیات

(۱) ۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط۔سیدعاشور کاظمی۔انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر (نئی دہلی) ۲۰۰۱ء

(۲) آپ کا سعادت حسن منٹو (منٹو کے خطوط)۔ محمد اسلم پرویز۔ بلیک ورڈس پبلی کیشنز ممبرا (تھانے) ۲۰۱۲ء

(۳) آثار شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔معارف پریس (اعظم گڑھ) ۲۰۱۳ء

(۴) اردو ترجمہ مکاتیب شبلی مع حواشی وتعلیقات۔ڈاکٹر خالدندیم۔دارالمصنّفین ، شبلی اکیڈمی (یوپی) اعظم گڑھ۔

(۵) اردو خطوط۔شمس الرحمن فاروقی۔نامعلوم نامعلوم

(۶) اردو خطوط نگاری کا ارتقائ۔ رشیدہ خاتون۔ مطبع نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد(یوپی) ۱۹۸۹ء

(۷) اردو مکتوب نگاری (سرسید اور ان کے رفقاء کے خصوص حوالے سے) شاداب تبسم۔مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔۲۰۱۲ء

(۸) اسلام اور عصر جدید "شبلی نعمانی نمبر"۔پروفیسر اخترالواسع۔ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (نئی دہلی)

(۹) اسلام کی عالمگیر خدمات۔علامہ شبلی نعمانی۔ریپلیکا پریس (کراچی)

(۱۰) اقبال اور دبستان شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)۔ ۲۰۱۵ء

(۱۱) ارتباط وانعکاس (مجموعہ مکتوبات)۔ پروفیسر ڈاکٹر سید وحید اشرف۔ مخدوم سید اشرف جہانگیر اکاڈمی، بڑودہ (گجرات) ۲۰۰۸ء

(۱۲) اردو ادب (نئ دلی) ”سردار جعفری کے خطوط“۔اسلم پرویز۔انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر (نئ دہلی) ۲۰۰۰ء

(۱۳) اسلام معاشیات اور ادب (خطوط کے آئینہ میں) ۔ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ) ۲۰۰۰ء

(۱۴) اشراق (مکاتیب فراہی) ۔جاوید احمد غامدی۔ دارالاشراق احمد بلاک گارڈن ٹاؤن (لاہور) ۱۹۹۲ء

(۱۵) اقبال ریویو (اقبال کے غیر مطبوعہ خطوط) ۔محمد ظہیرالدین احمد۔اقبال اکیڈمی گلشن خلیل (حیدرآباد) ۲۰۰۶ء

(۱۶) انتخابات شبلی۔(مولانا) علامہ سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی (یوپی) اعظم گڑھ۔۲۰۰۷ء

(۱۷) انتخاب مکتوبات امام ربانی۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفی خان۔ سندھ یونیورسٹی پریس (حیدرآباد، سندھ)

(۱۸) انشائے داغ۔مولانا سید علی احسن۔انجمن ترقی اردو (ہند، نئ دہلی) ۱۹۴۱ء

(۱۹) انشائے مومن۔ ڈاکٹر ظہیراحمد صدیقی۔ غالب اکیڈمی، نظام الدین (نئ دہلی) ۱۹۷۷ء

(۲۰) باپ کا خط بیٹی کے نام۔پنڈت جواہر لال نہرو۔کتابستان، الہ آباد (الہ آباد) ۱۹۳۵ء

(۲۱) باقیات شبلی۔مشتاق حسین۔ آزاد کتاب گھر، کلاں محل (دہلی)

(۲۲) برید فرنگ۔(مولانا) علامہ سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی (یوپی) (اعظم گڑھ) ۱۹۸۶ء

(۲۳) بزرگوں کے مکتوبات (جلداول) ۔مخدوم اختر۔ادارہ ادبیات دلی، صدربازار (دہلی)

(۲۴ بیان شبلی (ا) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔روشان پرنٹرس (دہلی)

(۲۵) بیگمات اودھ کے خطوط۔ مفتی حکیم انتظام اللہ شہابی۔ مکتبہ ادب، اردو بازار (دہلی)۱۹۴۷ء

(۲۶) پریم چند کے خطوط۔ مدن گوپال۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ (دہلی) ۱۹۶۸ء

(۲۷) تاریخ نو۔ پروفیسر کلیم الدین احمد۔ دائرہ ادب (پٹنہ) ۱۹۷۲ء

(۲۸) تدبر (لاہور) مولانا خالد مسعود۔ ادارہ تدبر قرآن وحدیث (لاہور) ۱۹۹۸ء

(۲۹) تعارف مکتوبات خلیل الرحمن اعظمی۔ مولانا عبدالرحمن ناصر۔ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) ۱۹۸۲ء

(۳۰) تفہیم شبلی۔ ڈاکٹر ارشاد نیازی۔ ایم آر پبلی کیشنز (نئی دہلی)

(۳۱) تنقیدیں۔ خورشید الاسلام۔ انجمن ترقی اودھ ہند علی گڑھ۔ طبع دوم ۱۹۶۴ء

(۳۲) تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور۔ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۶۴ء

(۳۳) جہان شبلی۔ ڈاکٹر صفیہ بی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر (نئی دہلی)

(۳۴) حیات شبلی۔ (مولانا) علامہ سید سلیمان ندویؒ۔ معارف پریس، اعظم گڑھ۔

(۳۵) جگر کے خطوط۔ محمد اسلام۔ نظامی پریس (لکھنو) ۱۹۶۵ء

(۳۶) چندبزرگوں کے خطوط۔ مولانا عثمان احمد قاسمی۔ علمی کتاب گھر، شاہ گنج (جونپور) ۱۹۹۲ء

(۳۷) چند مکاتیب (مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی) ثناء الحق صدیقی۔ ادارہ دانش حکمت ناظم آباد (کراچی) ۱۹۸۵ء

(۳۸) حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط۔ پروفیسر خورشید احمد فاروق۔ ندوۃ المصنّفین اردو بازار، جامع مسجد (دہلی) ۱۹۵۹ء

(۳۹) خطبات شبلی۔ (مولانا) علامہ سید سلیمان ندوی۔ معارف پریس، اعظم گڑھ۔

(۴۰) خطوط ابوالکلام آزاد۔ مالک رام۔ ساہتیہ اکادیمی (نئی دہلی) ۱۹۹۱ء

(۴۱) خطوط ابوالکلام آزادوذاکر حسین بنام یحییٰ اعظمی۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔ (نامعلوم)

(۴۲) خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی۔ مولانا سیداکبر حسین۔ شاہ جہانی پریس (دہلی) ۱۹۲۲ء

(۴۳) خطوط خواجہ حسن نظامی (اول)۔ خواجہ بانوصاحبہ۔ میر زامحبوب، محبوب المطابع (دہلی) ۱۹۱۷ء

(۴۴) خطوط سرسید۔ڈاکٹر سیدراس مسعود۔ مطبوعہ نظامی پریس (بدایوں)۔۱۹۳۱ء
(۴۵) خطوط شبلی بنام شروانی۔ مولانا فیصل احمد ندوی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار (دہلی)
(۴۶) خلاصۂ حیات شبلی۔(نامعلوم) (نامعلوم)
(۴۷) خطوط عبدالحق۔ محمد اکبرالدین صدیقی۔ حیدرآباد اردو اکیڈمی(حیدرآباد) ۱۹۶۶ء
(۴۸) خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ یونیورسٹی اورینٹل کالج (لاہور، پاکستان) ۱۹۷۷ء
(۴۹) خطوط ماجدی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ تصنیف و تحقیق پاکستان، علی گڑھ کالونی (کراچی) ۱۹۸۶ء
(۵۰) خطوط محمد علی۔ پروفیسر محمد سرور۔ مکتبہ جامعہ (دہلی)۔۱۹۴۰ء
(۵۱) خطوط مشاہیر (اول) مولانا عبدالماجد دریابادی۔ نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ (لکھنؤ) ۱۹۴۴ء
(۵۲) خطوط مولانا قادریؒ۔ مولانا خالد حسن قادری۔ مکتبہ فریدی، اردو کالج، اردو روڈ (کراچی)
(۵۳) خطوط کیفی۔ڈاکٹر اثر عسکری۔ عثمانیہ بک ڈپو ، رابندر سرانی (کلکتہ)
(۵۴) رشیداحمد صدیقی کے خطوط۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس (علی گڑھ)
(۵۵) رقعات اکبر۔ محمد نصیر ہمایوں۔ قومی کتب خانہ، ریلوے روڈ (لاہور)
(۵۶) رقعات رشید صدیقی۔ پروفیسر مسعود حسین۔ لیتھو کلر پریس، اچل تالاب (علی گڑھ) ۱۹۸۱ء
(۵۷) رقعات رشید صدیقی۔ پروفیسر مسعود حسین۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) ۱۹۸۸ء
(۵۸) سردار جعفری کے خطوط۔ پروفیسر خلیق انجم۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر (نئی دہلی) ۲۰۰۱ء
(۵۹) سفرنامہ روم ومصروشام۔ شبلی نعمانی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی (یوپی) اعظم گڑھ
(۶۰) شبلی (معاندانہ تنقید کی روشنی میں) سیدشہاب الدین۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی

دہلی)
(۶۱) شبلی اور آزاد۔ڈاکٹر شمس بدایونی۔ اپلائڈ بکس پبلیشرز، نیوکوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس (دریاگنج)
(۶۲) شبلی اور جہان شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)
(۶۳) شبلی ایک دبستان (زیراکس)۔ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی۔مکتبہ عارفین ، گورنمنٹ نیومارکیٹ، عظیم پور (ڈھاکہ)
(۶۴) شبلی خودنوشتوں میں۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ۔
(۶۵) شبلی سخنوروں کی نظرمیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ۔ ۲۰۱۲ء
(۶۶) شبلی شناسی کے اولین نقوش۔ پروفیسر ظفر احمد صدیق۔ دارالمصنّفین ، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)۲۰۱۶ء
(۶۷) شبلی شناسی کے سو سال۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ۔ ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)۲۰۱۴
(۶۸) شبلی مباحث اور شبلی کا نظام نقد۔ڈاکٹر شاداب عالم۔غیر مطبوعہ۔
(۶۹) شبلی نعمانی-حیات وتصانیف۔ڈاکٹر محمد سلیم۔مجلس ترقی ادب، کلب روڈ (لاہور)
(۷۰) شبلی نعمانی شخصیت اور عصری معنویت۔ پروفیسر سید محمد ہاشم۔ سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی، شعبہ اردو (علی گڑھ)
(۷۱) شبلی نقادوں کی نظرمیں۔ناز صدیقی۔الیاس ٹریڈرس، شاہ علی بنڈہ (حیدرآباد)
(۷۲) شبلی کا ذہنی ارتقائ۔ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی۔ مجلس یادگار ہاشمی (کراچی)
(۷۳) شبلی کی آپ بیتی۔ڈاکٹر خالد ندیم۔دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)
(۷۴) شبلی کی ادبی وفکری جہات۔ڈاکٹر شمس بدایونی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)۲۰۱۳ء
(۷۵) شبلی کی سیرت نگاری۔ ڈاکٹر ارشد جمال۔ جمال پبلی کیشنز، ٹیچرس کالونی، کامٹی

(ناگپور)۲۰۱۳ء

(۷۶) شبلی کی علمی وادبی خدمات۔ پروفیسر ظفر احمد صدیق۔ فیکلٹی آف آرٹس (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ)۲۰۱۲ء

(۷۷) شذرات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)۲۰۱۴ء

(۷۸) صلیبیں مرے دریچے میں۔فیض احمد فیض۔مغربی بنگال اردو اکاڈمی (کلکتہ) ۱۹۸۲ء

(۷۹) علی میاں صاحب کے خطوط۔الحاج محمد ناصر خاں۔فرید بک ڈپو (دہلی)۔۱۹۹۹ء

(۸۰) عرفان شبلی۔ مولانا کلیم صفات اصلاحی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)۲۰۱۴ء

(۸۱) عظمت شبلی۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی۔اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن (نئی دہلی)

(۸۲) علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ابوعلی اثری۔ قاسمی پریس، بازبہادر (اعظم گڑھ)

(۸۳) علامہ شبلی بحیثیت شاعر (مضمون) ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی۔ بمبئی۔

(۸۴) علامہ شبلی نعمانی (معنویت کی بازیافت) ڈاکٹر شباب الدین۔ شبلی نیشنل پی جی کالج (اعظم گڑھ) ۲۰۰۸ء

(۸۵) علامہ شبلی نعمانی ، صدی کے آئینے میں۔ڈاکٹر مہہ جبیں زیدی۔ قرطاس گلشن امین ٹاور، گلستان جوہر بلاک (کراچی)

(۸۶) علامہ شبلی نعمانی شخصیت اور شاعری۔ڈاکٹر مطیع الرحمن غاسق۔ایجوکیشنل بک ہاؤس ، یونیورسٹی مارکیٹ (علی گڑھ)

(۸۷) علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم (اختلافات کے پس منظر میں)۔ڈاکٹر عبیداللہ فراہی۔ طیب بن طاہر، صادق منزل، محلہ سیتارام (اعظم گڑھ) ۱۹۸۸ء

(۸۸) علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)

(۸۹) علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)

(۹۰) علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط (مع ضمیمہ مکاتیب مہدی حسن) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ مکتبہ جمال، تیسری منزل، حسن مارکیٹ اردو بازار (لاہور) ۲۰۱۵ء

(۹۱) غبار خاطر۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد۔ ساہتیہ اکادیمی (نئی دہلی) ۱۹۸۳ء

(۹۲) فغان بے خبر۔ نظیری نظیر خاقانی۔ مطبع نامور پریس (الہ آباد) ۱۸۹۱ء

(۹۳) قوانین خطوط۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی۔ کتاب خانہ نورس (کاپی بک شاپ) کبیر اسٹریٹ (لاہور)

(۹۴) گویا دبستاں کھل گیا۔ ہما بیگم۔ اکادمی پنجاب ، مال روڈ (لاہور) ۱۹۵۶ء

(۹۵) متعلقات شبلی۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ ادب کدہ مہراج پور انور گنج ، (اعظم گڑھ)

(۹۶) محمد شبلی نعمانی۔ ڈاکٹر جاوید علی خان۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی) ۲۰۰۴ء

(۹۷) محمد شبلی نعمانی لائف اینڈ کنڑیبیوشنس۔ ڈاکٹر جاوید علی خان۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)

(۹۸) مسئلہ وقف اولاد۔ علامہ شبلی نعمانی۔ فیض عام پریس (علی گڑھ)

(۹۹) مضمون مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ علامہ شبلی نعمانی۔ قومی پریس (لکھنؤ)

(۱۰۰) مطالعات شبلی (مجموعہ مقالات سیمینار ۲۰۱۴ئ) ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)

(۱۰۱) مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانیؒ۔ محمد سرفراز عالم۔ انجمن الاصلاح ’معہدالقرآن الکریم‘ دارالعلوم ندوہ (لکھنؤ)

(۱۰۲) مقالات شبلی (ادبی، جلددوم) ۔ (مولانا) علامہ سیدسلیمان ندوی۔ معارف پریس (اعظم گڑھ)

(۱۰۳) مقالات شبلی (تعلیمی ، جلدسوم) (طبع دوم) علامہ شبلی نعمانی۔ معارف پریس (اعظم گڑھ)

(۱۰۴) موازنہ انیس ودبیر۔علامہ شبلی نعمانیؒ۔دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)
(۱۰۵) مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز۔مولانا سعید انصاری۔الناظر پریس (لکھنؤ)
(۱۰۶) مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار۔ پروفیسر ظفراحمد صدیقی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس شمشاد مارکیٹ (علی گڑھ)
(۱۰۷) مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر۔ سیدصباح الدین عبدالرحمن۔ معارف پریس (اعظم گڑھ)
(۱۰۸) مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی وتاریخی بصیرت۔ حافظ قاری ڈاکٹر محمد نصیرالدین منشاوی۔ شرفیہ تجوید وقرأت، حفظ اکیڈمی اینڈ ایجوکیشنل (حیدرآباد)
(۱۰۹) مکاتیب شبلی حصہ اول۔ (مولانا) علامہ سید سلیمان ندوی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)
(۱۱۰) مکاتیب شبلی جلددوم۔علامہ شبلی نعمانی۔ معارف پریس (اعظم گڑھ)
(۱۱۱) مکتوبات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)۲۰۱۲ء
(۱۱۲) نقوش شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)
(۱۱۳) نوادرشبلی۔ڈاکٹر معین الدین عقیل۔(نامعلوم)
(۱۱۴) نوادرات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)
(۱۱۵) کتاب نامہ شبلی۔اخترراہی۔ مسلم اکیڈمی 'محمد نگر' علامہ اقبال روڈ (لاہور)
(۱۱۶) کتابیات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)
(۱۱۷) کلام شبلی کے اعلام و اشخاص۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ادبی دائرہ (ادا) (اعظم گڑھ)
(۱۱۸) مشاہیر اردو کے خطوط۔ مہیش پرشاد۔ رائے صاحب رام دیال اگروال (الٰہ آباد) ۱۹۳۲ء
(۱۱۹) مشاہیر کے خطوط اور ان کے مختصر حالات۔ عبداللطیف۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر (نئی دہلی) ۱۹۷۵ء
(۱۲۰) مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی۔ دارالمصنّفین

، شبلی اکیڈمی ، اعظم گڑھ (یوپی) ۱۹۹۲ء
(۱۲۱) محاصرہ غدر دہلی کے خطوط۔مولانا خواجہ حسن نظامی۔منادی بک ایجنسی (دہلی) ۱۹۱۹ء
(۱۲۲) معاصرین کے خطوط /نامہ ہائے دوست۔ مبشر علی صدیقی۔ سلیم مبشر اردو سوسائٹی (بدایوں) ۱۹۷۹ء
(۱۲۳) مولانا مودودی کے خطوط۔سید امین الحسن رضوی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز (نئی دہلی) ۲۰۰۵ء
(۱۲۴) مکاتیب احتشام۔ڈاکٹر اخلاق اثر۔بھوپال بک ہاؤس (بھوپال) ۱۹۷۶ء
(۱۲۵) مکاتیب فراہی۔مولانا ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی۔دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) ۱۹۹۴ء
(۱۲۶)) مکاتیب مولانا عبیداللہ سندھی۔ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔مولانا عبیداللہ سندھی اکیڈمی پاکستان (کراچی، پاکستان) ۱۹۹۷ء
(۱۲۷) مکاتیب مشاہیر دارالمصنّفین بنام مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری۔ مولانا پروفیسر محمد حسان خان۔سفیان حسان ندوی، سوشل ویلفیر سوسائٹی (بھوپال) ۲۰۱۱ء
(۱۲۸) مکاتیب مہدی۔مہدی بیگم۔مہدی بیگم، بسنت پور (گورکھ پور) ۱۹۳۸ء
(۱۲۹) مکاتیب نگم۔محمد ایوب واقف۔انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر (نئی دہلی)
(۱۳۰) مکاتیب واشعار مولانا عبدالسلام ندوی۔پروفیسر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی۔مولانا عبدالسلام ندوی فاؤنڈیشن (ممبئی) ۲۰۰۶ء
(۱۳۱) مکتوبات آزاد (محمد حسین آزد)۔آغامحمد طاہر۔کریمی پریس (لاہور)
(۱۳۲) مکتوبات بہادریارجنگ۔نذیرالدین احمد۔ قائد ملت اکادمی (حیدرآباد) ۱۹۷۰ء
(۱۳۳) مکاتیب بہادریارجنگ۔فضل الرحمن۔بہادریارجنگ اکادمی (کراچی) ۱۹۶۷ء
(۱۳۴) مکتوبات حالی (اول ودوم)۔راجہ سجاد حسین۔حالی پریس (پانی پت)۔۱۹۲۵ء
(۱۳۵) مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری۔ ادارہ ادبیات اردو خیرت آباد (حیدرآباد) ۱۹۳۹ء

(۱۳۶) مکتوبات عبدالحق۔ پروفیسر عبدالحق۔ مکتبہ اسلوب (کراچی) ۱۹۶۳ء

(۱۳۷) مکتوبات ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی۔ مولانا عبدالرحمن ناصر۔ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) ۱۹۸۰ء

(۱۳۸) مکتوبات ڈاکٹر نذیراحمد بنام ڈاکٹر غلام مصطفی خاں۔(نامعلوم) (نامعلوم)

(۱۳۹) میرامن سے عبدالحق تک۔ڈاکٹر سیدعبداللہ۔ناز چمن بکڈپو اردو بازار، دہلی۔

(۱۴۰) نقوش تابندہ۔اخلاق احمد۔ناشر شہاب الدین اعظمی۔۲۰۰۴ء

(۱۴۱) یادگار شبلی۔ایس، ایم، اکرام۔ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ (لاہور)

رسائل وجرائد

(۱) ادیب ''شبلی نمبر'' (علی گڑھ) ۔ ڈاکٹر ابن فرید۔ سرسید بک ڈپو شمشاد بلڈنگ (علی گڑھ)

(۲) اردو دنیا (نئی دہلی) ''شبلی نعمانی اور دارالمصنّفین'' ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) ۲۰۱۴ء

(۳) اردودنیا (نئی دہلی)''شبلی نعمانی اور دارالمصنّفین'' ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) ۱۹۱۴ء

(۴) انتخاب رسائل شبلی۔ علامہ شبلی نعمانی۔ ایوان اردو (پٹنہ)۱۹۶۲ء

(۵) البصیر (اسلامیہ کالج چنیوٹ) ''شبلی نمبر'' ۔ غلام دستگیر۔ اسلامیہ کالج، چنیوٹ (چنیوٹ، لاہور)

(۶) اورینٹل کالج میگزین۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ یونیورسٹی اورینٹل کالج (لاہور، پاکستان) ۱۹۷۶ء

بزم شبلی (میگزین) ۱۸۔۲۰۱۹ء۔ ڈاکٹر شباب الدین۔ شبلی نیشنل پی جی کالج (اعظم گڑھ)

(۷) تذکرہ مخطوطات جلد پنجم۔ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ سنہ اشاعت جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء

(۸) تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ۔ اکتوبر ۲۰۰۸ء

(۹) جرنل۔ پروفیسر مسعود حسین۔ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) ۱۹۸۸ء

(۱۰) سہ ماہی اردو ادب۔ مدیراعلیٰ صدیق الرحمن قدوائی۔ مدیراطہرفاروقی۔ انجمن ترقی اردو

(ہند) نئی دہلی۔ جنوری تامارچ ۲۰۲۰ء

(۱۱) شبلی نیشنل انٹر کالج (میگزین ۱۵۔۲۰۱۶ء) ”شبلی نمبر“۔ سہیل احمد اصلاحی۔ شبلی نیشنل انٹر کالج (اعظم گڑھ)

(۱۲) فکر و نظر سہ ماہی۔اسلام آباد، پاکستان۔جولائی -ستمبر ۱۹۸۶ء

(۱۳) مجلہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ) ”علامہ شبلی نمبر“۔ڈاکٹر ظفرالاسلام اصلاحی۔ ادارہ علوم اسلامیہ ، اے ایم یو (علی گڑھ) ۲۰۱۴ء

(۱۴) معارف جنوری تاجون ۱۹۸۸ء

(۱۵) معارف جولائی تا دسمبر ۲۰۰۶ء

(۱۶) معارف ”شبلی نمبر“ ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی۔ دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (یوپی)

(۱۷) ماہنامہ، راہ اعتدال، عمرآباد۔حفیظ الرحمن اعظمی عمری۔مارچ ۲۰۲۰ء

(۱۸) میگزین ”شبلی نمبر“ (۰۸۔۲۰۰۷ء) ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی۔ شبلی نیشنل پی جی کالج (اعظم گڑھ)

(۱۹) نقوش (خطوط نمبراول) محمد طفیل۔ادارہ فروغ اردو (لاہور) ۱۹۶۸ء

(۲۰) نقوش (خطوط نمبردوم) محمد طفیل۔ادارہ فروغ اردو (لکھنؤ) ۱۹۶۸ء

(۲۱) نقوش (خطوط نمبر سوم) محمد طفیل ادارہ فروغ (لاہور) ۱۹۶۸ء

(۲۲) نوائے ادب (سہ ماہی بمبئی) ”علامہ شبلی نعمانی نمبر“۔پروفیسر عبدالستار دلوی۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (ممبئی) ۲۰۱۵ء

(۲۳) نیادور۔ لکھنؤ۔ اگست ۲۰۱۷ء

Recommendation

Title Page

MAKTUBAT-E-SHIBLI KA TAHQIQI-WA-TANQIDI MUTALA

Thesis submitted for the award ph.D in Urdu

By

Abu Rafe

Enrolment No. Pu07/160575

Under the Supervision

Dr. Shababuddin

Ex Head Deptt of Urdu

Shibli National College Azamgarh

VEER BAHADUR SINGH PURVANCHAL UNIVERSITY

JAUNPUR (U.P)

2021

Title Page

مکتوبات شبلی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

ابورافع

Enrolment No. Pu07/160575

نگراں

ڈاکٹر شباب الدین

سابق صدر شعبۂ اردو، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ (یوپی)

ویر بہادر سنگھ پوروانچل یونیورسٹی، جونپور

۲۰۲۱

Conclusion

مولانا شبلی نے اردو میں خط لکھنا ۱۸۸۲ء میں شروع کیا اور وفات (۱۹۱۴ء) تک یہ سلسلہ جاری رہا،ان کے ابتدائی خط کو پیش نظر رکھا جائے تو شبلی عین جوانی کے عالم میں ہمارے سامنے آتے ہیں جبکہ ان کی عمر پچیس سال تھی۔علی گڑھ کے اس نوجوان پروفیسر کی علمی سرگرمیوں اور اس نوعمر عالم کی مذہبی اور قومی خدمات اور اس جوان اورپرجوش ہمت مصنف کی تصنیفی مصروفیات کو دیکھ کر واقعی اس کو ایک عظیم اور وقار شخصیت تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہوتا۔

۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک ۳۲ سال کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی، شبلی کا یہ سارا زمانہ مختلف خدمات اور مسلسل مصروفیات میں بسر ہوا۔خطوط کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ ان میں قومی ہمدردی، جذبۂ ایثار و قربانی اور دیانت داری کے اوصاف تھے۔

اصلاح پسندی، روشن خیالی اور جمہوریت پسندی کی خصوصیات ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں، قدامت پسند علماء کی طرح انھوں نے اپنی زندگی خلوتوں میں نہیں گذار دی بلکہ دنیا میں رہ کر دنیا کا مقابلہ کیا۔طبیعت چونکہ جدت پسند تھی، جدید رجحانات کو اپنایا اس لیے رجعت پسند مولویوں کی نظر میں کھٹکنے لگے۔نئے دور کے نمائندوں اور مغربی تعلیم یافتہ اشخاص کی صحبت میں رہنے کے باوجود مذہبی اصولوں اور مشرقی طریقوں سے منحرف نہیں ہوگئے اس لیے اس طبقے میں بھی مقبول نہ ہوسکے اور ہر دو طرف سے مخالفت کی جانے لگی۔

مولانا شبلی نے خوداپنے لیے جو راہ متعین کی تھی وہ اس پر قائم رہے اور دوسروں کی پیروی نہ کی۔یہ مجتہد تھے مقلد نہ تھے۔انھوں نے چاہا کہ قوم کے سامنے ایک ایسا راستہ پیش کریں جو نئے اور پرانی راہوں کو ملا دے لیکن ان کے خیالات اور نظریات کو کون سمجھتا، اس کو سمجھنے کے لئے تو ایک مخصوص پیمانہ درکار اورایک ایسی نظر کی ضرورت تھی جو ان گہرائیوں تک پہنچ سکے، اس لیے چند ایک کے سوا کوئی ان کا ہم خیال نہ بن سکا۔ہم خیالی تو

بڑی بات ہے انھوں نے جس کام کا آغاز کیا زیادہ تر لوگوں نے مخالفت کی اور ان کی راہ میں دشواریاں پیدا کیں، ایسے حالات میں شبلی کا زمانہ کی حق ناشناسی کی شکایت کرنا بے جا نہ تھا۔ ان کی طبیعت میں مایوسی اور زود رنجی کا پیدا ہوجانا بھی اسی سبب سے تھا۔البتہ ان کی طبیعت میں جو زود حسی اور جذباتیت تھی اسے ان کی فطرت کی کمزوری کہیں تو غلط نہ ہوگا، ان سے اگر کوئی بات قابل اعتراض سرزد بھی ہوتی، تو وہ محض اسی جذباتیت اور زود حسی کا نتیجہ تھا، مخالفوں کو انھوں نے برا بھلا بھی کہا اور سخت الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔بے شک یہ شبلی کی فطرت کے کمزور پہلو ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ اورنگ زیب عالمگیرؒ سے متعلق لکھا تھا وہ خود ان پر بھی صادق آتا ہے۔"یہ کہنا بھی بالکل مبالغہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھا" لیکن مولانا شبلی کی ان کمزوریوں پر ان کی فطرت کی خوبیاں ہمیشہ غالب رہیں۔شبلی بیحد خود دار واقع ہوئے تھے اور ساتھ ہی ان میں خود شناسی کا جذبہ بھی تھا، اپنی اور اپنے کاموں کی برتری اور اہمیت کا اندازہ بھی۔مخالفتوں کے باوجود وہ اپنی راہ سے ہٹ نہیں گئے۔ان کے خیالات اور عزم و ارادے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی بلکہ مزید استحکام پیدا ہوگیا۔وہ جو کام بھی کرتے عمدہ اور اعلیٰ پیمانہ پر کرتے۔غرض یہ کہ ان ساری باتوں کی یکجائی نے شبلی میں ایک انفرادیت پیدا کردی تھی۔اگر مولانا شبلی کو مکتوب کے آئینے میں دیکھاجائے تو وہ تقریباً ہر فن کے ماہر نظر آتے ہیں۔البتہ یہ ضروری ہے کہ بزرگوں کا احترام لازم ہے اور مولانا شبلی ہمارے بزرگ ہیں، جن کا احترام فرض ہے اوروہ ہمارے لئے قابل فخر بھی ہیں، زندگی کی دشواریوں اور رنگینوں کے باوجود علم کی پناہ میں جیتے رہے، جس چیز کو دیکھا گہری اور بھرپور نظر سے دیکھا۔اپنے خیالات اور جذبات پر قائم رہتے ہوئے عملی زندگی میں قدم بڑھاتے رہے۔سماج کی دہکتی ہوئی آنکھوں کو کبھی خاطر میں نہیں لائے، نہ شکنجے میں رہنے کے قائل تھے۔خط کے اندر اظہار خیال بے تکلف اور بے دھڑک ہوتا ہے۔اپنے ماموں محمد سلیم کے نام ایک خط میں اپنے خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں: "میرا اصول ہے کہ انسان ہرکام

کے نقص و ہنر کا خود فیصلہ کرسکتا ہے اس کے بعد لوگوں کے اور خصوصاً عوام کے کہنے کی کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے۔" شبلی پرستی اور شبلی شناسی میں بڑا فرق ہے۔ شبلی شناسی میں ممکن ہے کہ کڑوا پن محسوس ہو لیکن انصاف ہوتا ہے اور شبلی فہمی آسان ہوجاتی ہے۔ خط لکھتے وقت انسان کو مطلق خیال نہیں ہوتا ہے کہ آنے والے کل میں یہ کیا شکل اختیار کر جائے گا۔ اس لیے وہ سیدھے سیدھے سچی اور دل کی لگی ہوئی باتیں لکھ جاتا ہے۔ مکتوب نگارادبی نوک پلک کی جانب بہت توجہ بھی نہیں کرپاتا۔ کبھی کبھی ذاتی معاملات خط کے اندر لطف پیدا کرنے کے بجائے کساؤ پیدا کردیتے ہیں جس طرح اصلی شہد کے اندر ملا ہوا موم مزے میں فرق پیدا کردیتا ہے، کچھ خطوط محض ادبی خطوط ہوتے ہیں جن کے اندر ادبی چاشنی پائی جاتی ہے، اس کی مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبار خاطر" ہے۔ مولانا شبلی کے خطوط کے اندر ذاتی گھریلو زندگی کا عکس، چهل پہل، کتابوں کی لکھائی چھپائی، درستی اور تکمیل ہونے کی بے کلی، عرب اور عجم کی داستان، سیاسی مسائل کی دھمک، دارالمصنّفین قائم کرنے کی بے چینی، مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی سے ادبی اور مذہبی مسائل پر تبادلۂ خیال، ندوۃ العلماء کی اتھل پتھل اور عطیہ کے نام خطوط کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں، غالباً اسی لئے خورشید الاسلام نے اس کو "قومی اعمال نامہ" سے تعبیر کیا ہے۔

مولانا شبلی کے خطوط سے برادری کی خوشبو بھی آتی ہے، یہ برادری عام برادری کی طرح نہیں بلکہ خاص برادری ہے جو اعظم گڑھ کے ایک خاص علاقے اور خطے میں پائی جاتی ہے جس کو روتارہ کہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جب مولانا شبلی علی گڑھ، حیدرآباد اور ندوہ سے واپس ہوئے تو ناموری کے ساتھ ساتھ نامرادی بھی ساتھ لائے، پھر برادری اور وطن کی طرف متوجہ ہوگئے۔ یہ اثرات ان کے خطوط میں نمایاں ہیں۔

۷/ دسمبر ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد سے اپنے بھائی محمد اسحاق کے نام خط میں لکھتے ہیں: "تم

نے کانفرنس تسلیم کرلی، لیکن اس کے لیے ایک عمدہ پراسپکٹس انگریزی اور اردو میں چھپوا کر تمام برادری کے معزز ملازمین سرکار اور رؤسا دیہات کے پاس بھیجنا ضروری ہے، بڑی ضرورت یہ ہے کہ وکلاء، منصب، عُہدہ دار جو اچھی حالت رکھتے ہیں، وہ برادری کی تعلیم پر متوجہ ہوں، اب تک یہ گروہ محض بے پروا ہے۔ نیشنل اسکول، سرائمیر کی ان لوگوں کو خبر ہی نہیں۔ تم پرائیویٹ خطوط لکھ کر بہ اصرار اور تقاضا ان لوگوں کو جمع کرو۔ ۳۱/ جولائی ۳۰۹۱ء کے خط میں اپنے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں: "میں سچ کہتا ہوں کہ تمہارے وجود کو اپنی تمام برادری کے لیے تاج سمجھتا ہوں۔" اور بہت سے خطوط سے علمی، مذہبی، برادری، تعلیمی ادارے وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔

مولانا شبلی کے مکاتیب پر تحقیقی وتنقیدی نگاہ ڈالنے کے بعد درج ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

(۱) مولانا شبلی کے خطوط میں غالب کے خطوط جیسی شگفتگی ہے۔

(۲) مولانا شبلی کے بعض خطوں میں مکالموں کا بھی وہی انداز ہے جو غالب کے خطوط میں پایا جاتا ہے۔

(۳) شبلی کے خطوط میں سرسید کی طرح قوم اور مذہب سے محبت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔

(۴) شبلی کے خطوط میں اقبال کے خطوط کی طرح علمی مسائل پر گفتگو اور مختلف مشاغل کا حال ملتا ہے۔

(۵) شبلی کے خطوط میں ابوالکلام آزاد سے تعلق کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

(۶) شبلی کے خطوط زیادہ طویل نہیں ہوتے۔

(۷) شبلی کے خطوط میں سادہ اور موزوں عبارتیں خوب ملتی ہیں۔

(۸) شبلی بھی غالب کی طرح القاب کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

(۹) شبلی ہر خط کا جواب بہت جلد دیتے تھے لیکن لکھنے میں پہل نہیں کرتے تھے۔

(۰۱) شبلی کے خطوط میں چوٹیں اور طنزیاتی فقرے خوب ملتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ کو درج ذیل ابواب یا جلی عنوانات کے تحت تقسیم کرکے معلومات کو مرتب کیا گیا ہے۔مثلاً

پہلا باب "اردو میں مکتوب نگاری کی روایت"

دوسرا باب "مکتوبات شبلی کے موضوعات کا جائزہ"

تیسرا باب "مکتوبات شبلی کے مکتوب الیہ کا مختصر تعارف"

چوتھا باب "مکتوبات شبلی کا تنقیدی جائزہ"

پانچواں باب "اردو کے مکتوباتی ادب میں شبلی کا مرتبہ" کے عنوان سے معنون ہے۔

پہلے باب میں مکتوب کی لغوی واصطلاحی تعریف، دوسرے میں خطوط شبلی کے موضوعات، تیسرے میں مکتوب الیہ کے خطوط کی تعداد اور ان کا تعارف، چوتھے میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ مکتوبات ومراسلات اور ساتھ ہی مکاتیب شبلی کے مجموعوں اور پانچویں میں مکتوباتی ادب میں شبلی کے مقام و مرتبہ کے تعین کے متعلق تفصیلات ہیں۔

اس کے علاوہ بعض مکتوبات شبلی کا موازنہ دیگر خطوط نگاروں کے ساتھ کیا گیا ہے، اور شبلی کے مکتوب کی معنویت اور ادبی اہمیت متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ بات بھی پیش نظر رکھی گئی ہے کہ ان کے خطوط کی عہد حاضر میں کیا افادیت اور انفرادیت ہے اس کی طرف نشاندہی کردی جائے۔مقالے کے سب سے آخر میں کتابیات کی فہرست کو پیش کیا گیا ہے۔